
دل گداز تحریریں، زندگی کی تصویریں
ماہنامہ
کراچی
سچی کہانیاں
February
2014
اندرونی صفحات پر
مانسہرہ کا شیر
ہنگو کا دلیر
اس شمارے میں:
☆ سلیم فاروقی کا "آتش جنوں" ارشد علی ارشد کا "مکھنی" اور نیا تہلکہ خیز سلسلہ "ناگن"
☆ سچ بیانیاں، شعلہ ساماں تحریریں، سرحد پار اور سات سمندر پار سے زندگی کی تصویریں
☆ نیا دلچسپ سلسلہ "تین مرد، تین کہانیاں"
☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

چیف ایگزیکٹو
رخسانہ سہام مرزا

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

کمپوزنگ / گرافکس
محمد کاشف

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

خط و کتابت کا پتا: 110، آدم آرکیڈ
شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✵ جلد: 31 ۔ شمارہ :02 ✵ فروری: 2014ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔



فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔

اعزاز

سچی محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا عمل ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اپنے جذبوں میں کس قدر کھرا ہے۔ ایسے لوگوں پر بلاشبہ اپنے آپ سے زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ محبت کے دعوے دار تو ہم سب ہی ہیں مگر شاید کسوٹی پر پورے چند ہی لوگ اتریں۔ وطن سے محبت کوئی عام جذبہ نہیں، بہت طاقت ور اور خالص جذبہ ہے۔ اسی جذبے کی بدولت احساسِ ذمہ داری اور فرض کی جانب غفلت نہ برتنا پیدا ہوتا ہے۔ اعتزاز حسن نے جان دے کر ثابت کیا کہ زمین سے محبت اور احساس ذمہ داری کسی کی میراث نہیں، یہ صرف خوش نصیبوں کو عطا ہوتی ہے۔ نہم جماعت کا کم عمر بچہ، جس نے اپنے اسکول، ساتھی طلبا اور اساتذہ کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان دی۔ دہشت گرد کو اس قدر سختی سے گرفت میں لیا کہ اس کو اعتزاز سے جان چھڑانے سے بہت سہل، زندگی سے جان چھڑانا لگا۔ یقیناً خوش نصیب ہیں وہ والدین جن کو اللہ نے اس قدر بہادر سپوت عطا کیا۔ خوش نصیب ہیں ہم لوگ کہ ہمارے بچے وقت سے پہلے بڑے ہو گئے اور اپنی ذمہ داریوں کو بھی سمجھ گئے۔ اعتزاز کی قربانی نے یقین دلا دیا کہ اب پاک سرزمین کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں......

میری محبوبہ سے ملیے! یہ طلسم ہوشربا سے کہیں زیادہ پُراسرار اور زلیخائے مصر سے کہیں زیادہ حسین وجمیل ہے۔ اس کی چشمِ خواب ناک سے جھیل سیف الملوک نے جنم لیا ہے۔ اس کے گلابی عارض سے معلق باغات کے پھولوں نے رنگ چرائے ہیں۔ اس کی نوائے گداز نے ہیر رانجھا کے نغمے کو زندگی بخشی ہے۔ اس نے جب بھی اشک بہائے ہیں تو ان اشکوں سے یاسمین وقلوپطرہ نے غسل کیے ہیں۔ یہ غم زدہ ہوتی ہے تو چہار عالم اشکبار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہنستی ہے تو گلہائے ارض وسما مسکرا اُٹھتے ہیں۔ یہ سوچتی ہے تو ایک عالم اس کی سوچ سے راہ پاتا ہے، یہ عشق کرتی ہے تو کیا لیلیٰ ومجنوں، شیریں فرہاد، رومیو جیولیٹ عشق کے تمام ناخدا شرما جاتے ہیں اور اعتراف کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے اسی کے بطن سے جنم لیا ہے۔ جی ہاں یہ میری محبوبہ ہے۔

میں دن بھر، رات بھر اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ نہیں بلکہ یہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ نہ میں اس سے جدا ہوتا ہوں اور نہ یہ پل بھر کو مجھے خود سے جدا کرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ اسے مجھ سے عشق ہے یا مجھے اس سے عشق ہے؟ کسی کو کیا معلوم کہ یہ میرے روم روم میں سما چکی ہے۔ میری نظر، میری سماعت، میری گویائی، میری حرکت، میری خوشبو، میری شناخت میرا سب کچھ ہی تو یہ بن چکی ہے۔ لوگ دیوار کے اس طرف ہی دیکھ پاتے ہیں جبکہ یہ زقند بھرتی ہے اور آن کی آن میں مجھے دیوار کے اُس پار لے جاتی ہے۔ لوگ مجھ سے مسکرا کر ملتے ہیں تو یہ مجھے اشکوں میں غوطے کھاتا ہوا اُن کا دل دکھا دیتی ہے۔ لوگ سیدھا چلتے ہیں تو یہ مجھے اُن کے ٹیڑھے پن سے آگاہ کر دیتی ہے۔

ابھی کسی کام کا آغاز ہی ہوا چاہتا ہے کہ یہ نٹ کھٹ میری انگلی پکڑتی ہے اور مجھے انجام کی سیر کروا دیتی ہے۔ کسی کے گھر جاتا ہوں تو اُس گھر کے در و دیوار اسے دیکھتے ہی اور بے اختیار، دیوانہ وار مجھ سے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔

اس کے رنگ ہزار ہیں، کبھی چالاک دِکھتی ہے کبھی بے وقوف، کبھی سادہ تو کبھی رنگین، کبھی خطرناک تو کبھی دردناک، کبھی پُر اسرار تو کبھی آشکار، کبھی ذی وقار تو کبھی سوئے وقار، کبھی عالی مرتبت تو کبھی رذیل قامت، کبھی منصوبہ ساز تو کبھی بے ہنگم، کبھی تماش بین تو کبھی تماشہ گر، کبھی رفیق تو کبھی رقیب، کبھی رحیم تو کبھی ظلیم، کبھی مکین تو کبھی مکان...... اِس کے رنگ ہزار ہا ہیں۔ لکھنے بیٹھوں تو صفحے کم پڑ جائیں، ڈائجسٹ کے ڈائجسٹ بھر جائیں۔

ایک میں ہی کیا ہزاروں سال ہوئے آج تک اس کے رنگ سمیٹے نہ جا سکے بلکہ جتنا سمیٹو یہ اتنا ہی بکھرتی ہے۔

یہ میری محبوبہ ہے، بھلا کیا کسی کی ایسی ہمہ جہت محبوبہ ہو گی؟ مجھے اس سے پیار ہے، مجھے اس سے محبت ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے، میں اس کا جنونی ہوں۔ میرے لیے یہ گھنیرے گلاب کی مانند ہے جس کی ہزاروں لاکھوں پنکھڑیاں ہیں اور میں دیوانہ وار ان نازک پنکھڑیوں کو سنوارنے میں لگا رہتا ہوں کہ کہیں تجسس کا گلابی رنگ پھیکا نہ پڑ جائے کہ کہیں بھید بھری ریشمی نزاکت کو ٹھیس نہ پہنچ جائے کہ کہیں اس کی حسین نموداری پر تفکر کا بوجھل نشتر نہ چل جائے۔ میں ایک قدم اُٹھاتا ہوں تو اس نزاکت سے کہ پنکھڑی کا بس اک ذرہ ہی سنور جائے۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں، یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں ہر وقت اس میں کھویا رہتا ہوں، یہ ہر وقت مجھ میں کھوئی رہتی ہے۔ یہ ''کہانی'' ہے، جو میری محبوبہ ہے۔ مجھے کہانی سے محبت ہے۔ اسی محبت نے مجھے کاشی سے کاشی کہانی بنا دیا ہے۔

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب



پیارے ساتھیو! وقت کی رفتار بہت تیز ہے، موسم بدلتے ہیں اور وقت ہماری عمر رواں کو یوں دھیرے دھیرے آگے سرکاتا ہے کہ سال گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ سال پہ گرہیں باندھتے باندھتے رسّی گردن تک آجاتی ہے اور...... بس جی عمر کا سفر بھی اختتام کو چھو لیتا ہے۔

انسان زندگی میں اگر جیتا ہے تو زندگی ہی نہیں بلکہ دوستی بھی جیتا ہے۔ دوستی جینے والے لوگ امر ہو جاتے ہیں۔

پیارے ساتھیو! تو پھر ہم سب کیوں ایک دوسرے سے اتنا دور دور ہیں۔ آبِ حیات کا زمانہ تو ہے نہیں۔ اگر ہمیں امر ہونا ہے تو دوستی جینا ہوگی۔ انسان دنیا سے چلا جاتا ہے اور دلوں میں جنم لیتا ہے اور پھر سینہ بہ سینہ یہ زندگی اپنے شگوفے نئی نمو کے ساتھ صورتیں بدل بدل کر پیدا کرتی جاتی ہے اور انسان کبھی نہیں مرتا۔ یاد کی صورت ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

تو پھر دوستو، پیارو! سجنو! مترو! ہمیں امر ہونا ہے۔ دوسری کی صورت میرے ساتھ یہ عہد کرنا ہے۔ اس عہد کے

ساتھ ہی ہم آج اپنے احوال کا آغاز کریں گے۔

سب سے پہلا سندیسہ ہے ہمارے پاس ثانیہ بھٹی، سیالکوٹ سے۔ لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! اللہ آپ کو ہمیشہ خوش



وآباد رکھے آمین۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو میرا دلی سلام اور سب کو نیا سال مبارک ہو۔ میں کافی عرصہ بعد دوبارہ حاضر ہوں۔ غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہوں مجھے شدید قسم کا ٹائیفائڈ بخار ہو گیا تھا۔ خدا کے فضل سے اب ٹھیک ہوں۔ حال ہی میں، میں نے MSC/Psychology میں ایڈمیشن لیا ہے۔ دعا کیجیے Psychologist بن جاؤں۔ زندگی بہت تیز چل رہی ہے پڑھائی کی مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پھر بھی ''سچی کہانیاں'' کے لیے وقت نکال لیتی ہوں۔ تقریباً ایک سال پہلے میں نے کچھ تحاریر اور کہانیاں بھیجی تھیں آپ نے کہا تھا کہ ضرور شائع کریں گے۔ میں اپنی شاعری اور کچھ تحاریر بھیج رہی ہوں ضرور جگہ دیجیے گا۔ دعا گو

☆ ثانیہ جی! شاعری تو آپ کی اس ماہ شامل اشاعت ہے۔ باقی کہانیاں باری آنے پر شائع کر دی جائیں گی۔ اللہ آپ کو مکمل صحت دے۔

✉ یہ ہیں ثمینہ ناز عبدالقیوم صاحبہ۔ اورنگی ٹاؤن کراچی سے۔ لکھتی ہیں۔ امید ہے آپ اور آپ کا تمام اسٹاف



اور قارئین خیر و عافیت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے سالِ نو کی آمد پر آپ سب کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک باد پروردگار سے دعا ہے اس سال تمام عالم اسلام کے مسلمان خصوصاً حکمرانوں کے دل جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر پھر سے اپنے ملک کی بقاء اور سلامتی کے لیے دھڑک اٹھیں۔ (آمین ثمہ آمین) اداریہ بہت شاندار ہے۔ ''کچھ اپنی باتیں'' میں کاشی بھائی کی گفتگو بہت متاثر کن تھی۔ سرورق کی شخصیت دل میں اتر گئی۔ سب سے پہلے احوال میں جا پہنچے۔ سب سے پہلے نیا سلسلہ ''ناگن'' پڑھا۔ اس کہانی میں ناگن انتقام لینے کے لیے انسان کا روپ ڈھار لیتی ہے۔ ''بارشوں کے شہر میں'' انڈونیشیا کا سفرنامہ بس ٹھیک ہی تھا جو اختتام پذیر ہوا۔ کوئی چمکتا، مہکتا رنگین سا سفرنامہ شائع کیجیے۔ اس سے گھر بیٹھے غائبانہ سیر و تفریح کا مزہ آ جاتا ہے۔ من پسند ''ملکھنی'' دین کی خدمت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ تصور میں بہتی ہوئی دودھ اور شہد کی نہریں قریب ہی اونٹنیاں ہیں ان کی زنجیریں سونے کی ہیں۔ ''آتشِ جنوں'' بڑے پُرتجسس اور سنسنی خیز انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف نمایاں شخصیات میں ''راجہ پورس'' دھرتی کا شیر دل سپوت تھا جسے اپنوں ہی کی سازش نے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ کہانی ''زن خانہ برباد'' کی جانب بڑھے یہ بات بالکل غلط ہے کہ کفایت شعار بیوی گھر برباد کر دیتی ہے بلکہ یوں کہا جاتا کہ کنجوس عورت گھر برباد کر دیتی ہے۔ سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ تین مرد تین کہانیاں بہت متاثر کن ہے۔ پہلی کہانی ''التماس'' احساس کمتری پر مبنی انسان کو چاہیے کہ اپنی خامیوں اور دوسروں کی خوبیوں کو کھلے دل سے تسلیم کرے۔ دوسری کہانی ''تمہارا شکریہ'' بہت خوب صورت تحریر ثوبیہ نے انعام کے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن وقت وہ مرہم ہے جو بڑے سے بڑا زخم بھی بھر دیتا ہے۔ ''آج کی رات'' انسان کی ذات کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ عاملوں، پیروں کو خدا کی ذات سے زیادہ بھروسا کرتے ہیں سادہ لوح، ان پڑھ، مرد و زن ان کا شکار زیادہ ہوتے ہیں۔ محمد سلیم اختر کی ''تکون'' اپنی نوعیت کی انوکھی کہانی، افسوس تینوں رشتے ہی تکونی موت مٹی میں جا ملے۔ ''سہارا'' دوسری بہترین کہانی لڑکی کی بڑھتی ہوئی عمر کے جذبات کے ساتھ معاشرے کے بڑے دردناک ماحول کی منظر کشی کی ہے یہ جملہ بہت خوب صورت

''زندگی کو صاف اور پاکیزہ رکھنے کے لیے مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے'' بہت دلکش تحریر بنت کاری بہت لاجواب۔ ''وارے کی عورت'' پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں والا چوہدری غریب بھاگ بھری سے شادی کرلیتا ہے، بہت شاندار۔ ''زندگی اِک جوا'' میں والدین کو چاہیے کہ نامحرم پر کبھی بھروسہ نہ کریں اپنی بچیاں کسی کے گھر پر اکیلے مت بھیجیں۔ ''ممی'' ٹاپ کلاس کہانی اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بہت شاندار تحریر آٹھ سالہ معصوم بچہ رشتوں کی بے حسی کا شکار ہوکر ایک گائے کو اپنی ممی بنالیتا ہے۔ اس دفعہ تمام کہانیاں بہت بہت...... لاجواب تھیں۔ نیا سلسلہ سخن آباد دل کو چھو گیا۔ تمام خطوط بہت بہت...... شاندار۔ زندگی اُسی شخص کو سلام کرتی ہے جو وقت سے اپنا لوہا منواتا خوب جانتے ہیں۔ زندگی کو ہنستے مسکراتے خوب جیو، نئے سال کا استقبال نئے عزم اور نئی سوچ کے ساتھ کیجیے۔ میری جانب سے قلم قبیلے کے تمام رائٹرز اور قارئین کی خدمت میں سالِ نو کی آمد پر دل کی عمیق گہرائیوں سے ڈھیروں مبارکباد، مالکِ دو جہاں سے دعا ہے کہ اس سال تمام عالمِ اسلام کے مسلمان خصوصاً حکمرانوں کے دل جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوکر پھر سے اپنے ملک کی بقاء اور سلامتی کے لیے دھڑک اُٹھیں۔ اس سال کے بادل امن و امان کی ایسی بارش برسائیں یہ ملک پھر سے ہرا بھرا ہوکر ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے (آمین ثمہ آمین)، کاشی بھائی آپ کو سچی کہانیاں کا مدیر بننے پر ڈھیروں مبارکباد، منزہ آپی کا اداریہ ''کاش'' دل کی آواز ہے۔ بے شک ہم اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ وہ اپنے رحم و کرم کی بارش ہم پر ضرور برسائے گا۔ ''کچھ اپنی باتیں'' کاشی بھائی کی گفتگو بہت متاثر کن تھی۔ قلم کی محبت ہی لکھاری کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ سرورق کی شخصیت مخملی حسن لیے قدرت کا دل کش شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ احوال کی محفل خوب رہی بس ہمارا خط پر لگا کر نا جانے کون سی دنیا روانہ ہوگیا خیر! کوئی بات نہیں (رجسٹری کرانے کے باوجود) احوال پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ پچھلے ماہ کے ایک دو نہیں پورے پانچ تبصرے شاملِ اشاعت تھے۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے باعثِ مسرت ہوگی جو دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں اور شمارہ دیر سے ملتا ہے یا محکمہ ڈاک کی بے جا غفلت کے تحت شامل احوال نہیں ہو پاتے۔ سلسلے وار کہانی من پسند ''ملمعی'' میں مینارِ پاکستان کے بارے میں معلومات پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ''آتشِ جنوں'' بڑے پُرتجسس انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ نیا سلسلہ ''ناگن'' ظلم و بربریت کی ایسی داستان جس میں بگھی کے آگے گھوڑوں کی جگہ چار مرد اور چار خوب صورت لڑکیاں جتی ہوئی سب کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں اور گردنوں میں طوق ہیں۔ چھینکتے، کھانستے قریشی جوہر جو شاندہ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہانیوں میں جا پہنچے۔ پہلی کہانی ''عذابِ رفتگاں'' ڈاکٹر صغیر احمد نے معاشرے کے بہت ہی باریک اور نازک پہلو بے حسی اور جہیز پر قلم اٹھایا ہے۔ اس لعنت کے تحت نا جانے کتنی بیٹیوں کی ڈولیاں اُٹھتے اُٹھتے رہ جاتی ہیں اور گھر تباہ و برباد ہوجاتے ہیں۔ نمایاں شخصیات میں ''بل گیٹس'' میں نوجوان نسل کے لیے کچھ کر دکھانے کا پیغام پوشیدہ ہے۔ بل گیٹس کو 39 برس کی عمر میں مائکروسافٹ اور دوسری ایجادات کے تحت دنیا کے 35 ممالک میں سربراہ کا پروٹوکول حاصل ہے۔ ''فرشتہ یا شیطان'' ٹاپ کلاس کہانی۔ مولوی صاحب فرشتے کے روپ میں شیطان تھے۔ ''وصیت نامہ'' وطن سے محبت کی زبردست کہانی جس کی روح میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ''بیٹیاں پھول ہیں'' فریدہ خانم کی جذبات سے لبریز بہت شاندار کہانی، واقعی بیٹیاں پھول ہیں۔ ان کی خوشبو سے گھر مہک اُٹھتا ہے۔ ''غرقاب'' باہر جانے کے لالچ میں سنگ دل مرد معصوم دلوں کو چور چور کر دیتے ہیں بہت سبق آموز۔ ''عشق عشق'' بہت لاجواب بے شک نبی ﷺ کا ہر قول و عمل وحی کے مطابق ہوتا ہے۔ گڈی آپا کی ''ہاف سٹ'' بہت

زبردست! اینڈ نے رلا دیا۔ ''دستِ ابلیس'' جیسی کہانیوں کی اس معاشرے کو اشد ضرورت ہے ابلیس کے چیلے جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، جو ہمارے اعمال نامے کو سیاہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ''پیاس'' قوم کی ماؤں کے لیے ایک اہم پیغام، اپنے طرز کی انوکھی آپ بیتی، دودھ کی پیاس (جو اُسے کبھی نصیب نہیں ہوا) سیکڑوں انسانوں کا خون پی کر بھی نہیں مٹ سکتی۔ ''رگلو'' لفظوں کی بنت کاری بہت لاجواب تھی۔ سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ تین مرد تین کہانیاں زبردست رہا، اس سے انسانی رواں کی تسکین ہوتی ہے۔ ان میں ''سرخ گلاب'' بہت جاندار رہی۔ نیا سلسلہ پلیٹ فارم میں ''ڈیرے والی'' اچھی لگی۔ ''گوشہ گیر'' ضروری نہیں جو آنکھیں دیکھیں وہ ہمیشہ سچ ہو۔ ہر تصویر کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں۔ تحسین جونیجو! ایسی بھی کیا مایوسی؟ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ جنوری کے شمارے کا نیا پن بہت بھایا مزید خوشگوار تبدیلیوں کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ''سخن آباد'' میں شاعر شاہد فراز، رابعہ منظور، رضوانہ کوثر اور فوزیہ احسان رانا کی شاعری نے بہت متاثر کیا۔ بے حد اور معیاری پسند کیا جانے والا رسالہ ''سچی کہانیاں'' دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ اس کی جڑیں اور مضبوط اور گہری ہوتی رہیں۔ آخر میں اس پیغام کے ساتھ کہ جتنا دنیا میں رہنا ہے اتنی دنیا کی فکر کریں اور جتنا آخرت میں رہنا ہے اتنی آخرت کی فکر کریں۔''

☆ پیاری بہن ثمینہ! ہماری کوششیں آپ کی تعاون کے بغیر بھلا کس طرح کامیاب ہو سکتی ہیں۔ آپ کا تعاون ہی ہمیں مہمیز رکھتا ہے۔ خوش رہیے، آپ کے دونوں تبصرے احوال کی زینت بنا دیے گئے ہیں۔ تبصرہ بڑا شاندار کیا آپ نے، اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

✉ چکوال سے عبدالعزیز جی آ بھائی اپنے منفرد انداز کے ساتھ حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں، جناب سلیم فاروقی



صاحب الوداع کاشی چوہان خوش آمدید۔ السلام علیکم! کاشی بھائی نئی سیٹ، نئی ذمہ داری مبارک ہو۔ امید ہے آپ ہمارے لیے بہتر ثابت ہوں گے۔ فریش پرچہ موصول ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں چودھویں صدی کے منافق دلبروں اور دلرباؤں کی طرح چاپلوسی کا دفتر کھول کے بیٹھ جاؤں۔ میرے دل کا چور اُس وقت جھپاک سے باہر آ گیا جب میں ''محترم سلیم فاروقی صاحب کی ناساز طبیعت کا اشتہار پڑھ رہا تھا۔ کاشی ایک الجھن کی طرف توجہ دلا رہا ہوں'' پچھلے کئی ماہ سے جو ٹائٹل نے پاؤں پھیلا رکھے ہیں خدارا اسے سمیٹیے۔ پلیز۔ خلیل جبار آپ کی تجاویز قابل قدر ہیں۔ عبدالرؤف عدم موسٹ ویلکم بیک آپ کی آمد ٹھنڈی ہوا کا پُر فریب جھونکا ثابت ہوا۔ اب بھاگ نہ جانا ٹارزن جی! پہلی کہانی تاریخ کے جھروکوں سے بے حد پسند آئی۔ راجہ پورس واقعی اپنے وقت کا پورس تھا۔ سچی کہانیاں ایوارڈ فل فور کرائے جائیں۔ ادارے نے ہمیں بہت انتظار کرایا۔ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت نامہ بند کرتا ہوں ہر بار یاد کرنے والوں کو سلام۔

☆ جی آ بھیا...... بتائیے کہ آپ کو اب کیسا لگا پرچہ، امید ہے اب میرے ساتھ آپ سب کا تعاون رہے گا۔ آپ کا خط لیٹ ملا تھا مگر اتنا ہم سے لیٹ ہو گیا کہ...... امید ہے درگزر سے کام لیں گے۔

✉ یہ دوبارہ شرکت ہے چکوال سے عبدالعزیز جی آ کی۔ لکھتے ہیں، السلام علیکم! سچی کہانیاں فریش پرچہ نظر نواز ہوا۔ لیکن سوچ رہا ہوں کہ آج جنوری کی دو تاریخ ہے۔ خط موصول ہونے کی ڈیٹ آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ بتا رہے ہیں اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ پرچے کی شکل دیکھو اور خط لکھنے بیٹھ جاؤ۔ کیونکہ خط کو

آدم آرکیڈ میں سیکنڈ فلور پر آفس تک پہنچنے میں دو اڑھائی دن کا وقت لازمی چاہیے۔ قاری اس قلیل وقت میں کیا پڑھے گا اور کیا تبصرہ لکھے گا۔ ''گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا؟ تخریب کا تلاطم اپنی جگہ۔ وہ تو عرصہ دراز سے ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آپ نے آتے ہی میرا خط ردی کی نذر کر دیا۔ ارے مبارک باد کا جواب تو دیتے؟ آپ جس سنگھاسن پر جلوہ افروز ہوئے ہیں، اُس کے کچھ رموز ہیں۔ کہتے ہیں ناں کہ ''رموزِ عاشقاں عاشق بداند'' مطلب یہ کہ ہم پیشہ اور ہم مشرب ہی بات کو خوب سمجھتے ہیں۔ مدیر اور قاری کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ احوال میں شامل ممتاز سرگودھا والے کو بہت سلام۔ نامہ بند کرتا ہوں ہر یاد کرنے والے کو سلامی۔

☆ پیارے بھائی جی آ۔ لیجیے آپ کا دوسرا خط بھی احوال کی زینت بنا۔ اور رہی بات ایوارڈز کی تو جی آ جی! جلد ہوں گے۔ میں فی الحال آپ کو کوئی ''ڈیڈ لائن'' نہیں دوں گا۔ ان ہی صفحات پر آپ کو خوشخبری مل جائے گی۔ اب تو آپ کو ہم سے کوئی گلہ نہیں۔



✉ یہ ہیں جناب عامر زمان عامر بُورے والا سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ۔ لکھتے ہیں سال نو کے تمام پُرکیف لمحوں کی نوید لیے سچی کہانیاں جنوری 2014 کا شمارہ نئے عزم معیار اور دل گداز قصے دلخراش کہانیاں لیے پوری آب و تاب سے ہر سو رعنائیاں بانٹ رہا ہے۔ پرچہ جس قدر شہرت کی بلندیوں اور معیار کے جس اُفق پہ روز روشن کی طرح دمک رہا ہے اس کا سہرا بلاشبہ پیارے کاشی کے سر جاتا ہے۔ کاشی آپ نے جس محنت، اپنائیت، متحرک ولولے سے پرچے کو دورِ حاضر کے تمام مقبول پرچوں کی صف میں جس قدر و منزلت سے نوازا ہے اس کے لیے مبارکباد اور شکریہ جیسے رسمی الفاظ بہت چھوٹے پڑتے ہیں۔ واہ کاشی کچھ اپنی باتیں۔ میں بڑے خوب صورت انداز میں جناب نے اپنی جملہ مصروفیات، ادارے کی ادبی سرگرمیوں، اسٹاف کی پیشہ ورانہ خدمات اور صبح کے ٹھنڈے سورج، اپنی طلب دل حسرتوں بھرے خواب اور مصروف لمحوں کے دھواں کی نذر ہوتے آرزوؤں کے نایاب پل بہت خوب کتنے جامع انداز سے الفاظ کے سمندر کو اختصار کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ڈیئر اینڈ سویٹ آنٹی رخسانہ سہام، منزہ آپی، رائٹرز و قارئین کرام آداب عرض! سال نو اس سے جڑے تمام راحت بخش خوب صورت لمحات کی بہت مبارکباد۔ منزہ جی! آپ کا پیغام سال نو بلاشبہ نئے دور کی وید ہے۔ بہت کچھ کہا سمجھایا آپ کی سوچ کی تتلیاں فکر کے چمن میں رچ بس گئیں، کاش کہ ایسا ہی ہو۔ او ہو! لو جی بزم احوال میں سال نو کی تمام تر تبدیلیوں میں ہم بھی اِک تبدیلی کا مرکب بنے واہ بہت خوب! ہم بھی بزم احوال میں براجمان ہیں۔ عزت افزائی کے لیے حسب سابق آپ کی بے لوث محبتوں کا مقروض ہوں۔ محمد سرفراز ناز خوش آمدید محترم، محمد اشفاق بٹ گڈ تبصرے کے لیے، چند الفاظ کہے مگر خوب کہا! آہاہاہا کاشی سب لوگ تمہیں منصب ادارت کی مبارکباد دے رہے ہیں۔ عائشہ خورشید واہ کیا عقیدت مندانہ تبصرہ ہے مان گئے استاد، روبینہ شاہین جی اپنے خوب صورت تبصرے اور قیمتی آرا سے نواز رہی ہیں بہت خوب صورت۔ ہم نے احوال میں کیا گل کھلائے یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ ہاں کاشی تحریر کی پسندیدگی اور تبصرہ سراہنے کے لیے سپاس گزار ہوں یہ آپ کا خلوص ہے ورنہ بندہ خاکی کس کام کا...... یہ اپنائیت کا مان نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ ماہ بہ ماہ اس میں نکھار آئے گا۔ پرل پبلی کیشنز اور قلم قبیلہ اس مضبوط قلعے کا نام ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔ مجید احمد جائی خداوند کریم آپ کے والد محترم کو جوار رحمت میں جگہ اور آپ سمیت تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کاشی

جی پرچے پہ رائے سے پہلے آگاہ کر چکا ہوں مختصراً آج مارکیٹ میں جتنے مقبول پرچے ہیں ان سے معیار کا موازنہ کیا جائے تو ہر دل سے اک ہی آواز سر اٹھاتی ہے شاباش کاشی۔ سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ اور واہ کاشی تبصرے، شاعری اور کہانی کے ساتھ تصویر کی اشاعت قابل تحسین اور خوش آئند قدم ہے اور قوی امید ہے بابدولت سمیت تمام اہل قلم اور قارئین اس تبدیلی سے متفق ہوں گے اور اپنے ذہنوں میں جو رائٹرز کی تصوراتی تصویریں سجائے وابستہ ہیں ان کے دیدار سے بلاشبہ ان کے خلوص کو تقویت میسر ہوگی۔ احمد سجاد بل گیٹس کے ساتھ سرفہرست میں ایک ناقابل فراموش سائنس ٹیکنالوجی کی عظیم شخصیت، اک پست درجے سے بلندیوں اور شہرت کے آسمان چھوتے ولولے کی داستان زبردست انداز تحریر۔ عذاب رفتگاں میں ڈاکٹر صغیر نے الفاظ و کردار کے خوب صورت موتی پروئے۔ الیس امتیاز کی فرشتہ یا انسان اک اپنی طرز کی خوب صورت تحریر ہے۔ آصفہ ضیا احمد کی معاشرتی الجھنوں اور محبت کی راہ میں حائل رکاوٹوں، گرداب نشیب و فراز سے جڑی محبت بھری رچی کہانی ہے ہاں اس میں جا بجا موصوفہ نے بڑی مہارت سے ہندکو لب و لہجے کو ترویج سے بیان کیا ہے۔ سب سے قابل ذکر بات موقع محل کی مناسبت سے ہندی بھاشا کا استعمال ہے۔ بشیر احمد بھٹی ایمان فروشی کی تصویر لائے اور ضمیر فروشی کے تمام تقاضے نبھائے۔ مردہ ضمیر اس سے جھنجوڑے جا سکتے ہیں، اچھی تحریر ہے فریدہ خانم آنٹی بیٹیاں پھول ہیں۔ فرزانہ غرقاب احساس کے رشتوں کی نفی کرتی ہے۔ مہر پرویز احمد دلو برادرم عزیز آپ کی ایمان افروز خالصتاً عشق رسول سے گندھی تحریر پڑھ کے ایمان تازہ ہو گیا۔ بہت خوب اِک عرصہ دراز بعد کسی پرچے میں آپ کی سحر انگیز تحریر پڑھنے کو ملی ہے۔ ہمیشہ آتے رہیے گا سب سے زیادہ مسرت ہمیں ہوئی ہے، گڈی آپا کی ہاف سٹ...... کیا رنگ برنگا امتزاج ہے۔ نام انگریزی، کہانی اردو اِک روایتی سے بے حس معاشرے کی جھلکتی تصویر ہے۔ اشفاق احمد بٹ...... لالہ پیاس سے آپ کی کیا مراد ہے ممکن ہو تو وضاحت کر کے ہمیں بھی سمجھایئے گا کہ اس میں کیا پیغام ہے نفرت کا جرم کے ارتکاب کا یا پھر مجرم سے نفرت یا ہمدردی کا؟ دستِ ابلیس بھی زیر مطالعہ رہی اور شیطان کی مہربانیاں پڑھنے کو ملیں اچھی کہانی ہے ایسے کردار بدحواس روح کی طرح اعصاب پر سوار ہو کے اکثر دنیا مافیا سے بیگانہ بھی کر دیتے ہیں لہٰذا داستان کو روداد تک ہی محدود رکھتے ہیں، اعزاز ذکر واقعی مصنفہ کا زبردست شاہکار ہے۔ بہت ساری ایسی باتیں سادگی سے بیان کی گئیں جن پہ ہم اکثر دھیان نہیں دے پاتے ہیں، لیکن ایسے قصے کردار ہماری روزمرہ زندگی میں رونما ضرور ہوتے ہیں۔ رشا نوری بھی گوشہ گیر ہیں کردار و واقعات کی منظر کشی کے معاملے میں خوب انصاف سے کام لیا گیا۔ یادوں کا آئینہ چشم دل تک جھانکتا ہے کبھی یادوں کی پٹاری کھولو تو کتنے دیکھے بھالے مناظر ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتے ہوئے ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی کی امر بیل واقعی اردو ادب کے لیے اِک نایاب سرمائے کا درجہ رکھتی ہے، پڑھ کے دلی تسکین ہوئی۔ مشہور کہانی کار شرارون ورماونٹ کی رگل کے ساتھ شاملِ اشاعت ہیں۔ گھریلو معاملات اور احساس کے رشتوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ سب سے اہم نقطہ یہ کہ بیان میں روایتی ہندی بول چال (مکالمات) سے اجتناب سے کام لیا گیا ہے۔ اعجاز احمد نواب ناگن کا دوسرا حصہ بھی زبردست ہے۔ بہت خوب نواب صاحب۔ کالک محض روایتی نقطوں اور تاریک لمحوں میں اٹھنے والے سیاہ گناہوں کا قصہ ہے۔ الماس روحی کی بے گناہ اِک سبق آموز عبرت کا پیغام ہے۔ اچھا انداز بیان اور مثبت پہلوؤں پر عمل پیرا ہونے کا سبق ہے، آگہی کا عذاب نصرت سرفراز کی فکر انگیز انتقامی جذبوں پر استوار گو کہ اچھی داستان ہے، لیکن بہت سارے منفی پہلو توجہ طلب ہیں جس سے مثالی معاشرت سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔ انہیں بھی احاطہ تحریر میں

سماتیں تو کیا بات تھی۔ چراغ بالی قدیم زمانہ سے وجود میں آنے والی دشمن کردار اور دشمنی کے فسادات معاشرتی جرائم کی تصویر ایسا کردار جو نہ صرف پنجاب بلکہ پورے پاکستان میں زبان زدِ عام قصہ ہے۔ بھٹی صاحب مودبانہ گزارش ہے فلمی قصے کہانیوں میں ہمیشہ سننے اور پڑھنے میں تضاد کا شکار رہے ہیں ایک کردار سے ایک ہزار داستانیں منسوب ہیں۔ فرمائیے کس کو حرفِ آخر مان کے یقین کیا جائے۔ بندہ پرور تین مرد تین کہانیاں کے عنوان سے مستقل کالم کی ترتیب تو بہترین حسن ترتیب ہے۔ ہر طبقہ فکر اور معاشرتی رنگ کی جھلک ہے۔ مدیر! حضرت تم نے تنقید کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے۔ نسیم اعظمی تمہاری الیمنی رشتوں میں بٹوارے کی کسک ہے۔ نادیدہ مہرباں پڑھ کے ہر ذی شعور اپنی ذات کا احتساب بخوبی کرسکتا ہے۔ قابل قدر طاہر کیا بات ہے۔ تمہارے سرخ گلاب سے اپنی سرزمین کی بھینی سی معطر خوشبو آئی اور بلاشبہ سرخ گلاب اس ماہ کی سب سے بہترین تحریر ہے۔ غربت میں رچی بسی لاچارگی سے اٹا کردار روزی برملا مکالمات سے بھرپور دیدہ زیب پلاٹ، عمدہ منظر کشی ہماری طرف سے محبتوں کے سرخ گلاب قبول لیے۔ پڑھ کے سر فخر سے بلند ہوا کہ سرزمین بورے والا ادب پروری میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ڈیرے والی ہمارے ملک خداداد کو درپیش بیرونی عناصر دشمن کی طرف واضح کڑی ہے۔ ارشد کی منکھنی داستان بجوبہ میں اسلامی نظریہ کی تشہیر اس قسط کا خاصہ ہے، مسئلہ یہ ہے خلقِ خدا کے لیے مشعل راہ بنانے والو! تمہارے دونوں جہاں نور سے منور ہوں۔ سخن آباد میں ایک بار پھر داد کے مستحق ٹھہرے ہیں طاہر اقبال۔ اس کے علاوہ فوزیہ احسان رانا، فریدہ جاوید فری اور مجید احمد جائی کا کلام قابل صد تعریف ہے وصیت نامہ ہر عاشق نامدار کے لیے محبتوں کا وصیت نامہ ہے۔ ہر عاشق صادق کا ماجرا ہر محبت بھرے دل کی کہانی عقیدت کے پھول شاہ محمد کے نام۔ ہر لحظہ نظر کے صحرا میں، ہر ذرہ مثل لیلیٰ ہے، گھر لوٹ چلو اب قیس میاں، اب حال سودائی کس کارن؟

☆ بہت پیارے عامر۔ دیکھو تم محفل میں آئے اور اس برفیلے موسم میں زوردار تبصرہ سے محفل گرمادی۔ واہ کیا خوب تبصرہ ہے تمہارا، جیو کہ تم ہمارا مان ہو۔

✉ یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن رضوانہ کوثر کی لاہور سے۔ لکھتی ہیں کاشی بیٹے، السلام علیکم، جنوری 2014 کا سچی کہانیاں آن بان شان سے تشریف لایا۔ عائشہ خان لبوں پہ ہنسی کے پھول سجائے سالِ نو کو خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔ من پسند دوسروں کے سپرد کیا کہ ہم استعمال نہیں کرتے۔ جوہر جوشاندہ رکھ لیا کہ موسم کی ضرورت ہے۔ اپریل میں کپڑے دھوئے، باقی اشتہارات کو خیرباد کہہ کر آگے بڑھے۔ کاشی بہت مبارک ہو۔ مدیر ''سچی کہانیاں'' پلیز انہیں سچا ہی رکھنا جو کہ آپ سے پوری امید ہے۔ فہرست پہ نظر دوڑائی۔ منزہ جی ''کاش'' اللہ یہ دعائیں بہتری سے مستجاب فرمائے۔ آمین، کاشی کی اپنی باتیں بالکل سچی لگیں۔ اللہ آپ کو یہ تمام ذمہ داریاں ایمانداری سے نبھانے کی قوت اور حوصلہ دے۔ آپ واقعی بہت محنتی ہو۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ آمین، اور اجرِ عظیم دے۔ محفل بھی عروج پر رہی۔ جنہوں نے میری کہانی پڑھی ان سب کا شکریہ، نمایاں شخصیات کے سچے واقعات معلوماتی اور دلچسپ سلسلہ ہے۔ شاعری کا سخن آباد بھی اچھا ہے۔ تحریریں بھی معیاری ہیں اور تبدیلیاں بھی خوب ہیں۔ نکھار آرہا ہے، سچی کہانیاں معیاری ہونے پر آپ سب ستائش کے حق دار ہیں۔ بہت خوب، سوچا نئے سال میں سب ساتھیوں سے مل لیا جائے۔ بہت عرصہ ہو گیا حاضری لگوائے سو تبصرہ اُدھار، ہر ساتھی کے لیے سلامتی اور صحت کی دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ کہ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ اشعر جواد کو 4 فروری کو سالگرہ مبارک ہو۔

☆رضوانہ آپی! آپ سب سے محبت کرتی ہیں اسی لیے ہر کوئی آپ سے محبت کرتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیں، جوشاندہ پئیں، سردی کا مقابلہ کریں۔ اگلی بار تبصرہ تفصیلی ہو۔

☒احوال میں یہ تبصرہ ہے ہماری پیاری بہن سنبل کا کراچی سے۔ لکھتی ہیں، محترم ایڈیٹر کاشی چوہان صاحب!



السلام علیکم! اب تو تم سے اسی طرح مخاطب ہونا پڑے گا ظاہر ہے تم بات جو نہیں سنتے ہو۔ دسمبر کا سچی کہانیاں ''سپر'' تھا۔ ہر کہانی انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھی، ایک عرصے بعد سچی کہانیاں پڑھ کر مزہ آیا ورنہ ٹو بی ویری فرینک سچی کہانیاں پڑھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی نوآموز کو پڑھ رہے ہوں۔ خدا کرے کامیابیاں تمہارے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قدم چومیں (آمین) کچھ برا لگا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ اب اجازت دو، فی امان اللہ۔ تمہاری کامیابیوں، خوشیوں، صحت وسلامتی کے لیے دعا گو۔

☆ارے ارے آپی جی! اتنا غصہ، چلیے بہت جلد آپ کے تمام مطالبے پورے کر دیے جائیں گے۔ خفا نہ ہوا کریں، بہت ڈر لگتا ہے آپ کی خفگی سے۔ اگلی بار آپ نے بھرپور تبصرے سمیت آنا ہے، خوش رہیے۔

☒احوال میں یہ شرکت ہے شارجہ دبئی سے محمد شہزاد کنول کی۔ لکھتے ہیں السلام علیکم! میگزین سچی کہانیاں کی



پوری ٹیم اور پڑھنے لکھنے والوں کو میری طرف سے بہت بہت دعاؤں کے ساتھ عاجزانہ سلام، امید کرتا ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے اور میں رب تعالیٰ سے آپ سب کی خیریت اور تندرستی چاہتا ہوں۔ جناب پہلی دفعہ احوال میں آنے کا اتفاق ہونے لگا ہے سچی کہانیاں میگزین میں جو میری اپنی ذاتی زندگی کی داستان ہے، جو ماضی بن کر دھندلی ہوگئی اور میرے حال کو بکھیر کر میری زندگی کو افسانہ بنا گئی۔ جناب لکھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو یا آپ کا ادب کرنے میں کمی رہ گئی ہو تو میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں۔ میرا خود کا واسطہ آج تک دوسرے ڈائجسٹوں سے رہا ہے جن میں آج تک جگ بیتی یا دوستوں کی کہانی یا جو میرے پرستار مجھ سے اپنا دکھ شیئر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں لکھی ہیں مگر اب خود کی بیتی میں ڈائجسٹ سچی کہانیاں میں شائع کروانا چاہتا ہوں یقین کریں بہت خوشی ہوئی بہت پسند آیا ڈائجسٹ اور لکھنے والوں کے الفاظ جن میں حنا بشریٰ کی لکھی دوسری لہو رنگ کہانی لہو پکارے گا، ایک محبت ایک مذاق، عمران خان بارشوں کے شہر میں، اختر شہاب میرا مقدر پچھتاوا، شاہجہاں ملک کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ میری آپ بیتی بھی جب لوگوں کی نظروں کے سامنے آئیگی تو سب دوست اپنی اپنی رائے ضرور دیں۔ والسلام اللہ تعالیٰ آپ سب کو عزت بخشے آمین۔

☆بہت پیارے شہزاد۔ سلامت رہو! آخر تم نے بھی قلم اٹھا ہی لیا، شکر ہے کہ تم آ گئے ورنہ ہم تو تمہیں ایک سال سے صدائیں دے رہے تھے۔ چلو اب آ گئے ہو تو مستقل حاضر رہنا، تمہاری شاعری شائع کر دی گئی ہے۔ جلد ہی کہانی بھی لگ جائے گی۔

☒یہ نامہ ہے جیکب آباد سے غلام رسول گل کا، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب السلام علیکم! میں کسی



ادارے میں یہ پہلا خط لکھ رہا ہوں جس کی خاص وجہ آپ اور مور شاہد حسین ہیں۔ میں سچی کہانیاں عرصہ سے پڑھتا آ رہا ہوں مور شاہد اکثر مجھے کچھ لکھنے کو کہتے تھے مگر میں ہمیشہ مصروفیت کا بہانہ کر کے ٹال دیا کرتا تھا۔ آپ نے دسمبر کے بعد جنوری کا پرچہ دے کر میرا دل جیت لیا اور مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ آپ سچی کہانیاں میں دو ماہ سے مدیر کے عہدے

پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ماشاء اللہ آپ کی محنت اور فن دونوں یقیناً قابل داد اور قابل ستائش ہیں جب جنوری کا پرچہ ملا تو میں دیکھتا ہی رہ گیا سچی کہانیاں کو نئے انداز میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی آپ کی محنت اور لگن کو سلام۔

☆ پیارے گل۔ سدا خوش رہو اور اب جب تم ہمارے پاس آ ہی گئے ہو تو ہم تو تمہیں کہیں جانے نہیں دیں گے۔ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہونا۔ یہ ہمارا پیار سمجھو یا حکم۔

✉ یہ نامہ ہے ہمارے پیارے لکھاری مور شاہد حسین کا حب چوکی، بلوچستان سے۔ تحریر کرتے ہیں۔ بہت ہی



پیارے کاشی چوہان بھیا محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ امید ہے آپ سچی کہانیاں کا پورا اسٹاف اور قارئین حضرات خیر و خیریت سے ہوں گے، سب کے لیے دعائیں اور نیک تمنائیں۔ سال نو کا پہلا شمارہ بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب تھا بے حد پسند آیا۔ کاشی بھیا آپ کو دونوں ہاتھوں سے سلام ہو، آپ نے آتے ہی سچی کہانیاں کو چار چاند لگا دیے۔ اتنا معیاری پرچہ مہیا کرنے پر بے حد نوازش۔ خوش گوار تبدیلیاں بے حد پسند آئیں، اس بار سچی کہانیاں ہر حوالے سے لاجواب اور معیاری تھا۔ جنوری کا پرچہ اپنے جلوے دکھاتے ہوئے 30 دسمبر کو موصول ہوا۔ ٹائٹل اچھا تھا فہرست پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر تھی۔ منزہ سہام نے ''کاش'' کے عنوان سے لاجواب لکھا۔ ہم غریب عوام صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔ آپ کی تحریر ''کچھ اپنی باتیں'' آج کل ہم سب مصروفیت کے دھوئیں میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ کوئی جاب، نوکری، مزدوری اپنے اپنے کام کے دھوئیں میں مصروف رہتا ہے مگر جب اسے اس کی محنت کا پھل ملتا ہے تو وہ واقعی دھواں شہد سے میٹھا بن جاتا ہے۔ احوال کی محفل میں جیسے ہی قدم رکھا آپ کا دیدار ہوا۔ محفل اپنے عروج پر تھی خط شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ محفل کا نیا رنگ بہت بھایا۔ یہ سچی کہانیاں سے آپ کی محبت، محنت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میجر (ر) امتیاز حسین، عروبہ عدنان، عامر خان عامر، محمد سرفراز ناز، فیصل اقبال، رانجھا خان ساگر، ویلکم محمد اسماعیل بروہی، تحسین جونیجو، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، محمد سلیم اختر، وقاص حسین، ساحل ابڑو السلام علیکم! کیسے ہیں آپ۔ کاشی بھیا ویری سوری اگر تبصرہ کرتا تو شامل احوال نہ ہوتا۔ اگر زندگی رہی تو اگلی بار انشاء اللہ مکمل تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا، اب ایک کہانی کے ساتھ حاضر ہوں اگر معیاری ہو تو کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔ برائے کرم حوصلہ افزائی کی امید ہے، اب اجازت اپنا بہت بہت خیال رکھیے گا۔

☆ چلو بھائی۔ اس بار آپ کی معافی قبول کی مگر اگلے ماہ اگر بھرپور تبصرہ نہیں کیا تو آپ سے ناراضگی پکی ہے۔

✉ احوال میں یہ براہ راست انٹری دی ہے ہمارے سینئر لکھاری اور شاعر جعفر خان جمالی نے کراچی سے۔ لکھتے ہیں السلام علیکم! آج بہت عرصے بعد آپ کی خدمت میں ایک چھوٹی سی کاوش پیش کر رہا ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ادب کی خدمت کرنے سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ یوں تو آپ کا ماہنامہ بغیر کسی رکاوٹ کے ہر ماہ میز پر ہوتا ہے لیکن وقت کی کمی مجھے ان سے دور رکھتی ہے پھر بھی کچھ کہانیاں اور اشعار پڑھ کر دل کو بہلا لیتا ہوں...... آپ کی کہانیاں ماشاء اللہ دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر دلوں اور دماغوں کو تسخیر کر رہی ہیں، ملک و ملت کے ابتر حالات کے باوجود اچھا لکھنے والوں کی ملک میں قلت نہیں ہے...... سب کی آرزو یہی ہے کہ ہم سب اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور نیک فعال سے ملک و ملت کی بہتری کا سوچیں۔ ملک و ملت کی روز بروز بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو بہا رہا ہے اور ہم ہیں کہ ایک بے

حس فرد کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فقط آپ کا لکھاری

خوں طلب انقلاب ہے درکار
جب کہیں صاف ہوگا یہ سنسار

☆ جمالی جی! آپ کا احوال میں آنا، انقلاب ہی تو ہے، آپ بنفسِ نفیس آئے، ہماری محنت وصول ہوگئی، سلامت رہیے اور تحریر کی صورت کب تعاون فرمائیں گے؟

✉ یہ ہیں ہمارے ساتھ احوال میں نگہت غفار صاحبہ کراچی سے۔ لکھتی ہیں، اچھے بیٹے کاشی چوہان السلام علیکم! اللہ رب کائنات آپ کو، آپ کی فیملیز کو ''سچی کہانیاں'' اور سچی کہانیوں کی فیملی کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے (آمین) آج ہی رسالہ موصول ہوا یہ دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرا افسانہ شائع ہوا ہے۔ ٹائٹل پر معصوم سی مسکراہٹ بھلی لگی۔ ''کچھ اپنی باتیں'' پیارے بیٹے کاشی ہزاروں برس جیو، حیات کے اس سفر میں، جیون کی اس راہ میں، زندگی کے اس موڑ پر اللہ تعالیٰ تمہیں بے حساب خوشیاں، مسرتیں، کامیابیاں نصیب کرے (آمین) تم سفید دوپٹے میں کھو جاتے ہو اور میں اُس پیارے سے، معصوم سے، ہنستے مسکراتے لاأبالی سے کاشی کو تلاشتی ہوں۔ اِس افسانے کی اشاعت نے یقین دلا دیا کہ تم آنٹی کو نہیں بھولے، اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ چند کہانیاں پڑھی ہیں ''نکموں'' مختصر مگر دُکھی کہانی تھی۔ رضوانہ کوثر کی کہانی ''عجب مقدر ہے میرا'' پسند آئی۔ شعبان کھوسہ کی حقیقت سے قریب کہانی اچھی تھی۔ جیون کا کھیل، ایسا بھی ہوتا ہے کہانی دُکھی کرگئی۔ ''نفس امارہ'' علی عباس حسینی کی تحریر بہت اچھی لگی۔ ''التماس'' نعمان الحق کی تحریر بہت مختصر تھی مگر پسند آئی۔ ارشد علی ارشد ''ملکشی'' کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔

☆ نگہت آنٹی۔ آپ کا صحت اور سلامتی کی دعاؤں کا اور آپ کا احوال میں آنا ہی ہمارے لیے اچھی بات ہے۔ بس آپ ہمارے سچی کہانیاں کا مطالعہ کریں اور آپ کا تبصرہ ہماری محنت کا حاصل ہوگا۔

✉ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے حب چوکی سے شفقت حسین کی، لکھتے ہیں ماہنامہ سچی کہانیاں کے مدیر کاشی



چوہان، اسٹاف کے دیگر لوگوں اور لکھاری و قارئین حضرات کی خدمت میں صحت سلامتی خوشی کامیابی و کامرانی اور دعاؤں کے ساتھ محبت و خلوص بھرا اسلام حاضر ہو۔ احوال یہ ہے کہ نئے سال کی پہلی صبح کو دل کش ٹائٹل کے ساتھ تازہ شمارہ ملا، خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ جنوری کا پرچہ گزشتہ پرچوں سے بے حد پسند آیا، آپ کی محنت لگن اور سچائی کا یہی بہتر ثبوت ہے۔ دسمبر کا پرچہ مجھے مور شاہد حسین نے گفٹ کیا تھا کیوں کہ ان کی کہانی موجود تھی۔ دسمبر کا پہلا پرچہ آپ نے دیا مگر جنوری کا پرچہ اس سے بھی زیادہ عمدہ اور معیاری تھا۔ اس پرچے میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ تھی ''احوال'' اِس بار احوال کی محفل کو آپ نے خوب صورتی سے سجایا آپ کی خوبی اور کمال کو سلام۔ آپ کے لیے مزید کامیابیوں کی دعائیں، یکم جنوری کو پرچہ ملا، کچھ مطالعہ زیرِ نظر ہے اور کچھ زیرِ مطالعہ ہے۔ وجہ مصروفیات اور پہلی بار خط لکھنے کی کوشش کی وجہ سے چند کہانیاں پڑھی ہیں، بے حد پسند آئیں۔ ایک گزارش ہے کہ سچی کہانیاں حب چوکی میں لیٹ آتا ہے۔ پلیز کوشش کریں کہ جلد از جلد مل جائے تو انشا مکمل تبصرے کے ساتھ ہر ماہ حاضری دوں گا۔

☆ سب سے پہلے تو بھائی شفقت آپ کو احوال میں خوش آمدید، آپ کی شکایت متعلقہ شعبے تک پہنچا دی گئی ہے۔ باقی اب آپ کی آمد ہمیں اپنے پرچے میں مستقل چاہیے۔

✉ یہ ہیں جناب ہمارے ساتھ فیصل ندیم بھٹی صاحب سرگودھا چک نمبر 58 شمالی سے، لکھتے ہیں۔ موسم تبدیل ہورہا ہے اور موسم کے ساتھ ساتھ آپ کے شمارے میں تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ شمارے کا وقت سے پہلے مل جانا اچھی تبدیلی ہے۔ بہر کیف آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ نومبر میں آپ نے میرا خط شائع نہیں کیا۔ میں نے اپنی پہلی کہانی ''جب قدرت مہرباں ہوتو'' کے عنوان سے بھیجی تھی اتنا بتادیں کہ کہانی اشاعت کے قابل ہے یا نہیں، ایک اور کہانی لکھ رہا ہوں جلد ہی آپ کو ارسال کروں گا۔ خطوط کے حوالے سے حافظ مون شاہ بخاری کا خط بہت پسند آیا خاص طور پر خط کا ابتدائیہ سدرہ انور علی سے کافی عرصہ سے ان کے خطوط اور خیال آرائیاں پڑھ رہا ہوں بہت ہی متاثر کرنے والے الفاظ کا استعمال کرتی ہیں۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر ہوجائے۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور حوصلہ ملا کہ میری کہانی بھی جلد شائع ہوجائے گی۔ رضوانہ کوثر کی کہانی عجب مقدر ہے میرا متاثر کن کہانی ہے۔ باقی ابھی مطالعہ کرنا ہے۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام۔

☆ پیارے بھائی فیصل۔ آپ نے محبت سے پڑھا اور محبت سے احوال میں خط بھی لکھا۔ مگر اتنا مختصر......؟ مجھے پورا یقین ہے آپ اگلی بار احوال میں بھرپور تبصرے کے ساتھ آئیں گے۔ آپ کی کہانی بھی جلد شائع ہوجائے گی۔

✉ احوال میں یہ شرکت ہے امیر مراد انصاری کی نیو کراچی سے۔ لکھتے ہیں، محترم بھائی کاشی چوہان صاحب السلام علیکم! کالم احوال میں خوش آمدید، دسمبر 2013 کے شمارے میں محفل میں شریک کرنے کا بہت بہت شکریہ، اداریہ کوہ گراں میں کوئی جان نہیں تھی جبکہ بازگشت میں مصلحت اچھی تحریر تھی اور موجودہ حالات کی سو فیصد عکاسی کررہی ہے۔ دسمبر کے اس شمارے میں کراچی کی بہن عائشہ خورشید انور، محترم سلیم فاروقی صاحب پر برس رہی تھیں کہ وہ میری کہانیاں شائع نہیں کرتے، سلیم فاروقی صاحب کی یقین دہانی پر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

☆ بھائی امین خوش آمدید، مگر تبصرہ کیا ہوا؟؟

✉ احوال میں یہ انٹری ہے محمد حیات خان نیازی کی دریا خان، بھکر سے۔ لکھتے ہیں، جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! میں ماہنامہ سچی کہانیاں کا دیرینہ قاری اور لکھاری ہوں۔ اب لکھنا تو موقوف کررکھا ہے، مگر پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کی سابقہ کابینہ (ادارت) نے قارئین سے جو نامناسب رویہ اختیار کیا تھا اس کا ہم بھی شکار ہوئے۔ بہر حال ناگن کی پہلی قسط بڑی جاندار اور شاندار تھی۔ کاشی چوہان بڑی خوب صورت شخصیت، حیثیت، اہلیت، اہمیت رکھتے ہیں۔ امید ہے اپنے انداز و معیار کے مطابق تحریروں کا انتخاب کریں گے اور سچی کہانیاں کو ایک حقیقی سچی کہانیوں کا ترجمان پرچہ بنادیں گے۔ احمد سجاد بابر تاریخ کے صفحات سے ایک دل کش عطر کشید کرلائے اور راجہ پورس کی زندہ جاوید کہانی کو ہم تک پہنچایا۔ ہمارے ہاں تو راجہ پورس کے بڑے بڑے ہاتھی موجود ہیں، ایک راجہ تو ابھی حال میں راجہ رینٹل کے نام سے رخصت ہوئے اور بجلی کے بحران میں ان کا کردار بھی راجہ پورس کے ہاتھوں سے کہیں کم نہیں، سچی کہانیاں اور ایم سلیم اختر لازم ملزوم نام ہیں۔ اس ماہ ان کی تکون بھی ہمہ جہت پہلو کی ایک خوب صورت کہانی ہے۔ جس کے تین کونے تھے اور جذبات، احساسات اور خیالات کی بھرپور تکون تھی۔ ہماری طرف سے ان کو نہ صرف مبارک باد بلکہ شکریہ کہ اب بھی آپ اور آپ کا قلم رواں دواں اور جواں جواں ہے، پھر ارشد علی ارشد، اختر شہاب، ڈاکٹر سید علی ارسلان، سلیم فاروقی، محمد الیاس، سچی کہانیاں کی وہ شاداب و سرسبز شاخیں ہیں جن کے پھل بھی بڑے خوب صورت، لذیذ اور رسیلے ہوتے ہیں۔

ان کی تحریریں پرچے کے معیار کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایسے اچھے رائٹر کسی اعلیٰ پائے کے پرچے کی ہی زینت بنتے ہیں۔ ابھی میرا پہلا تبصرہ وتذکرہ ہے، اب آنا جانا لگا رہے گا۔ بشرطیکہ کہ آپ کی محبت کی غذا اور طاقت ملتی رہے۔

☆ پیارے بھائی حیات! خدا آپ کو بھی صحت، سلامتی سے نوازے (آمین)، بھیا آپ آئے اور یوں خالی ہاتھ......؟ اب آپ جلدی سے کوئی تحریر بھیجیں پھر آپ سے بات ہوگی۔ تبصرہ آپ کا ہمیں ہر ماہ چاہیے، اتنا تو ہمارا آپ پر حق ہے نا جناب؟؟

✉ یہ نامہ ہے سوہاوہ **ضلع جہلم** سے ڈاکٹر صغیر احمد عاجز صاحب کا۔ لکھتے ہیں السلام علیکم ورحمتہ اللہ علیہ، دسمبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے، سرورق جاذب نظر ہے، مجموعی طور پر پرچے کی اثر انگیزی سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ رلجہ پورس پڑھ کر بہت مزا آیا۔ امید واثق ہے کہ آئندہ بھی تاریخی حقائق پرچے کی زینت بننے کے ساتھ قارئین کو تاریخی معلومات سے بہرہ مند ثابت ہوں گے۔ میں ایک بیٹی ہوں معاشرے کی ناہمواریوں کی کھلی داستان ہے۔ ایک مشرقی بیوی کی اخلاقی اقدار کی عکاس بھی ہے۔ 30 سال مکمل ہونے پر تمام کارکنان کو مبارکباد، خدا تعالیٰ آپ کو مزید استقامت اور عزت بخشے، خدا آپ کو سکھی رکھے (آمین)

☆ ڈاکٹر صاحب جنوری کے شمارے کے بعد آپ تو ہم سے تو کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ صغیر بھائی مجھے آپ سے بھرپور تبصرے کی توقع تھی مگر...... امید ہے آپ اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

✉ لہڑی بلوچستان سے یہ آمد ہے محمد اسلم آزاد کی۔ لکھتے ہیں السلام علیکم! بعد از سلام خیریت احوال اس طرح ہے کہ میں ماہ اگست 2013ء میں پہلی مرتبہ ماہنامہ دوشیزہ میں شامل ہونے کے لیے اپنی تحریر انتقام ارسال کی۔ مگر تا حال کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور نہ ہی تحریر شائع ہوئی ہے اس مرتبہ ایک بار پھر اپنی تحریر دل کا چور ارسال خدمت کر رہا ہوں امید ہے کہ سال نو 2014 کے ایڈیشن (شمارے) میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆ پیارے بھائی آزاد آپ کو یقیناً یاد ہوگا آپ کی تحریر انتقام کے بارے میں نا صرف آپ کو فون پر بتایا گیا تھا بلکہ اُس کے ناقابلِ اشاعت ہونے کی وجہ بھی بتادی گئی تھی۔ امید ہے اب گلہ نہ رہا ہوگا۔ باقی اس ماہ کے شمارے میں آپ کے لیے آپ کی تحریر کی صورت ایک تحفہ موجود ہے۔

✉ یہ نامہ ہے بورے والا سے ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست رانا محمد شاہد کا، لکھتے ہیں۔ جنوری کا شمارہ



معروف ماڈل عائشہ خان کے سرورق کے ساتھ ملا۔ سچی کہانیاں میں نئی تبدیلیاں یقیناً مثبت ہیں۔ رسالے کا ایڈیٹر تبدیل ہوا ہے تو یہ تبدیلیاں تو بنتی ہی ہیں اور یہ رسالے کی سرکولیشن بڑھانے میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ احوال کا نیا انداز، غیر ملکی ادب، سرحد پار ادب سے انتخاب اور پلیٹ فارم سچی کہانیاں کو انفرادیت کی طرف لے کر جائے گا۔ احمد سجاد بابر نے اس دفعہ دنیا کے امیر ترین شخص بل گیٹس کی جدوجہد سے بھرپور کہانی پیش کی۔ منزہ سہام کے اداریے کے حوالے سے مزید کیا کہیں کہ رب العزت ہمیں بھی اُسی طرح زندہ قوم بنادے، جس طرح گزشتہ ماہ ایک بھارتی سفارتکار کی توہین پر پورا بھارت ایک زندہ قوم کی مانند اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور امریکیوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ زندہ قومیں وہی ہوتی ہیں جو اپنے ایک ایک شخص کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں اور زندہ قوموں کو سب سے پہلے اپنی عزتِ نفس اور وقار کا خیال رکھنا پڑتا ہے جبکہ بھکاریوں کی نہ عزتِ نفس ہوتی ہے اور نہ وقار۔ ہم تاریخ

سے بیشک سبق نہ سیکھیں مگر دیوالی کے لیے بھارتی روپے سے ہی سیکھ لیں۔ اپنا کھویا ہوا وقار ہی واپس لے آئیں اور اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونا پڑے گا یعنی خود انحصاری کی پالیسی اپنانا پڑے گی۔ احوال کا نیا اسٹائل اچھا لگا۔ گزشتہ سے پیوستہ ماہ خط لیٹ کمرز میں تھا۔ اس دفعہ پتا نہیں کہاں گیا، شمارہ تھوڑا لیٹ ملا تھا، پھر بھی گزشتہ ماہ خط 2 دسمبر کو کوریئر کر دیا تھا۔ اب پتا نہیں کس "مہربان" کی مہربانی سے احوال کا حصہ نہیں بن پا رہے......؟ تفصیلی تبصرہ اگلے ماہ سہی، اس دفعہ نئے ایڈیٹر کاشی چوہان صاحب سے کچھ گپ شپ کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مزدوری کرنے والا ہی مزدور کی کیفیتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ گرمی میں جان جوکھوں میں ڈالنے والا ہی گرمی کی شدت کو سمجھ سکتا ہے۔ آپ نے اپنے پہلے ابتدائیے میں جن احساسات و جذبات میں ادب کی دنیا میں قدم رکھا تھا، یقیناً نئے لکھنے والوں کو بھی انہی احساسات وجذبات کے تناظر میں دیکھیں گے، جیسا کہ خود آپ نے اپنی باتوں میں کہا تھا۔ میں انشاء اللہ جلد آپ کو مزید کہانیاں بھیجوں گا۔ لیکن اس سے پہلے گزشتہ چند ماہ میں آپ کو 5 عدد کہانیاں ارسال کر چکا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک لکھنے والے کے لیے اس کی کہانی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ میں ان کہانیوں سے متعلق آگاہی ضرور چاہوں گا۔ اب ایک رائٹر کے لیے انتظار کیا ہوتا ہے۔ آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔ نئے سال پہ پاکستان کے لیے دعا ہے کہ اللہ اس وطن خاص طور پر شہر کراچی کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ (آمین)

☆ پیارے بھائی شاہد! خوش رہو۔ آپ کا تبصرہ اچھا لگا مگر تشنگی برقرار رہی۔ کہانیاں جلد شائع ہو جائیں گی، احوال میں اب آپ پوری فارم میں نظر آئیں۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن تحسین جونیجو کی بوبڑی شریف سیہون سے۔ لکھتی ہیں، پیارے بھائی کاشی چوہان السلام علیکم! پھولوں میں بسی مہکتی خوشبوؤں کے سنگ نیک تمنائیں آپ کے نام، ساتھ ہی احوال محفل میں بھلی کرے آیا۔ تازہ شمارہ دل کش ماڈل کے سنگ، بہت لیٹ یعنی 28 دسمبر کو موصول ہوا۔ حکم صادر کیا گیا تھا کہ 5 تاریخ آخری ہوگی، بھلا مطالعے کے بغیر تبصرہ خاک ہوگا۔ گھریلو ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے بس ایک دن میں جو بن سکا حاضر خدمت ہے۔ جہاں فاروقی انکل کا الوداع اداس کر گیا، وہیں کاشی بھائی کی آمد سے دل سرشار ہوا، کہ چلو کوئی ہمیں بھی سننے والا ہے۔ گزشتہ خط میں کئی باتیں لکھیں جو کہ صرف آپ نے ہی پڑھی ہوں گی اور ساتھ ہی جان بھی گئے ہوں گے کہ میں نے وہ خط کتنی بے دلی سے لکھا تھا۔ ایک بار پھر منزہ آپی اداریہ "کاش" لیے جگمگائیں ان سے ٹپکنے والی بوندوں پر ہم نے بھی دل سے (آمین) کہا۔ بھیا انشاء اللہ تعالیٰ ہمارا تعاون بھی ساتھ رہے گا، خوش رہیے۔ کچھ اپنی باتیں دھواں دھار، دھماکے دھار بھاپ اڑاتی گرما گرم چائے کی طرح لبھا گئیں، ویلڈن بھائی۔ میجر امتیاز حسین ملک انکل آپ کو کافی پڑھا ہے انہی صفحات پر اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری پیاری دوست عروبہ عدنان آپی آپ کی بیٹی ہیں، یہ مختصر تعارف اور ملاقات بہت اچھی لگی۔ شکوہ نامہ لیے وقاص حسین صاحب خوش آمدید، آپ کا نام پہلے بھی نظر سے گزرا ہے، ہم اگنور نہیں کرتے، ایسے تو کوئی بھی یاد نہیں رکھے گا جب تک پکارا نہ جائے۔ ادا مور شاہد حسین وفا غلام قمر شہداد کوٹ سندھ اب ٹھیک ہے ناں؟ نام ہے یا ٹرین میرے بھائی اتنے ناموں میں الجھن نہیں ہوگی کیا...... انشاء اللہ جلد تحریر بھی لائیں گے، خوش رہیے۔ سلیم اختر انکل اتنی مختصر سی آمد؟ سدرہ انور وعلیکم السلام، ہاں جی جناب یہ بھی بڑی بات ہے کہ آپی نے جواب تو دیا ناں، غصہ تو نہیں تھیں، اگر ہو بھی جائیں تو مجھے بتا دیں ٹھنڈا کرنا مجھے خوب آتا ہے، بس ذرا آپی اور میرے مزاج میں تھوڑا فرق ہے، تبھی تو شاید ایسا لگا۔

اب باری ہے کہانیوں پر رائے کی۔ ارشد علی ارشد بھیا کی ''ملمعنی'' بلاشبہ ایک لاجواب رنگ بدلتی دل موہ لینے والی معلوماتی خوب صورت تحریر، ویلڈن بھائی۔ مزید متاثر کرنے والی تحریریں، مہر پرویز دلو کی ''عشق عشق'' طاہر اقبال ''سرخ گلاب'' نصرت سرفراز ''آگہی کا عذاب'' محمد علی اسد بھٹی ''چراغ بالی'' ثمین غزالہ نیہان کی ''نادیدہ مہرباں'' شاہ محمد تبریزی ''ڈیرے والی'' گڈی آپا ''ہاف سٹ'' آصفہ ضیاء ''جھولا'' اور فریدہ خانم ''بیٹیاں پھول ہیں'' سب نے اپنے اپنے موضوع کے حوالے سے بہترین لکھا۔ اب کی بار اتنا ہی اجازت اللہ حافظ

☆ پیاری سی بہنا تحسین! خوش رہو اور تمہاری آمد ہمارا مان بڑھا دیتی ہے، ذرینہ آپی سے کہو فارم میں آجائیں آپ کا بھائی آپ کی تحریر کا منتظر ہے۔

☒ احوال میں یہ ہیں ہماری دوست لکھاری عطیہ زاہرہ، لاہور سے، لکھتی ہیں۔ محترم مدیر کاشی چوہان صاحب، آداب عرض کرتی ہوں! سب سے پہلے آپ کو اور آپ کے ادارے کو نیا سال بہت زیادہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ نیا سال ہم سب کے لیے خوشیوں اور بہتری کا سال بنا دے ''آمین'' محترم مدیر صاحب دسمبر میں ہی جنوری 2014 کا ''سچی کہانیاں'' کا پرچہ مل گیا۔ بہت زیادہ خوشی ہوئی، سرورق کافی اچھا ہے، منزہ سہام صاحب کا اداریہ بھی خوب رہا، خطوط میں سب سے تعارف حاصل ہوا۔ تو بہت ہی اچھا لگا پرچے کا بدلا ہوا نیا انداز بھی بہت اچھا لگا۔ نئے سلسلے بھی خوب رہے، سب سے زیادہ خوشی اپنی دوست فریدہ خانم کی کہانی دیکھ کر ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کے قلم کو مزید رواں کرے ''آمین'' اور فریدہ خانم کی کہانی واقعی اچھی تحریر تھی، اس کے علاوہ گڈی آپا، ایڈیسن اور لیس مسیح، الماس روحی، شروِن کمار ورما، بشیر احمد بھٹی کی تحریریں اچھی رہیں، اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی خوب ہیں اور میری طرف سے سب دوستو، ساتھیو کو نیا سال بہت مبارک ہو''آمین'' کاشی بھائی میں پہلے بھی ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' میں لکھتی رہی ہوں، پھر اپنی پڑھائی کی مصروفیات کی وجہ سے کچھ عرصہ لکھنے لکھانے سے دور رہی، اب دوبارہ یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ محترم مدیر صاحب میں ''سچی کہانیاں'' میں اپنی اِک کہانی ارسال کر رہی ہوں، آپ پڑھیں گے تو اُمید کرتی ہوں آپ کو اچھی لگے گی اور آپ اس کو جلد جگہ دیں گے۔ کہانی کا مرکزی خیال سچائی پر مبنی ہے، باقی منظر نامہ کچھ کچھ میرا تخلیق کردہ ہے اور کچھ جیسا بیان کیا گیا ویسا لکھتے ہوئے میں نے مدنظر رکھا۔ آپ اسے پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار ضرور کیجیے گا اور اس کو شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں، اب اجازت! اللہ حافظ

☆ پیاری بہن عطیہ! جگ جگ جیو، یہ پرچا آپ سب کا ہے، آپ کی وجہ سے ہی یہ پھلواری ہے، انشاء اللہ کہانی بھی جلد شائع ہوگی، احوال میں آمد مستقل بنائیں اور تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئیں، مجھے انتظار رہے گا۔

☒ یہ آمد ہے ہمارے، بہت پیارے لکھاری لڈن ضلع وہاڑی سے منشی محمد عزیز مے صاحب کی۔ ماہ عزیز جی نے سچی کہانیاں میں باقاعدہ شرکت کو یقینی بنا کر ہمارا مان بڑھا دیا ہے لکھتے ہیں پیارے کاشی چوہان جی السلام علیکم! نہ جانے کتنے عرصے بعد گزشتہ ماہ خط بھیجا تھا جو کہ دسمبر 2013 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اب تازہ شمارے کی طرف آتے ہیں۔ 27 دسمبر کو حاصل پور فون کیا تو جواب نفی میں ملا۔ دل کو بے چینی سی رہی، 28 دسمبر کو ایک دوست حاصل پور گیا تو اس کے ہاتھ سچی کہانیاں منگوایا۔ وہ سچی کہانیاں کے ساتھ میری محبت کے متعلق سب کچھ جانتا ہے لہٰذا اس نے یہ شرط عائد کردی کہ مٹھائی کھلاؤ گے، تب سچی کہانیاں لاؤں گا۔ میں ٹھہرا ملازمت پیشہ انسان اور آپ شاید ملازمت پیشہ افراد کی مجبوریوں سے واقف تو ہوں گے ہی کہ صبح سے شام تک ملازمت

میں مصروف رہتے ہیں۔ سو اس دوست کی بات پر آمین کہا اور یوں 28 دسمبر کی شام کو سچی کہانیاں سے روبرو ملاقات ہوئی۔ اس دور کے احوالی ساتھ بھی دوست کہاں غائب ہیں، پلیز ساتھیو! آ جاؤ لوٹ کے کہ یہ دل بے قرار بہت ہے۔ آپ کو ایک خوش خبری بھی سنانا ہے کہ الحمد اللہ میں چھ عدد بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے کا باپ بن چکا ہوں اور اب ماشاء اللہ میرا بیٹا محمد مدثر عزیز مئے پانچویں سال میں ہے۔

سوری کاشی جی! دراصل آج آن دی ڈیوٹی سچی کہانیاں پڑھنے کا موقع مل گیا اور شام تک جو کچھ پڑھ سکا ہوں، اب اس پر تبصرہ سب سے پہلے تو آپ سب کو بھی نئے سال کی مبارکباد قبول ہو۔ اللہ کرے کہ 2014ء کا سال ہم سب کے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا سال ثابت ہو اور سبھی کو اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے (آمین) ہم سب کو نیا سال آنے پر اپنا اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ سرورق والی محترمہ نے سو میں سے ستر نمبر حاصل کیے۔ اشتہارات بہت ہی زبردست تھے۔ کہانیوں کی فہرست کا انداز بھی زبردست تھا۔ منزہ آپی کا اداریہ ''کاش'' کے بارے میں کیا کہوں، کاش یہ بات ہمارے حکمرانوں کو سمجھ میں آ جائے۔ بل گیٹس پڑھ کر اس غیر مسلم پر بہت فخر محسوس ہوا۔ کاش کہ ہمارے ملک کے ارب پتی، کروڑ پتی لوگ اس سے تھوڑا سا بھی سبق حاصل کر لیں، ''عذابِ رفتگاں'' ڈاکٹر صغیر احمد کی اس کہانی نے مجھے تو رُلا دیا۔ سچ میں، واقعی سچا پیار اسے کہتے ہیں۔ اللہ نازیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور اس کو صبر عطا فرمائے (آمین) ''فرشتہ یا شیطان'' ایس امتیاز احمد کی یہ تحریر نام نہاد ملاؤں اور مولویوں کے منہ پر طمانچہ تھی۔ ''یہ بے حسی'' بشیر احمد بھٹی کی یہ تحریر پڑھ کر سر شرم سے جھک گیا۔ واقعی ہم لوگ کتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ خود تو نعوذ باللہ (اخبارات میں چھپا) اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا اسمِ گرامی پیروں تلے روندتے پھرتے ہیں اور یہودیوں اور غیر مسلموں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کا احترام کریں۔ ''بیٹیاں پھول ہیں'' فریدہ خانم کی یہ تحریر بیٹیوں کے مسائل پر مبنی تھی، میں چھ بیٹیوں کا باپ ہوں اور الحمد اللہ کہ میری بیٹیاں مجھے اپنے اکلوتے بیٹے سے بھی زیادہ پیاری لگتی ہیں۔ ''عشق عشق'' پڑھ کر بے اختیار حضور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام کا نذرانہ پیش کرنے لگا کہ شاید مجھے بھی ایسا ہی عشق نصیب ہو جائے۔ گڈی آپا کی تحریر ''ہاف سٹ'' پڑھ کر دل بہت افسردہ ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس کو مجرم ٹھہرائیں، واصف کو یا اُن لوگوں کو جن کی طنزیہ اور تلخ جملوں نے واصف کو اپنوں سے دور کر دیا، اشفاق بٹ کی ''پیاس'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی۔ واقعی ماں کے دودھ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں کو اکٹھے کر دیا ہے اور اس سے محروم رہنا بہت بڑی محرومی ہے۔ بدیسی کہانیوں میں دستِ ابلیس زبردست رہی۔ ''سرخ گلاب'' طاہر اقبال کی یہ کہانی ایک بے کس ومجبور نوجوان کی داستان تھی۔ واقعی صرف عورتیں ہی مجبور نہیں ہوتیں، بلکہ بہت سے رازی بھی مجبور ہوتے ہیں، کاغذ کی کمی ہے کاشی میاں ورنہ کہانیاں تو ابھی باقی ہیں۔

نوٹ: یہ بات یاد رکھیے گا کہ کم وبیش دس گیارہ سال بعد حاضر ہو رہا ہوں۔ (گزشتہ خط کو چھوڑ کر اس کو گنتی میں نہ لاتا)

☆ لیجیے بھیا عزیز مئے، ہم نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ مگر بھیا جی یہ کیا......؟ کوئی تحریر تو لاتے، باقی اللہ آپ سے بہت خوش ہے۔ جس نے چھ پریاں آپ کو دے دیں، اور ایک شہزادہ۔ خدا سب کی عمر دراز کرے (آمین) اب یہ دوبارہ جو سلسلہ آپ نے جوڑا ہے یہ ٹوٹنے نہ پائے۔ آپ کے دونوں خط شاملِ احوال ہیں۔ اب تو خوش ہیں نا آپ۔

☒ یہ آمد ہے سرگودھا سے عظمیٰ شکور صاحبہ کی، لکھتی ہیں ایڈیٹر صاحب اُف ! زبردست قسم کی حیرت، ایسی باتیں کم ہی ہوا کرتی ہیں مطلب ایسے واقعات۔ میں نے کل ہی آپ کی تحریر پڑھی اور آج بات ہوگئی۔ واقعی حیرت ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے کہ میں بولتی زیادہ ہوں اور اسی اسپیڈ سے لکھتی بھی زیادہ ہوں، چاہے کوئی تحریر ہو، چاہے کوئی خط، لفظ جیسے پین کی زبان سے نکل نکل کر صفحے پر پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب تک لکھ نہ لوں بے سکونی رہتی ہے۔ بس زندگی میں دُکھوں سے اگر بچنا ہے تو لکھتے ہی چلے جاؤ اور میں یہی کر رہی ہوں۔ اتنا اچھا لکھنے کا بے حد شکریہ۔ سوسوری میری رائٹنگ ناقابلِ برداشت حد تک خراب ہے مگر صبر کرنا پڑے گا چارہ جو کوئی نہیں۔ سچی بہترین رسالہ ہے۔ کیا بات ہے کہانیوں کی، یہ الگ بات ہے کہ میں نے اب تک آپ ہی کی تحریر پڑھی ہے۔ باقی رسالہ ٹھیک ہے، اچھا ہے، بس ایک بات ! کچھ ایسا سلسلہ شروع کریں کہ قارئین، لکھنے والے اپنے چھوٹی چھوٹی تحریریں اُس سلسلے میں بھیج سکیں۔ اللہ حافظ اپنا اور رسالے کا خیال رکھیے گا خاص کر اُن قارئین کا جو آپ کو پسند کرتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں اور شاید آپ کی تحریروں کی تلاش میں بھی ہیں کہ سب پڑھ لیا جائے۔

☆ عظمیٰ جی ! خدا آپ کو اور زیادہ لکھنے کی توفیق دے، اپنا خیال رکھیے گا اور ہاں اگلے ماہ رسالے پر آپ نے بھرپور تبصرہ بھی کرنا ہے۔

☒ یہ شرکت ہے احوال میں مومنہ بتول کی کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ عرض حال یہ ہے کہ میں ماہ نامہ سچی کہانیاں کی پرانی قاری ہوں، شادی سے پہلے لکھنے لکھانے کا سلسلہ تھا جو کہ مختصر رہا، اب کئی برس بعد قلم اُٹھایا ہے جس کا سہرا چھوٹے سے ''سچے واقعے'' کے سر ہے جو چند ماہ پیشتر خود میرے ساتھ پیش آیا۔ مزید یہ کہ میں ماہ نامہ ''سچی کہانیاں'' کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں براہِ کرم طریقہ کار بتا دیں آپ کی توجہ کی منتظر۔

☆ مومنہ جی ! خوش آمدید آپ آیئے، جم جم آیئے یہ پرچہ تو آپ کا اپنا ہے، تحریر جلد شائع ہوگی۔ باقی سالانہ خریداری کے لیے 720 روپے کا منی آرڈر اپنے مکمل ایڈریس کے ساتھ سچی کہانیاں، سالانہ خریدار لکھ کر روانہ کردیں۔ پرچہ آپ کے گھر پہنچ جایا کرے گا۔

☒ یہ ہیں ہمارے ساتھ حیدرآباد سے ادیب سمیع چمن صاحب۔ لکھتے ہیں، محترم مینجنگ ایڈیٹر منزہ سہام صاحبہ...... السلام علیکم ! دعا ہے خدا آپ کو، آپ کے تمام اہلِ خانہ، عزیزان بالخصوص تمام جملہ مجلس احباب کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ اور ہر دُکھ ہر بیماری تفکرات سے محفوظ رہیں۔ آمین ثم آمین، آپ کی محفل میں پہلی بار باریابی کی اجازت کی خواہش کے ساتھ حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ چلیے پہلے کچھ مختصر سا تعارف کرادوں۔ نوعمری کے زمانہ بھٹو دورِ حکومت سے بچوں کے لیے لکھتا آرہا ہوں فکرِ معاش اور گھریلو ذمہ داریوں کے بوجھ کی وجہ سے بیچ میں سالہا سال لکھنے سے محروم رہا بچپن ہی سے اپنی مدد آپ کے تحت اخبارات ورسائل کے روزگار سے منسلک رہا ہوں، پھر حالات نے پلٹا کھایا، انٹرنیٹ موبائل اور دیگر نت نئی ایجادات کی وجہ سے نئی نسل نے مطالعہ سے ناتا ختم کردیا۔ باقی تو سب آپ کے پیشِ نظر ہے۔

☆ پیارے ادیب سمیع صاحب ! علم سے آپ کی دوستی مثالی ہے، ہم اس کی قدر کرتے ہیں آپ نے لکھا الیکٹرانک میڈیا کے آنے سے پرنٹ میڈیا ختم ہوگیا...... یہ بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ نئی ٹیکنالوجی کے آنے سے پرانی پر اثر ضرور پڑتا ہے، مگر کچھ دن بعد حالات پھر سے سازگار ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سچی کہانیاں اور

اس کے ہم عصر ڈائجسٹ کب کے بند ہو چکے ہوتے۔ مختصراً یہ کہنا ہے کہ اپنے کام سے ایمانداری اور لگن ہر نئے اور پرانے خطرات کا مقابلہ کر لیتی ہے۔ آپ کی تحریر کا انتظار رہے گا۔

✉ احوال میں دوبارہ شرکت ہے ڈاکٹر صغیر احمد عاجز کی جہلم بڑا گواہ سے۔ لکھتے ہیں، السلام علیکم! امید واثق ہے کہ آپ بمعہ اسٹاف بفضلِ خدا بخیریت ہوں گے۔ عذاب رفتگاں کو جنوری کے شمارے کی زینت بنانے پر دلی شکریہ قبول کیجیے اور ساتھ ہی اپنے سابقہ نامے میں گلے شکوے پر معذرت خواہ بھی ہوں پر چار سال کرنے کا بھی بہت مشکور ہوں۔ دعا گو ہوں کہ نیا سال اہلِ پاکستان کے لیے مبارک ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یونہی سچ لکھنے اور سچ کی تشہیر کرنے کی جراَتِ دوام بخشے اور ثابت قدم رکھے۔ محترم (پیشگی معذرت کے ساتھ) لکھاری بہن بھائیوں کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ معاشرے میں موجود ناانصافیوں اور ناہمواریوں کی نشاندہی کرتے وقت اخلاقی اقدار کو ملحوظ رکھا کریں۔ اجتماعی طور پر تحاریر بہت اچھی تھیں۔ آگہی کا عذاب بہترین کاوش ہے۔ عشق عشق اور ڈیرے والی ڈاکٹر صاحب کی بہت اچھی کہانی ہے۔ خدا تمام کارکنان کو خوش و خرم رکھے۔

☆ لیجیے ڈاکٹر صاحب آپ کا نیا تبصرہ بھی احوال کی زینت بنا دیا اور غزل بھی جلد شائع ہو جائے گی۔ امید ہے اب اگلے ماہ مکمل تبصرے کے ساتھ ملاقات ہوگی۔

✉ یہ آمد ہے سدرہ انور علی کی جھنگ صدر سے۔ لکھتی ہیں، محترم بھیا کاشی چوہان السلام علیکم نئے سال کا سچی کہانیاں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ بہت پسند آیا۔ آپ کے آنے سے سچی کہانیاں کو نئی زندگی ملی۔ جنوری کا سچی کہانیاں بہت لیٹ ملا 3 تاریخ کو۔ احوال میں خطوط کی تعداد بہت کم تھی۔ تمام لوگوں کے خطوط پسند آئے۔ آنٹی منزہ سہام کا اداریہ پڑھ کر بے ساختہ منہ سے آمین نکلا۔ کاش ان کا کاش سچ ہو جائے۔ مور شاہد بھیا میں نے دونوں شاہدوں کو مخاطب کیا تھا۔ کچھ پرانے ساتھیوں کی آمد بہت اچھی لگی۔ نمایاں شخصیات میں احمد سجاد بابر 'بل گیٹس' کو لے کر آئے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ نمایاں شخصیات کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا ہے، بہت اچھی بات ہے۔ عذاب رفتگاں ڈاکٹر صغیر احمد کی تحریر بہت لاجواب تھی۔ فرشتہ یا انسان ایس امتیاز احمد کی لعنت ہو ایسے انسانوں پر جو نبی کی سنت چہرے پر رکھ کر شیطان جیسے کام کرتے ہیں۔ آصف ضیاء احمد کی جھولا، بہت عبرت انگیز تحریر ہے۔ بشیر احمد بھٹی کی بے حسی' آج کل کے لوگوں نے اپنا ایمان بھی شاید گروی رکھ چھوڑا ہے۔ جس کا ایمان کامل نہیں وہ مسلمان بھی نہیں ہے۔ فریدہ خانم کی تحریر بیٹیاں پھول ہیں' فریدہ خانم کی تحریر دل کو چھو گئی ویلڈن، عشق عشق مہر پرویز احمد کی تحریر پڑھ کر ایمان تازہ دل منور ہو گیا۔ رسول اللہ سے عشق ہی دنیا اور آخرت ہے۔ ہاف سٹ 'گڈی آپا کی تحریر پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ اُف اشفاق بٹ کی پیاس پسند آئی۔ اللہ انہیں اور اچھا لکھنے کی توفیق دے۔ کوشہ کیر رشا نوری کی تحریر من کو بھا گئی قسم سے ترکی کے ڈراموں کی طرح ترکی سے آئی ہوئی تحریر بھی دل کو خوش کر گئی۔ جس طرح ترکی کے ڈرامے میرا سلطان، انتقام، آسی، جیسے لاجواب ہیں۔ ویلڈن۔ سرحد پار سے آئی ہوئی عصمت چغتائی کی تحریر امر بیل نے متاثر کیا۔ اب بات ہو جائے ناگن کی۔ اعجاز نواب کی ناگن بہت لاجواب تحریر ہے۔ کالک، ایڈیسن ادریس کی۔ میں بے گناہ ہوں الماس روحی کی، آگہی کا عذاب نصرت سرفراز، چراغ بالی محمد اسد علی بھٹی کی تحریریں بہت پسند آئیں۔ تین مرد تین کہانیاں کا سلسلہ لاجواب جا رہا ہے۔ ارشد علی ارشد کی ملھنی کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ سخن آباد میں تمام

دوستوں کی شاعری پسند آئی تمام پڑھنے والوں کو سلام۔ سانسوں نے کی وفا تو پھر ہوگی ملاقات تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ جی! آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ اُمید ہے اگلے ماہ بھی ہمارا مان برقرار رہے گا۔

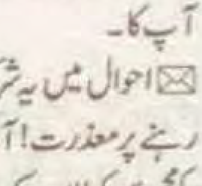
⊠ یہ آمد ہے کنول عمران خان صاحبہ کی کراچی سے۔ لکھتی ہیں السلام علیکم! کاشی بھائی! کیسے ہیں آپ۔ پہلے تو آپ کو مدیر بننے پر بہت بہت مبارک قبول ہو۔ رسالے میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے رسالہ ہمیں ہر ماہ کی **22** تاریخ کو مل جاتا تھا۔ ہر کہانی پر انعام ہوتا تھا اور وقت پر ہماری کہانیاں شائع ہو جاتی تھیں مگر اب سب اس کے برعکس ہے۔ اس بار میں نے سوچا کہ دل کی بھڑاس نکال ہی دوں۔ ہاہاہا! کاشی بھائی ناراض نہ ہوئیے گا مگر جو میں نے محسوس کیا بیان کر دیا۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف سب سے نمبر ون کہانی تو ”ناگن“ ہے۔ بل گیٹس کے بارے میں پڑھ کر مزہ آ گیا۔ سچ ہے ”ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا“ عذاب رفتگاں بس ٹھیک ہی تھی، کچھ خاص نہ تھی۔ فرشتہ یا انسان بہت خوب تھی۔ ”جھولا“ بھی بس ٹھیک تھی۔ بیٹیاں پھول ہیں، اچھی تھی مگر زیادہ چھوٹ دینے سے لڑکیاں بگڑ بھی سکتی ہیں۔ اس بارے میں کیا خیال ہے؟ غرقاب اچھی تھی۔ نائلہ اگر اپنے شوہر سے فون پر رابطہ رکھتی اور اُسے ویزے کا بتا دیتی تو طلاق تک نوبت نہ آتی۔ اعزاز دگر بس ٹھیک ہی تھی۔ گوشہ گیر بہت اچھی تھی۔ امر بیل تو سمجھ میں نہ آنے والی ایک بے ربط کہانی تھی۔ اونٹ کی کل ٹھیک تھی۔ فی الحال اتنا ہی پڑھ سکی۔ پتا نہیں یہ خط شائع بھی ہوگا کہ نہیں۔ چلیں اب اجازت دیں تمام اسٹاف کو خلوص بھرا سلام۔ خدا حافظ

☆ بہت پیاری بہن کنول! خوش آمدید۔ آپ کو امر بیل پسند نہیں آئی؟ بس اب کیا کہوں...... تبصرہ اچھا لگا آپ کا۔

⊠ احوال میں یہ شرکت ہے نازیہ بتول رضا کی، کراچی سے۔ لکھتی ہیں سب سے پہلے تو اتنے مہینے غیر حاضر رہنے پر معذرت! آپ سب کی خیریت ”سچی کہانیاں“ سے پتا چلتی رہتی ہے۔ جس جس نے میری غیر حاضری کو محسوس کیا ان کے لیے اطلاع ہے کہ ہمارا نیا گھر زیر تعمیر تھا اور ہم **Rent** پر تھے۔ الحمد اللہ گزشتہ ماہ ہم اپنے گھر میں شفٹ ہو چکے ہیں مبارکباد دے رہے ہیں؟ اچھا اچھا خیر مبارک! اس ماہ تبصرے سے معذرت کیونکہ مصروفیت کی بنا پر ہم رسالہ نہیں پڑھ سکے ہیں اور ہاں دیر سے آنے کا جرمانہ بھی ساتھ لائے ہیں کہانی کی صورت۔ اب دیکھیے کب اشاعت کا شرف ملتا ہے۔ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں اور سلام۔

☆ نازیہ آپ کو گھر کی مبارک باد قبول ہو، مگر منہ تو میٹھا کرا دیتیں۔ آج کے دور میں گھر بنانا گویا ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے جیسا ہے۔ انشاء اللہ کہانی بھی جلد شائع ہو جائے گی۔

⊠ یہ آمد ہے کراچی سے نفیسہ مغل صاحبہ کی۔ لکھتی ہیں جناب ایڈیٹر صاحب، اُمید ہے اللہ پاک کے فضل و کرم



سے بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں حسب وعدہ اپنی تین کہانیاں ارسال کر رہی ہوں۔ ایک کہانی سوکن۔ پراسرار نمبر کے لیے ہے باقی دو کہانیاں کھو جانے والی کہانیوں کی فوٹو کاپی ہیں۔ امید ہے جلد ہی سچی کہانیاں کی زینت بنا کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ میں **1994** سے سچی کہانیاں کی قاری اور **99** سے لکھاری ہی۔ بہت سی کہانیاں دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں جلوہ افروز ہوئیں۔ مجھے حوصلہ دینے میں مرحوم سہام مرزا صاحب کا بہت ہاتھ ہے۔ میری طرف سے منزہ

بیٹی کو دعائیں، بھابی رخسانہ کی خدمت میں سلام، آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں۔

☆نفیسہ آنٹی! آپ نے وعدہ پورا کیا تو ہم بھی جلد آپ کی کہانی شائع کر کے اپنا وعدہ پورا کر دیں گے۔ اب آپ ایک وعدہ اور کریں کہ اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ وعدہ!

✉اسلام آباد سے یہ آمد ہے نصرت سرفراز صاحبہ کی۔ لکھتی ہیں، مدیر اعلیٰ کاشی چوہان صاحب، اسلام علیکم! دسمبر 2013ء کا آخری دن تھا پوری دنیا نئے سال کی آمد کی خوشیاں منانے کی تیاریوں میں لگی تھی۔ دل عجیب اُداس سا تھا۔ اسلام آباد کی سرد شامیں اور سرد ترین طویل راتیں مارگلہ کے دامن سے متصل شہر اقتدار کی صاف شفاف طویل سڑکوں سے گزرتے اچانک سچی کہانیاں کا خیال آیا کہ یقیناً رسالہ آ گیا ہوگا۔ ایک بک اسٹال پر گاڑی روکی، واقعی رسالہ آ چکا تھا۔ وہیں کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے فہرست پر نظر ڈالی صفحہ نمبر 178 آگہی کا عذاب اپنی تحریر دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی جس کو بیان کرنے والے الفاظ ابھی تک کسی لکھاری نے صفحہ قرطاس پر نہیں بکھیرے۔ ان جذبات کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے نے کہانی لکھنے، بھیجنے اور شائع ہونے تک انتظار کے مراحل عبور کیے ہوں۔ کئی مہینوں کی غیر حاضری کے بعد اس بار سوچا مدیر صاحب کے مشورے کے عین مطابق 5 تاریخ سے پہلے پہلے ہی شامل احوال ہو جاؤں، ورنہ ساری محنت اکارت ہو جائے گی سب سے پہلے کاشی چوہان صاحب کو سچی کہانیاں کا مدیر بننے پر بہت بہت مبارکباد۔ دسمبر کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر قائداعظم کے زریں اصول کام، کام اور صرف کام والے مقولے پر یقین مزید پختہ ہو گیا۔ منزہ سہام کے قلم سے کاش! واقعی کاش اس بار ایسا ہو کہ میرے پاک سرزمین پر بھی نہ مرجھانے والے پھول کھلیں۔



خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

ماہ جنوری کے کچھ اپنی باتیں کی بات کی جائے..... تو تمام منظر دھواں دھواں ہو جاتے ہیں۔ من کے اندر بھی دھواں من کے باہر بھی دھواں۔ خواب اور تعبیر بھی دھواں دھواں۔ پھول، خوشبو، بادل، بارش اور زندگی سب دھواں۔ مگر اس دھوئیں کا سفر رائیگاں نہ تھا۔ اس دھوئیں کے سفر کا حاصل شہد ہے میٹھا رسیلا شہد کاشی چوہان کے قلم سے دھوئیں سے شہد تک کے سفر نے یہ بات ثابت کر دی کہ کہانی کار شہد کی مکھی کی طرح معاشرے کے کڑوے سچ کو ایک دلچسپ نصیحت آموز کہانی کی صورت میں صفحوں پر منتقل کر دیتا ہے۔ احوال کے آغاز نے شہر کراچی کی یاد تازہ کر دی۔ بات مختصر ہو اور احوال میں شمولیت بھی ہو اور 5 تاریخ تک بھی ہو۔ کس قدر مشکل ٹاسک ہے۔ جناب مدیر صاحب سے گزارش ہے کہ اس پانچ تاریخ کو کم از کم دس تک تو ضرور لے جائیں تا کہ زیادہ سے زیادہ خطوط شاملِ احوال ہو سکیں۔ قمر سے مور شاہد حسین کا آداب سلام اور دُعاؤں کا بہت شکریہ۔ نمایاں شخصیات واقعات میں بل گیٹس کا معلوماتی مضمون شروع سے آخر تک دلچسپ تھا۔ عذاب رفتگاں ڈاکٹر صغیر احمد نے اس پر آشوب دور میں محبت کی روانی کا احساس دلایا فرشتہ یا شیطان میں ایس امتیاز احمد نے شہر کراچی سے ایک ایسا سچ قلم بند کیا جو کم کم ہی وقوع پذیر ہوا کرتا ہے۔ احوال میں شامل ہونے کی جلدی اس قدر تھی کہ رسالہ پورا ابھی نہ پڑھ پائے تھے کہ سوچا نہ بھیجنے سے بہتر ہے جو لکھا ہے وہ تو شاملِ احوال ہو جائے انشاءاللہ اگلی بار پورے رسالے پر بھرپور تبصرہ ارسال کروں گی میری تحریر کی اشاعت کے لیے مدیر کاشی چوہان مدیر اعلیٰ منزہ

سانحہ ارتحال

ہماری دوست لکھاری نسیم سکینہ صدف کی ساس صاحبہ گزشتہ ماہ رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئیں، ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کے حق میں دعائے خیر کریں اور ایک مرتبہ الحمد شریف ضرور پڑھ لیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

سہام کی دل سے مشکور ہوں۔ دو اور نگارشات ارسال کر چکی ہوں، وہ موصول ہوئیں یا نہیں براہ کرم مطلع فرمایئے گا۔ سچی کہانیاں کے تمام لکھاریوں اور قارئین کو سال نو کی بہت بہت مبارکباد۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے ملک کو اور اس کے تمام باشندوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

☆ نصرت جی! انشاء اللہ کی تحریر بھی جلد ہی شائع ہو کر خوشی عطا کرتی رہیں گی۔ بس محفل میں آمد آپ نے

مستقل بنانا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

☒ یہ آمد ہے **گل باز خان** کی بنوں سے۔ لکھتے ہیں بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ماہِ جنوری کا سچی کہانیاں اپنی مثال آپ تھا۔ ٹائٹل گرل خوبصورت تھی۔ نیا سلسلہ تین مرد تین کہانیاں سچی کہانیاں کی جان ہے۔ اس کے علاوہ کارجہاں دراز ہے میں پیش کی جانے والی کہانی بھی بہت جان دار ہوتی ہے۔ نیا سلسلہ پلیٹ فارم بہت پسند آیا۔ سخن آباد میں اعلیٰ پائے کی شاعری پڑھنے کو ملتی ہے اور خصوصی کہانی کی تو کیا ہی بات ہے۔ وصیت نامہ بہت پسند آئی۔ سات سمندر پار سے جو کہانیاں شاملِ اشاعت ہوتی ہیں اُن کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ ہم ادب کی دنیا میں کتنا پیچھے ہیں۔ سرحد پار کی کہانیاں ...... کیا بات ہے۔ زبردست۔ امربیل پڑھتے پڑھتے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اونٹ کی رکل نے بھی کمال کیا۔ کاشی بھائی اللہ آپ کو ہمت دے۔ یہ کہانیاں شائع کر کے آپ ہم نئے لکھنے والوں کے لیے ایک نرسری کا کام کر رہے ہیں۔ یہ اعلیٰ پائے کی کہانیاں پڑھ کر ہمیں لکھنا آنے لگا ہے۔ خدا کے لیے یہ سلسلہ مسلسل جاری رکھیے گا۔ باقی سچ بیانیاں ہمارے ملک کی ہمارے شہروں کی خوشبو لیے ہوئے بہت گہرا اثر چھوڑ رہی ہیں۔ بائیوگرافی کا سلسلہ بھی کمال ہے۔ اس میں اسی طرح انٹرنیشنل سطح کے لوگ شائع کیجیے۔ ان کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں اور ہمارے اندر بھی کچھ کر دکھانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ احمد سجاد بابر آپ کے قلم کو سلام ہے۔ احوال میں سب کی شرکت اسے پُررونق بنائے رکھتی ہے اور ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ انشاء اللہ مجھے امید ہے کہ فروری کا شمارہ بھی اپنی مثال آپ ہی ہوگا۔

☆ گل باز خان! خوش رہو۔ یقین مانو محسوس ہی نا ہوا کہ تم نے پہلی بار احوال میں شرکت کی ہے۔ یار تم تو بنے بنائے رائٹر ہو تو پھر کب ہمیں اپنی تحریر بھیج رہے ہو۔ تمہارا تبصرہ واقعی شاندار رہا۔ ہمیں اگلے ماہ تمہارے تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☒ یہ مختصر حاضری ہے لاہور سے ایم سعید انور سعید صاحب کی۔ لکھتے ہیں ڈیئر کاشی چوہان، السلام علیکم! اس دفعہ آپ کا پرچہ سچی کہانیاں واقعی بہت اچھا تھا۔ یہ آپ کی محنت کا ثبوت ہے اور آپ نے واقعی ایک معیاری پرچہ ترتیب دیا۔ پرچے کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ اگلے مہینے میرے بھتیجے یاسر مشتاق کی شادی ہے۔ اُس کو مبارک باد اور دعائیں دیں۔ اللہ اُس کی ہر خوشی پوری کرے (آمین) اور تمام اسٹاف کو سلام۔

☆ پیارے بھائی ایم انور سعید آپ کی آمد سر آنکھوں پر۔ مگر یہ کیا...... تبصرہ کیا ہوا۔ امید ہے اگلے ماہ آپ بھرپور تبصرے کے ساتھ احوال میں شریک ہوں گے۔ ہماری طرف سے یاسر مشتاق کو شادی کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔

☒ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے نور خان کی آزاد کشمیر سے۔ لکھتے ہیں السلام علیکم! اس سے پہلے میں سچی کہانیاں کو صرف پڑھتا تھا۔ لیکن احوال میں شرکت کرنے سے تھوڑا ہچکچاتا تھا۔ نئے مدیر صاحب کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں میرے دل میں اس طرح گھر کر گئیں کہ میں قلم اٹھائے بغیر نہ رہ سکا۔ کاشی بھائی آپ کی آمد نے سچی کہانیاں کو ایک ایسا ہر دل عزیز پرچہ بنا دیا ہے کہ جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سچی کہانیاں اتنا جامع اور معیاری بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ نے بالکل اپنے قول کی

طرح اپنے فعل سے ثابت کردیا کہ انسان کوشش کرے تو ہر مشکل کام آسان کرسکتا ہے اور آپ نے واقعی سچی کہانیاں کے ٹرینڈ کو بالکل چینج کردیا ہے۔ جیو کاشی بھائی جیو۔ انشاء اللہ میں آپ کے احوال میں اب ہر ماہ پابندی سے شرکت کرتا رہوں گا۔ آپ مجھے بھی یقیناً خوش آمدید کہیں گے۔ باقی احوال انشاء اللہ اگلے ماہ۔

☆ پیارے نور! تم احوال میں اب جو حاضر ہوئے ہو تو وعدہ کرو ہر ماہ اپنی محبت کے پھولوں کی خوشبو سے احوال کو معطر کرتے رہو گے۔ خوش آمدید! خوش آمدید! خوش آمدید۔ اب تو خوش ہونا۔ ہمارے لیے ہمارا قاری اور ہم سے محبت کرنے والا سب سے اہم ہے۔

✉ یہ آمد ہے عظیم الدین انصاری کی قلات سے۔ لکھتے ہیں محترم کاشی بھائی السلام علیکم! ماہ نومبر میں میری کہانی شائع کرکے آپ نے ثابت کردیا کہ آپ کسی کی تحریر کو ضائع نہیں کرتے۔ کچھ مجبوریوں کے تحت یقیناً تحریریں شائع کرنے میں کوئی تاخیر ہوجاتی ہوگی۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے مرتبے میں اضافہ کرے۔



☆ پیارے عظیم! تم نے ہماری مجبوریوں کو سمجھا خوش رہو۔ یقیناً اگلے ماہ تم بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوکر ہمارا مان بڑھاؤ گے۔

میرے پیارو، سجنو، مترو، بھائیو، بہنوں...... اس ماہ جو خطوط آئے آپ کے گوش گزار کردیے۔ اگلے ماہ انشاء اللہ ان ہی صفحات پر پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ ساتھیو! خوش رہو اور محبتیں بانٹتے رہو۔ فروری کا شمارہ کیسا لگا؟؟ آپ کی رائے، تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ امید ہے آپ اپنے تبصرے ہمیں اس طرح ارسال کریں گے کہ پانچ تاریخ سے پہلے ہمیں موصول ہوجائیں۔

اور ہاں ساتھیو! اپنے تبصروں اور نگارشات کے ساتھ اپنی ایک عدد پاسپورٹ سائز تصویر ضرور ارسال کریں۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کرکے معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کرسکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ڈاک سے بھیجنے کے لیے: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوشبو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

برسات

جویریہ سلیم

راولپنڈی سے ایک عبرت خیز کہانی

یہ اُس وقت کی بات ہے، جب متحدہ ہندوستان پر انگریز حکمرانی کر رہے تھے۔ جابر خان ایک گاؤں کا رہنے والا معمولی پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس کے باوجود وہ نہایت ہی ذہین اور شاطر قسم کا انسان تھا۔ اس نے وقت اور حالات کے پیشِ نظر انگریزوں کی نہ صرف غلامی کی، بلکہ وہ ان کا وفادار بن گیا۔ اس نے انگریزوں کے ہر ہر قدم کی حمایت کی۔ اس نمک خواری کے بدلے میں اسے انگریزوں نے کئی ایکڑ زمین اور اس میں شامل پانچ گاؤں بھی اس کے حوالے کر دیے تھے۔ جو اب اس کی ملکیت تھے۔ وہ اب جابر خان نہیں بلکہ سردار جابر خان کہلانے لگا تھا۔ اس علاقے پر اب اس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کے اب بڑے ٹھاٹ باٹھ تھے۔

جب ملک تقسیم ہوا اور ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا، تو سردار جابر کے گاؤں پاکستان میں شامل ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد سردار جابر کے مزاج میں غرور سا آ گیا تھا۔ اب وہ بھی دوسروں سے اندھی فرماں برداری کی توقع رکھنے لگا تھا۔ وہ کسی طرح سے بھی ہندوستانی مہاراجوں سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کے دماغ میں فرماں برداری کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے وضع کردہ سزا کے طریقے...... علاقے کے ہر گھر کی جان، مال، عزت، آبرو پر فرماں روائی...... وہی سیاست...... وہی ظالمانہ چالیں، گویا وہ پانچ گاؤں کا مالک بن کر خدا ہی بن بیٹھا تھا۔

اس کے مزارعوں کی تعداد دوسرے زمینداروں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ اپنے مزارعوں سے کوئی رعایت نہ کرتا تھا۔ اس نے ان سب کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے پانچوں گاؤں میں اس لیے کوئی اسکول نہ بننے دیا تھا کہیں کسی مزارع کا بیٹا تعلیم حاصل کر کے اس کے مقابل نہ آ جائے...... جب کہ خود اس کا بیٹا ایک دُور دراز کے گاؤں کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک سرکاری اسکول تھا، جو اس کے گاؤں سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ سردار جابر خان کے علاقے سے باہر تھا۔

سردار جابر خان کا بیٹا دلیر خان روزانہ بگھی پر سوار ہو کر اسکول جاتا تھا اور پھر وہی بگھی اس کو اسکول سے واپس بھی لاتی تھی۔ سردار جابر کے پانچوں گاؤں میں سے اس کے بیٹے دلیر خان کے علاوہ صرف ایک لڑکا نذیر علی اس اسکول میں پڑھتا تھا۔ نذیر علی ایک مزارع کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ فیصل علی نے سردار جابر کی بڑی منت سماجت کر کے نذیر علی کے لیے اسکول جانے کی اجازت لی تھی۔ نذیر کی ماں اس علاقے کی نہ تھی، بلکہ وہ کسی دوسرے علاقے سے بیاہ کر وہاں آئی تھی۔ وہ پڑھنے لکھنے کی کچھ شدھ بدھ رکھتی تھی۔



اسی وجہ سے نذیر کو پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ وہ ذہین بھی بہت تھا۔ اسی شوق اور ذہانت نے اس کے لیے ترقی کی صورت پیدا کر دی تھی کہ وہ اپنی جماعت کا ذہین ترین طالب علم تھا اور ہر امتحان میں پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ ان دنوں وہ دسویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ دلیر خان اور نذیر دونوں کلاس فیلو تھے، لیکن دلیر خان اتنا لائق نہ تھا۔ وہ ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ وہ ہر سال مشکل سے پاس ہو کر اگلی کلاس میں جاتا تھا۔ ایک ہی گاؤں اور ایک ہی کلاس میں ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی دوستی کا آغاز بھی ہو گیا تھا، مگر اس کے باوجود دلیر خان تو اپنی بگھی میں سوار ہو کر اسکول آتا جاتا، جب کہ نذیر دو طرفہ فاصلہ پیدل طے کرتا تھا۔ فاصلہ تو لمبا تھا، مگر نذیر کو اس کا فائدہ یہ تھا کہ آتے جاتے کتاب اس کے ہاتھ میں ہوتی اور کچھ نہ کچھ پڑھائی کر لیتا۔ جوں جوں وقت گزرا، وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست اور رازدار بھی بن گئے، کیوں کہ نذیر پڑھائی کے سلسلے میں دلیر خان کی مدد کرنے لگا تھا۔ یوں وہ دونوں ایک دوسرے کے مخلص دوست بن گئے، لیکن اتنی گہری دوستی ہونے کے باوجود دلیر خان کو کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ بارش یا چلچلاتی دھوپ میں وہ نذیر کو اپنی بگھی میں سوار ہونے کے لیے کہہ سکے۔ اس لیے کہ اس کے باپ جابر خان کا یہ حکم تھا کہ ایک مزارع کا بیٹا سردار کے بیٹے کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسکول میں کلاس میں وہ سارا دن اکٹھے بیٹھتے ہیں، اکٹھے کھیلتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ جابر خان کے حکم کے بعد یہ ممکن ہی نہ تھا کہ دلیر خان اپنے دوست نذیر کو اسکول کے علاوہ بگھی میں بٹھائے۔ اسے بھی اپنی حویلی میں بلوائے یا خود اس کے گھر اس سے ملنے جائے، گویا ان کی دوستی صرف اسکول کی چار دیواری تک محدود تھی۔ جابر خان کے خوف سے خود وہ دونوں بھی اسکول کے علاوہ کہیں اور ملنے کی کوشش بھی نہ کرتے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے محتاط انداز اختیار کیے ہوئے تھے۔

☆......☆

شانو...... سردار جابر خان کی خاص اور قابلِ اعتماد ملازمہ تھی۔ اسے حویلی کے ہر فرد کا اعتماد حاصل تھا۔ وہ شکل و صورت میں نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ حویلی میں پہلے اس کی ماں کام کرتی تھی۔ اس کے بوڑھی ہو جانے کے بعد شانو حویلی میں کام کرنے لگی تھی۔ نذیر علی...... شانو کو پسند کرتا تھا اور وہ اس کا پیچھا بھی کرتا رہتا تھا۔ اس بات کا علم دلیر خان کو نہ تھا، صرف یہی ایک بات تھی جو نذیر نے دلیر خان کو نہ بتائی تھی...... ورنہ اس کے علاوہ وہ ہر بات میں ایک دوسرے کے مکمل راز دار تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں وہ ایک دوسرے کو بتاتے تھے۔ دلیر خان نے حویلی کے اندر کی ہر بات بھی نذیر کو بتا رکھی تھی...... کیوں کہ وہ عادات و اخلاق میں اپنے باپ کے بالکل ہی اُلٹ تھا۔ اس لیے کہ اس کی تعلیم و تربیت اس کی ماں سلطانہ بیگم نے کی تھی...... اور وہ بھی بڑی ہی احتیاط، لگن اور محبت سے...... کیوں کہ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا دلیر خان ذہنی اعتبار سے صرف اس کا بیٹا ہو۔ اور اس پر باپ کی کسی عادت اور انداز کا عکس بھی نہ پڑے۔ وہ اسے جابر خان سے مختلف بنانا چاہتی تھی۔

سلطانہ بیگم کچھ پڑھی لکھی تھیں۔ نماز، روزہ اور دیگر دینی احکامات کی پابندی عملاً کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نیک فطرت، اعلیٰ کردار، خدا ترس، عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں...... لیکن ان کی بدقسمتی کہ ان کی شادی جابر خان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ان کے گمراہ اور ظالم شوہر نے ان کی زندگی کو کچھ اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ گھر میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی مستحق کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ غریب اور نادار لوگوں کے کام آنا چاہتی تھیں، مگر کسی کے دُکھ درد کو بٹانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان کی نیک فطرت سے دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا، کیوں کہ وہ بے اختیار تھیں۔

جابر خان نے سلطانہ بیگم کی قدر نہ کی تھی۔ دلیر خان کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تھیں، کیوں کہ جابر خان نے اِدھر اُدھر منہ مارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پانچ گاؤں کا مالک جو تھا۔ اسے جو بھی صنفِ نازک پسند آجاتی، اسے وہ دبوچ ڈالتا۔ شوہر کی بے راہروی اور دیدہ دلیری...... اس پر مستزاد...... بعض دفعہ سلطانہ بیگم کا خون کھولنے لگتا اور اس حالت میں جب انہیں شوہر کی کسی نئی گھناؤنی حرکت کا پتا چلتا...... تو وہ رونے دھونے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکتیں۔ اکثر آہوں کے درمیان اُن کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا۔ ”اے میرے خدا! مجھے اس سُہاگ سے رنڈاپا اچھا...... اور ایسے رنڈاپے سے موت اچھی۔“

اب سلطانہ بیگم کا زیادہ تر وقت مُصلّے پر ہی گزرتا تھا۔ نماز کا وقت ہو یا نہ ہو، ان کا سر سجدے میں ہی ہوتا۔ اور وہ

دلیر خان کے لیے یہ ہی دعا مانگتیں کہ وہ باپ پر نہ جائے...... اب جب کہ دلیر خان سولہ سال کا نوجوان ہوگیا تھا...... تو سلطانہ بیگم اس کے اطوار دیکھ کر مطمئن تھیں کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ دلیر خان عادت و اطوار کے لحاظ سے ماں پر ہی گیا تھا۔ باپ کے اطوار کا اس پر شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ماں ہی کی طرح نیک اور پرہیزگار تھا۔ وہ ماں کی بھرپور خدمت کرتا...... مگر اس کا دل اپنی ماں کی بے بسی پر بہت کڑھتا تھا...... چوں کہ وہ اب اچھے برے کی تمیز جان گیا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کا باپ ایک عیاش شخص ہے اور وہ اس کی ماں کو نظر انداز کر رہا ہے، مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا، کیوں کہ باپ کا ادب و احترام بھی اس پر لازم تھا اور یہ بات خود اس کی ماں نے اس کے ذہن میں بٹھائی تھی کہ وہ باپ کا احترام ہر حال میں کرے گا۔

سردار جابر خان ملک کے بعض دوسرے بڑے زمینداروں کی طرح ہی عورتوں کا بڑا رسیا تھا۔ وہ اپنے مزارعوں کی ہر جوان اور خوب صورت بہو، بیٹی پر اپنا حق سمجھتا اور اپنی اس مطلب براری کے لیے اپنے مخصوص طریقے استعمال کرتا...... قیام پاکستان سے قبل ہی اس نے ہمسایہ سکھ ریاست کے مہاراجہ سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس سکھ مہاراجہ نے اپنے اس شوق کو ایک خاص فن کی صورت دے رکھی تھی۔ وہ بڑی ہوشیاری سے کوئی عیار آدمی تلاش کر کے اسے اس خاص کام پر لگاتا اور ان کو نذرانہ بھی ان کی مرضی کا دیتا۔ ایسے آدمی کو "دلال" کہا جاتا۔ ہر دلال کے سپرد ایک مخصوص علاقہ ہوتا۔ اس دلال کی یہ ڈیوٹی اور فرض ہوتا کہ وہ اپنے علاقے میں جوان ہونے والی لڑکیوں کا پتا رکھے اور وہ جب جوان ہوجائیں تو انہیں پھنسا کر مہاراجہ کے پاس لے آئے۔

ہندوستان کی تقسیم سے قبل ہر جگہ مخلوط آبادی تھی، اس لیے مہاراجہ کی زد میں نہ صرف ہندو اور سکھ بلکہ مسلمان لڑکیاں بھی آجاتی تھیں...... مہاراجہ کے ان خاص کارندوں میں سے ایک کارندہ کسی وجہ سے مہاراجہ سے ناراض ہو کر سردار جابر خان کے پاس آ گیا تھا۔ اور وہ معقول معاوضہ پر سردار جابر کے لیے یہ ذلیل کام کرنے لگا تھا۔ اس دلال نے سردار جابر کے دیہاتوں میں سے دو اپنے جیسے ہی کارندے چن کر اپنے ساتھ ملا لیے۔ اب وہ تینوں ان پانچ دیہاتوں میں سردار جابر کے لیے کام کرتے تھے۔ سردار جابر ان کو معقول معاوضہ دیتا تھا، کیوں کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہے تھے...... بلکہ اب تو ان کا دائرہ ان پانچ دیہاتوں سے بھی آگے تک پھیل گیا تھا۔ ان تینوں دلالوں نے آگے اپنی سہولت کے لیے ہر طرف معمولی معاوضے پر اپنی ایک کٹنی مقرر کر رکھی تھی، جو اُن کو اہم معلومات پہنچاتی تھی...... ایسی عورتیں عموماً کمی نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے ان کا لوگوں کے گھروں میں آسانی سے آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ ہر گھرانے کے اندر کی معلومات حاصل کر لیتی تھیں۔

طریقۂ کار یہ تھا کہ علاقے میں جب کوئی خوب صورت لڑکی جوان ہوتی تو کٹنی اس کی اطلاع دلال کو دیتی...... دلال بڑی ہی احتیاط سے لڑکی کے باپ کے ساتھ رابطہ قائم کرتا اور اسے بتاتا کہ اگر سردرد جابر اس پر مہربان ہوجائے تو اسے کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اُدھر کٹنی لڑکی کی ماں سے راہ و رسم پیدا کر کے اس کے سامنے سردار جابر کی مہربانیوں کے گن گاتی...... پھر دلال اور کٹنی جن میں بظاہر کوئی تعلق نہ ہوتا...... اپنے اپنے انداز اور رنگ میں اس کنبے کی کمزوریوں کا خوب استحصال کرتے۔ فاقہ کشی تک پہنچی ہوئی غربت...... احساسِ کمتری...... بے بسی اور جہالت نے تمام مزارعین کو غیر معمولی حد تک سردار جابر کا بے دام غلام بنا رکھا تھا اور کسی کنبے میں یہ یارا نہیں تھا کہ وہ سردار جابر کو ناراض کر سکے...... پھر بھی آبرو آخر آبرو ہوتی ہے۔ عام طور پر لڑکی کا باپ اپنی عزت بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتا...... مگر ماں کی پوزیشن مختلف ہوتی۔ گھر کی تمام غریبی اور مجبوریوں کا دباؤ براہِ راست اس پر ہوتا۔ اس لیے وہ کٹنی کے ذریعے عمل میں لائے ہوئے دباؤ کے سامنے بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتی اور صلح صفائی سے سردار جابر کا کام بن جاتا اور اس کی سیج پر ایک تازہ پھول آ گرتا، جو اس کے بستر پر صرف ایک شب ہی رہتا...... دوسروں کو اس کی خبر ہوتا ایک طرف، لڑکی کے باپ تک کو پتا نہ لگتا کہ اس کی آبرو نیلام ہوگئی ہے۔ اگر کسی لڑکی کے سلسلے میں اس کے والدین ہیر پھیر کرتے تو پھر سردار جابر کی انتقامی کارروائیاں اس بدنصیب کنبے کے زندہ بچ نکلنے کے سب دروازے بند کر دیتیں۔

☆......☆

عورت پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ، وہ اپنے شوہر کی

نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔ اس کی چھٹی حس اسے سب کچھ بتا دیتی ہے۔ سردار جابر خان کی بیوی سلطانہ بیگم ایک اچھے اور عزت دار گھرانے کی نورِ چشم تھی۔ اس کے میکے کا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ وہ چاہتی تو سردار جابر خان سے طلاق لے لیتی۔ یا اسے بدنام کرتی رہتی...... یا حویلی میں ہونے والی ہر نئی واردات پر واویلا مچاتی...... مگر اس نے اندر ہی اندر کڑھنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اس نے اپنی زبان کو قابو میں رکھا اور اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا کہ وہ ہی انصاف کرے گا۔ وہ سردار کے کرتوتوں کو جانتی تھی، مگر وہ ایسا ظاہر کرتی جیسے اسے کچھ پتا ہی نہ ہو، جیسے وہ اندھی، گونگی اور بہری ہو۔ اسی وجہ سے سردار جابر خان کا ڈر اور خوف ختم ہو گیا تھا...... مگر پھر بھی وہ احتیاط سے ہر قدم اٹھاتا تھا۔ سلطانہ بیگم اپنے بیٹے دلیر خان سے ہر قسم کی بات چھپاتی تھی، تاکہ اس پر باپ کے کسی کردار اور کرتوت کا اثر نہ ہو جائے...... لیکن اسے حویلی میں ہونے والی ہر بات کا پتا ہوتا تھا۔ بظاہر سردار جابر خان اور سلطانہ بیگم یہی سمجھتے تھے کہ وہ ابھی بچہ ہے اور اسے کسی بات کا علم اور اثر نہ ہوگا، مگر دلیر خان...... حویلی کی نوکرانی شانو، جہاں جابر خان کی رازدار تھی، وہاں وہ دلیر خان اور سلطانہ بیگم کی بھی وفادار تھی۔ وہ ایک ٹکٹ میں تین شو دیکھ رہی تھی۔

☆......☆

اپنے گاؤں میں سردار جابر خان کی دوستی صرف دو اشخاص سے تھی۔ ان میں ایک تو زمان علی تھا جو اپنے آپ کو حکیم کہلاتا تھا۔ اس کی حکمت خوب چل رہی تھی۔ وہ کشتے وغیرہ بنانے کا ماہر تھا۔ اس لیے کئی مرد حضرات اس کے خاص گاہک اور مریض تھے۔ سردار جابر کا دوسرا دوست ایک پیر تھا، جس کا نام شاہ جہاں تھا۔ اس کی پیری مریدی کا بھی ایک خاص سلسلہ تھا...... یہ دونوں سردار جابر خان کے جگری اور ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی تھے۔ وہ دونوں اس کے اس کارِ خاص میں ممد و معاون تھے۔ حکیم زمان اس کے لیے مقویات تیار کرتا تھا اور پیر شاہ جہاں نئی سے نئی لڑکیوں کی نشان دہی کرتا۔ اس کی پیری مریدی کا دائرہ کئی دیہات تک پھیلا ہوا تھا...... جس رات حویلی میں کوئی نئی لڑکی لائی جاتی۔ اس رات سردار جابر خان کوئی میٹھی ڈش پکوا کر اپنی ملازمہ شانو کے ہاتھوں ایک ایک پلیٹ حکیم زمان اور شاہ جہاں کو بھجواتا تھا۔ وہ دونوں اس میٹھی ڈش کا مطلب سمجھ جاتے۔ حکیم زمان میٹھا وصول کر کے اسی پلیٹ میں ایک مقوی خمیرہ رکھ دیتا جسے سردار خان نے رات کو کھانا ہوتا تھا، پھر جب صبح ہوتی تو اس کے دونوں جگری دوست اس کے پاس حویلی میں آ جاتے اور سردار جابر ان کو رات کی کہانی مزے لے لے کر سناتا۔ اس لیے کہ اسے ان دو دوستوں سے کوئی پردہ نہ تھا۔

جس شام سردار جابر خان...... سلطانہ بیگم کو خود کہہ کر میٹھی ڈش خاص کر حلوہ تیار کراتا۔ سلطانہ بیگم کی جان پر بن جاتی۔ انتہائی ضبط کے باوجود بھی اس کے اندر کی عورت بیدار ہو جاتی...... لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکتی...... سوائے آنسو بہانے اور اپنے لہو کی آگ میں جلنے کے۔ وہ رات وہ جاگ کر اور تڑپ تڑپ کر گزار دیتی۔ ساری رات اس کی آنکھیں برسات کی مانند برستی رہتیں اور وہ اپنے نصیب کی آگ میں جلتی رہتی۔

☆......☆

ایک دن جب اسکول میں چھٹی ہوئی اور دلیر خان حسبِ معمول اپنی بگھی میں سوار ہونے لگا تو بارش شروع ہو گئی۔ بگھی تھوڑا سا آگے نکلی تو راستے میں دلیر خان کو نذیر نظر آ گیا۔ اس نے اس روز کسی کی پروا نہ کی اور نذیر کو زبردستی بگھی میں بٹھا لیا۔ راستے میں بگھی کے لگام کا بخیہ اُدھڑ گیا تو کوچوان نے بگھی روک دی...... کیوں کہ جب تک لگام مرمت نہ ہو، بگھی کو چلانا بے کار تھا۔ کوچوان نے بگھی کھڑی کی اور خود بستی کی طرف کسی موچی سے لگام مرمت کرانے چلا گیا۔ دلیر اور نذیر بگھی میں بیٹھ کر ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں ہی نذیر نے دلیر خان سے پوچھا۔

''کہو تمہاری امی کے کیا حال ہیں؟''

''بہت ہی بُرا حال ہے۔ اُن کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔ میں انہیں کوئی تسلی نہیں دے سکتا۔ ایک اس وجہ سے کہ میری ماں کا خیال ہے کہ مجھے میرے باپ کے کرتوتوں کا علم نہیں...... دوسرے یہ کہ اگر میں اس حجاب کو دور کر بھی دوں جو میرے اور امی کے درمیان اب کی صورت میں حائل ہے تو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ خود ان کا یہ حکم ہے کہ میں اپنے باپ سے کوئی ایسی بات نہ کہوں جو گستاخی کہلائے۔ میرے باپ کی عمر پچاس سال ہوگی...... مگر اب بھی اس کے دم خم میں فرق نہیں آیا۔''

"دلیر خان! تم میرے جگری دوست ہو۔ اسی وجہ سے مجھے تمہاری امی سے ہمدردی ہے" نذیر نے کہا۔

"مجھے اُن کی حالت پر بہت افسوس ہے۔ اگر اس سلسلے میں جب بھی تمہیں میری مدد درکار ہو، تو میں حاضر ہوں۔"

"جب میں خود کچھ نہیں کر سکتا، تو تمہاری کیا بساط ہے کہ تم کچھ کر سکو۔ ہم سب ہی مجبور ہیں۔"

نذیر بولا۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ یار! یہ تو بتاؤ کہ حکیم اور شاہ جہاں سے تمہارے ابا کی کیوں گہری چھنتی ہے۔ میں نے ان کے علاوہ کسی تیسرے آدمی کو تمہاری حویلی میں جاتے کبھی نہیں دیکھا۔"

"وہ دونوں ذلیل، بے غیرت اور خبیث آدمی ہیں۔" دلیر خان نے غصّے اور نفرت سے کہا۔

"حکیم زمان میرے باپ کو خمیرے کھلاتا ہے اور شاہ جہاں میرے باپ کو اطلاعات دینے کا انچارج ہے۔ میرے باپ سے ان لوگوں کا تعلق میری پیدائش سے قبل کا ہے۔ میرے بس میں ہو تو میں اِن دونوں کو گولی مار دوں۔ اب ان حالات میں ہم مجبور انسان صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم اپنے باپ کی جگہ ہو تو کیا کرو گے؟ نذیر نے بغیر ملامت سے پوچھا۔

"میں...... میں اپنی ماں کا سینہ ٹھنڈا کروں گا۔ ان دلالوں، کٹنیوں...... حکیم اور پیر سب کو اپنے دیہاتوں میں نہ رہنے دوں گا۔ نذیر علی! جو لڑکیاں میرے باپ کے ہاتھوں برباد ہوتی ہیں، ان میں سے ہر لڑکی کسی کی بیٹی...... کسی کی بہن ہوتی ہے...... یار! میرے باپ نے تو پانچوں گاؤں میں گند ڈال دیا ہے۔ مجھے اس پر شرم آتی ہے اور غصّہ بھی۔ دُکھ بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے مزارعین اور اپنے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ میرے باپ نے جو فرق قائم کر رکھا ہے، وہ مصنوعی ہے۔ اسے تو میری اور تمہاری دوستی بھی اچھی نہیں لگتی...... مگر تم فکر نہ کرنا میں دوستی پر آنچ نہ آنے دوں گا۔"

وہ دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کوچوان لگام مرمّت کرا کے واپس آ گیا۔ دلیر خان نے پہلے بھی کئی بار یہ سوچا تھا کہ وہ نذیر کو اپنے ساتھ بگھی میں بٹھا لیا کرے۔ آج یہ خیال شدّت سے آیا۔ یہ اس لیے بھی کہ آج خود اس نے نذیر کو روک کر بٹھا لیا تھا...... پھر اسے خیال آیا کہ اگر میں ایسا کروں گا تو کوچوان ابا کو یہ بات ضرور بتا دے گا۔ اس پر میری شامت آ جائے گی۔ وہ خیالات کی اس اُدھیڑ بن میں تھا کہ نذیر نے دلیر خان سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر بگھی سے اُتر گیا اور اپنے راستے پر ہو لیا، کیوں کہ بارش بھی رُک گئی تھی اور وہ دلیر خان کی پوزیشن کو بھی سمجھتا تھا۔

☆......☆

برسات کا موسم کئی برسوں سے تقسیم ہند سے قبل بھی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مصنف اور شاعر حضرات کا یہ ایک مخصوص موضوع رہا ہے۔ اس پر ڈھیروں شاعری بھی کی گئی ہے اور اب بھی کی جاتی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے دیہاتوں میں برسات کے موسم کا خصوصی طور پر انتظار اور اہتمام کیا جاتا تھا۔ زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ ہر چیز بدل گئی ہے، مگر اب بھی بعض دیہاتوں میں اس میں دل چسپی لی جاتی ہے۔

سردار جابر کے پانچوں دیہاتوں اور اِرد گرد کے دوسرے دیہاتوں کی عورتوں کے لیے موسم برسات ایک لحاظ سے خاص دِل چسپی کا حامل ہوتا تھا۔ وہ کئی مہینے پہلے ہی اس موسم کا انتظار کرنے لگتی تھیں......

اُن دِنوں ان دیہاتوں میں ایک رواج تھا اور اس رواج کو ایک مخصوص دِن منایا جاتا تھا۔ ایک تقریب منعقد کی جاتی، جس کا نام انہوں نے "پیلوں" رکھا ہوا تھا۔ برسات کے موسم میں عورتیں اس تقریب کا شدّت سے انتظار کرتی تھیں۔ وہ رواج یہ تھا کہ برسات کے موسم میں اگر کسی جمعرات والے دِن دوپہر تک بارش ہوتی اور دوپہر کے بعد موسم کھل جاتا اور بارش تھم جاتی...... مگر بادل یوں ہی گھرے رہتے، تو تین چار بجے شام کے قریب ہر گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنی اپنی زمینوں کے کھلے کھیتوں اور میدانوں میں نکل جاتیں اور خوب تفریح مناتیں۔ اس روز وہ اپنے قیمتی اور بہترین کپڑے پہنتی تھیں۔ جس کسی کے کھیت میں تناور درخت ہوتا۔ وہاں پر جھولا ڈال لیا جاتا۔ عام طور پر لڑکیاں اور عورتیں اپنی عمر کے لحاظ سے ٹکڑیوں میں بٹ جاتیں۔ جن کے درمیان دو دو چار چار گز کا فاصلہ ہوتا۔ وہ اپنے اپنے رنگ، مزاج اور عمر کے مطابق کھیل کھیلتیں، گانے گائے جاتے، لوک گیتوں کی تانیں

اُڑتیں...... نقلیں اُتاری جاتیں...... دھمال پڑتی...... قہقہوں کا طوفان اُمڈتا...... چھیڑ چھاڑ ہوتی...... پھبتیاں کسی جاتیں، نت نئی شرارتیں رنگ جماتیں۔ اس وقت رکھ رکھاؤ تو ایک طرف، کسی کو اپنے دوپٹے تک کا ہوش نہ ہوتا۔

پیلوں کی تقریب صرف جمعرات کے دن بعد از دوپہر کے وقت کے لیے مخصوص تھی۔ اب یہ ان عورتوں کی قسمت کہ ساون اور بھادوں کے دو مہینوں میں اس قسم کی کتنی جمعراتیں آتیں۔ جس سال موسم برسات میں ایسی پانچ جمعراتیں آجاتیں، اسے بڑا ہی مبارک سال شمار کیا جاتا اور عرصہ دراز تک اس کا حوالہ دیا جاتا۔

''پیلوں'' والے دن گاؤں کی کوئی عورت اور کوئی لڑکی گھر پر نہیں رہتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہوتی اور اس وجہ سے تقریب میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوتی تو وہ اسے چارپائی سمیت اٹھا کر وہاں لے جاتیں، تاکہ وہ ''پیلوں'' کا نظارہ دیکھتی رہے۔ اس دن سارے مرد گھر پر رہتے اور کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی۔ وہ بھی اس معاملے میں عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

عورتوں کی یہ تقریب اور دھماچوکڑی دن غروب ہونے کے بعد اس وقت تک جاری رہتی جب تک آنکھوں کو کچھ دکھائی دیتا رہتا۔ اگر اتفاق سے وہ چاندرات ہوتی تو عورتوں کی سرگرمیاں خاصی رات گئے تک جاری رہتیں۔ جب وہ گھر واپس آتیں تو بچوں کے سوجانے کا وقت ہوتا اور یہ ممکن نہ رہتا کہ وہ رات کا کھانا بنالیں۔ اس صورت میں ہر عورت جلدی سے پانی میں گڑ گھول کر اس میں آٹا ڈالتی۔ تو پتلی سی لئی تیار ہو جاتی جسے وہ توے پر گھی کا چھینٹا دے کر ٹپکا دیتیں اور اس طرح وہ ''پوڑے'' پکا لیتیں۔ گھی نہ ہوتا تو تیل کام دے جاتا اور بچے مزے مزے سے وہ پوڑے کھاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود مردوں کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ عورتوں کو ''پیلوں'' میں دیر ہو جائے تاکہ رات کا کھانا پوڑوں پر مشتمل ہو...... پوڑے اس موسم کی ایک خاص سوغات تھے۔

''پیلوں'' کے اگلے دن یعنی جمعہ کو کنواری لڑکیاں اپنے باپ، بھائیوں کو دوپہر کا کھانا کھیتوں میں پہنچا کر یا وہ بارش کی وجہ سے مجبوراً گھر پر ہوتے...... تو انہیں گھر میں کھانا کھلا کر...... اپنا اپنا چرخہ اور دھنکی ہوئی روئی کے گالے لے کر گاؤں میں کسی کے گھر وسیع دالان میں پہنچ جاتیں اور ترنجن ڈالتیں۔ وہ اکٹھی مل کر اپنے اپنے چرخے پر روئی سے سوت کاتتیں اور ساتھ گانے بھی گاتیں۔ گداز بازو حرکت میں آتے۔ چرخے کی مسلسل گھوں گھوں ایک دلآویز ترنم پیدا کرتی۔ جذبات میں ہیجان برپا ہو جاتا اور کوئی لڑکی کتائی کے ساتھ ساتھ مستی میں آکر اکر پُرسوز گیت چھیڑ دیتی۔ وہ گانا اس کی مادری زبان میں ہوتا اور عام طور پر لوک گیت کی حیثیت رکھتا۔ اس گانے میں زیادہ تر فراق کے اس ابتدائی لمحے کا دردانگیز ذکر ہوتا، جب شادی پر جوان لڑکی اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن اور اکثر اکٹھی کھیلی ہوئی ہمراز سہیلیوں سے جدا ہوتی ہے اور وہ سب مل کر اُسے ایسے مرد کے ساتھ رخصت کرتے ہیں...... جسے اس نے مشرقی روایات کی مجبوری سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا اور اب وہ ناآشنا شخص اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کی زندگی کا مالک بنتا ہے......

لڑکی کی سانسوں میں جوانی کا بے پناہ گداز...... آواز میں انتہائی کرب...... لے میں درد کی کراہ...... یا اس میں ڈوبا ہوا فراق کا مضمون شادی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے گیت کا ایک ایک دلنشین لفظ...... پورا ترنجن تحلیل ہو کر شعریت بن جاتا ہے۔ جوانی سے مست دوشیزہ اپنی نرم و نازک انگلیوں کی پوروں میں مہین روئی کی پونی دبائے جب سوت کے پیدا ہوتے ہوئے تار کو لیے اپنے بازو بلند سے بلندتر کرتی اور اس کے سُر کی ہلکی ہلکی جنبش اس کی گولائیوں کو انگرکھے کی آغوش سے آراستہ تو کائنات دم بخود رہ جاتی۔ تکلا دیوانہ وار گھومتا اور تکلے پر سُوت کی مچھلی اپنے محور کے گرد رقص کرتی۔

پھر دوسری لڑکی اُسی لَے میں کوئی نیا گیت چھیڑ دیتی، اس کے بعد تیسری اور پھر چوتھی اور یہ سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع ہو جاتا تو پھر شام تک جاری رہتا...... وہ دو دن گاؤں کی عورتوں کے لیے یادگار دن ہوتے اور ان کی گونج ایک سال تک سنائی دیتی رہتی۔

☆......☆

سلطانہ بیگم اپنے شوہر جابر خان کے ٹھونسے ہوئے اندازِ زندگی کے احترام میں دیہات کی کسی عورت سے نہ ملتی تھی۔ کسی دوسرے کے گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اس کی آبرو بھی اسی میں تھی کہ وہ الگ تھلگ ہی رہے...... مگر ہاں ''پیلوں'' کی تقریب ایک جدا معاملہ تھا۔

بے شمار نسلوں کی پروردہ اس روایت کے سامنے سردار جابر کی آمریت بھی بے بس تھی۔ وہ سلطانہ بیگم کو اس تقریب میں شرکت سے کبھی نہ روک سکا۔ صرف ''پیلوں'' ہی وہ موقع ہوتا، جب سلطانہ بیگم اپنے رہائشی گاؤں کی عورتوں سے ملتی، جو واقف کم اور ناواقف زیادہ ہوتی تھیں۔ اس تقریب میں سلطانہ بیگم شروع سے آخر تک موجود رہتیں...... لیکن صرف تماشائی کی حیثیت سے...... حویلی کی وفادار ملازمہ شانو اس تقریب میں ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔

☆......☆

دلیر خان اپنے باپ کی وجاہت کی وجہ سے اپنا فرصت کا وقت حویلی میں ہی گزارتا...... وہ باہر کم ہی جاتا تھا۔ اس کے برعکس نذیر علی کو جب بھی موقع میسر آتا...... وہ گاؤں اور معاشرتی بہبود کے کاموں میں بھرپور حصہ لیتا...... اُس نے دلیر خان کو بھی رفاہی کاموں کی طرف راغب کرنے کی بہت کوشش کی، مگر دلیر خان کو ان کاموں سے دلچسپی نہ تھی۔ اسے ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا غم کھاتا رہتا تھا۔ اسے اپنے باپ سے نفرت سی ہوگئی تھی، مگر وہ بے بس تھا...... کچھ بھی نہ کرسکتا تھا۔

نذیر علی کو اس کی بے بسی کا احساس تھا، مگر وہ بھی سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کرسکتا تھا۔

☆......☆

اتوار کا دن تھا۔ کہ ضلع کے صدر مقام سے ایک اہلکار آیا۔ اس کو نذیر علی نے درخواست دے کر بلایا تھا کہ سردار جابر خان کے دیہاتوں میں آوارہ کتوں کی بھرمار ہوگئی ہے اور کچھ باؤلے کتوں نے لوگوں کو کاٹا بھی ہے۔ اس لیے ان کو مارنے کا بندوبست کیا جائے۔ نذیر علی کی درخواست میں کچھ حقیقت تھی۔ اس لیے ضلع کونسل نے ان کتوں کو مارنے کا پروگرام بنالیا۔ انہوں نے اس اہلکار کو اسی سلسلے میں بھیجا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کتوں کو مارنے کے لیے خاصی مقدار میں زہر لایا تھا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار اور ایک دو کسانوں کو ساتھ لیا اور گیلے آٹے میں زہر ملا کر گاؤں کی گلیوں میں کتوں کو تلاش کرنے لگے۔ نذیر علی بھی ان کے ساتھ تھا، کیوں کہ درخواست تو اسی نے دی تھی اور وہ اہلکار سب سے پہلے نذیر ہی سے ملا تھا۔ باقی بچے ہوئے زہر کا تھیلا اہلکار نے فضل دین کے ہاتھ میں تھمادیا تھا، جسے وہ اٹھائے کتا پارٹی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس دن پانچوں دیہاتوں کے تقریباً سب ہی کتے ہلاک کردیے گئے۔ یوں گاؤں میں کتوں کے حوالے سے ایک طرح سے امن قائم ہوگیا۔

☆......☆

اسی برس جولائی کے مہینے کے آخری دنوں میں برسات کی پہلی بارش ہوئی۔ بارش بھی ایسی کہ ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ اس بارش نے موسم گرما کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ پانی بھرے کھیتوں میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ مینڈھوں میں چھپ کر جھینگروں نے بھی اپنا راگ شروع کررکھا تھا۔ پرندے درختوں پر ایک دوسرے سے چہلیں کررہے تھے۔ صبح ہی سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی۔ اس لیے نذیر علی اس روز اسکول نہیں جاسکا تھا۔ ہاں دلیر خان باقاعدہ اپنی بگھی میں سوار ہوکر اسکول پہنچ گیا۔ کیوں کہ اسے سواری کی جو سہولت حاصل تھی، اس سے نذیر محروم تھا...... لیکن گھر پر رہ کر نذیر خوش نہیں تھا۔ اس لیے کہ صبح سے لے کر دوپہر تک اس کی اپنی بہن زیبو سے دو بار لڑائی ہوچکی تھی۔ زیبو اس سے دو سال بڑی تھی، لیکن قد کاٹھ میں وہ نذیر سے بہت بڑی لگتی تھی...... پھر بھی وہ ایک دوسرے سے لڑے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، پھر وہ جتنا آپس میں لڑتے اتنا ہی آپس میں پیار بھی کرتے تھے۔ زیبو اور نذیر دن میں ایک دو دفعہ ضرور ایک دوسرے سے دو دو ہاتھ کرلیتے تھے، پھر یوں ہوتا کہ وہ پیار سے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر جھولنے لگتے۔ جب ان کی لڑائی ہوتی تو گھاٹے میں نذیر علی ہی رہتا۔ آج بھی وہ بہن کے ہاتھوں دو دفعہ پٹ گیا تھا۔ دوسری ماؤں کی طرح زیبو کی ماں نے بھی اپنی بیٹی کے لیے اس وقت سے جہیز بنانا شروع کردیا تھا، جب زیبو ابھی صرف آٹھ برس کی تھی۔ اس وقت تک وہ زیبو کے لیے پندرہ سولہ جوڑے کپڑوں کے تیار کرچکی تھی، جن کی سلائی بھی کرالی گئی تھی۔ ایک معمولی مزارع گھر کی اوقات ہی کیا، پھر بھی زیبو کی ماں نے جیسا بھی ہوا بیٹی کی شادی کے لیے کچھ نہ کچھ تیاری کرلی تھی...... اب زیبو بھرپور جوان تھی...... بس رشتہ ملنے کی دیر تھی اور شادی ہوجانا تھی۔

☆......☆

شام گہری ہوچکی تھی، نذیر کا باپ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا تو وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ اس وقت تقریباً اندھیرا اچھل چکا تھا۔ نذیر کی ماں نے دالان میں دیا جلادیا

تھا...... زیبو...... مرغیوں کو ڈربے میں بند کرنے میں مصروف تھی۔ نذیر ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ وہ اس وقت دوسرے کمرے میں اپنی کتاب لینے گیا تھا، تاکہ دیے کی روشنی میں پڑھائی شروع کر سکے۔ اسے اندر داخل ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا...... یکایک اس نے اپنے باپ کو اپنی ماں سے یہ کہتے سُنا۔

''زیبو مر گئی ہوتی تو اچھا ہوتا۔''

بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیوں۔ کیا ہوا؟ خیر تو ہے ناں''

نذیر کا باپ بولا...... ''وہی کچھ ہوتا نظر آرہا ہے۔ جس کا مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا اور جس کا ذکر میں نے تم سے بھی نہ کیا...... مجھے یقین ہے تمہارا دل بھی خائف رہا ہوگا اور تم نے بھی اپنے خوف کا اظہار میرے سامنے کرنا مناسب نہ سمجھا ہوگا...... آج میں نے ایک دلال کو اپنے دروازے کے سامنے سے دو بار گزرتے دیکھا ہے۔ ہماری گلی میں زیبو کے علاوہ کوئی دوسری جوان لڑکی موجود نہیں ہے۔''

یہ بات سن کر نذیر کی ماں پر بجلی گری اور گلوگیر آواز میں صرف اتنا کہہ سکی۔

''ہائے میرے اللہ! اب کیا ہوگا؟''

وہ لڑکھڑا سی گئی۔ نذیر کے باپ نے آگے بڑھ کر فوراً اسے اپنے بازوؤں میں تھام نہ لیا ہوتا تو وہ وہیں ڈھیر ہو گئی ہوتی۔ وہ بے ہوش تو نہ ہوئی لیکن اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اب وہ دونوں خاموش تھے۔ بھیانک سناٹا سا چھا گیا تھا۔

نذیر علی نے اپنے ماں باپ کی گفتگو سن لی تھی اور ماں کا جو حال ہوا وہ بھی اس نے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ کھنکارا اور باہر آگیا۔ اس کے ماں باپ مطمئن تھے کہ نذیر کو کسی بات کا علم نہیں ہے......

مگر نذیر کا تو خون کھول رہا تھا...... وہ پاگل ہُوا جا رہا تھا...... مگر ادب کی وجہ سے ماں باپ کے سامنے اس کی زبان بند تھی۔ سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آچکا تھا...... بلکہ اسے یاد آیا کہ آج ایک مشکوک سی عورت نے بھی ان کے دروازے کے اندر جھانکا تھا...... مگر وہ اسے دیکھ کر پہلے کچھ ہچکچائی...... پھر اندر آنے کی بجائے واپس چلی گئی تھی۔

اس رات نذیر کی ماں اور باپ آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ ان کی چارپائیاں بالکل پاس پاس تھیں۔ نذیر اور زیبو کی چارپائیاں کچھ فاصلے پر تھیں۔ زیبو لیٹتے ہی جوانی کی بے فکر نیند سو گئی اور نذیر خاصی دیر تک جاگتا رہا۔ اس نے ماں باپ کی گفتگو سننے کی بہت کوشش کی لیکن ایک لفظ بھی پلے نہ پڑا...... آخر اسے بھی نیند آ گئی۔

ابھی پہر رات باقی تھی کہ ماں نے زیبو کو جھنجھوڑا......

''زیبو بیٹی! جلدی اُٹھو خبر آئی ہے کہ تیری نانی شدید بیمار ہے...... بیٹی! میں گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی، تو اپنی نانی کے پاس چلی جا...... جلدی اُٹھ اور چلنے کی تیاری کر...... تیرا باپ تجھے چھوڑنے جا رہا ہے۔ اور وہ تیار بیٹھا ہے۔''

ماں کی آواز سن کر نذیر بھی جاگ اٹھا تھا۔ باپ اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ اس لیے اس کے چہرے کے تاثرات اسے معلوم نہ ہو سکے۔ ماں کے اضطراب کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

زیبو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ ماں نے اپنی بات دوبارہ دوہرائی تو تب اس کی سمجھ میں آئی۔ وہ ایک فرماں بردار اور سعادت مند بیٹی تھی۔ آدھے گھنٹے میں وہ سفر کے لیے تیار ہو گئی۔ آگے باپ اور پیچھے بیٹی دروازے سے گزر کر باہر جا رہے تھے۔ باپ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ایک رات میں ہی اس کی کمر میں خم آگیا تھا۔ اس کے پاؤں زمین پر جم کر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے بیوی سے کوئی بات کہنا چاہی...... مگر الفاظ گلے میں اٹک کر رہ گئے۔ نذیر بدستور چارپائی پر لیٹا تھا۔ اس نے ماں کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ جب اس کا باپ دروازے سے باہر قدم دھر رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کہتے ہوئے سُنا۔

''نذیر کے ابا میں پھر یہی کہتی ہوں کہ تم نہ جاؤ۔ تمہارا یہاں گھر پر موجود رہنا بے حد ضروری ہے۔ زیبو کو نذیر، ننھیال چھوڑ آئے گا...... میں اسے جگا دیتی ہوں۔''

نذیر کے باپ نے جواب دیا۔ ''نہیں میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ ان لوگوں کو بہت سی باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے، نذیر ابھی بچہ ہے۔ وہ ان معاملات کو نہیں جانتا۔''

اس کے بعد باپ اور بیٹی رُخصت ہو گئے...... زیبو کے رخصت ہوتے ہی اس کی ماں نے مصلا سنبھال لیا۔ جانے وہ خدا سے کیا دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی سسکیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں، یہاں تک اس نے خدا کے حضور میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر نذیر کا کلیجہ ہل گیا۔ نذیر اور زیبو کا ننھیال کافی فاصلے پر تھا، لیکن نذیر کو اندازہ تھا کہ سردار جابر خان کے ہاتھ اس سے بھی زیادہ

لیے ہیں...... ماں کی گریہ زاری، بے وجہ نہ تھی۔ نذیر کے باپ کو گھر سے گئے تین دن ہو گئے تھے۔ وہ ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ شاید وہ زیبو کے ننھیال سے مشورہ کر کے زیبو کو کسی دوسری جگہ لے گیا تھا...... شاید دوسری جگہ والوں نے بھی منہ موڑ لیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کو لے کر تیسری جگہ پہنچ گیا تھا...... شاید تیسری جگہ والوں نے بھی سردار جابر خان کے ڈر سے کانوں پر ہاتھ دھر کر صاف جواب دے دیا تھا...... شاید اب وہ کسی چوتھی پناہ گاہ کی تلاش کر رہا تھا۔

☆......☆

گاؤں کی زندگی اُن دِنوں میں بہت ہی سادہ ہوتی تھی۔ وہاں کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، وہاں معمولی سے معمولی واقعے کی خبر فوراً گھر گھر پھیل جاتی ہے، چنانچہ دوپہر تک سارے گاؤں کو پتا لگ گیا کہ زیبو کی نانی سخت بیمار ہے اور زیبو اپنے باپ کے ہمراہ وہاں جا چکی ہے۔

وہ تیسرا دن جمعرات کا تھا، جب صبح ہی سے بادل اُمڈ آئے تھے۔ سیاہ بادل آوارہ ہاتھیوں کی طرح آسمان پر غول در غول حرکت کر رہے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر لحظہ زمین کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا...... ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی...... گائے بھینسیں ڈکرا رہی تھیں...... بارش بس شروع ہونے ہی والی تھی۔ پھر بھی نذیر نے بستہ اُٹھایا اور اسکول روانہ ہو گیا۔ اسکول میں داخل ہو رہا تھا کہ ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی جیسے آسمان کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ تین گھنٹے مسلسل بارش ہوتی رہی۔ بارش جوں ہی تھمی اسکول میں چھٹی دے دی گئی، تا کہ طلبا اس خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہو سکیں۔ جمعرات کا دن...... موسلا دھار بارش اور پھر بعد دوپہر موسم کا کھل جانا...... ''پیلوں'' کی تقریب کا سبب بن گیا۔

☆......☆

نذیر جب گھر پہنچا تو گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں گھروں سے نکل کر کھیتوں اور میدانوں کی طرف رواں دواں تھیں۔ نذیر نے ابھی اپنے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ محلے کی عورتیں اس کی ماں کو لینے آ گئیں۔ اس کی ماں نے سر درد کا بہانہ بنایا، مگر ''پیلوں'' کی تقریب پر کون کسی کی سنتا تھا۔ وہ اسے زبردستی کھینچ کر اپنے ہمراہ لے گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہر گھر کی عورتیں اور لڑکیاں کھیتوں میں پہنچ کر رنگ رلیاں منا رہی تھیں۔ پورے گاؤں میں ایک بھی عورت گھر میں موجود نہ تھی۔ گھروں میں صرف مرد دَبکے بیٹھے تھے اور بوڑھے کھانے کا انتظار کر رہے تھے......

شام چھ بجے کے قریب حسبِ معمول شانو، رومال پوش طشت اٹھائے، نظریں زمین پر جھکائے چھوئی موئی کی طرح سِمٹی سمٹائی پیر شاہ جہاں کے دروازے پر پہنچ گئی۔ سردار جابر خان کی طرف سے بھیجے ہوئے حلوے کی ایک پلیٹ اس نے شاہ جہاں کے ہاتھ میں تھمائی اور الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ شاہ جہاں اس حلوے کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا...... پھر خود ہی مسکرا کر رہ گیا۔

وہاں سے شانو نے حکیم زمان کے گھر کا رُخ کیا۔ حکیم صاحب نے سردار جابر خان کی طرف سے حلوے کی پلیٹ پائی تو بہت خوش ہوا۔ پلیٹ میں سے حلوہ نکال کر اس نے حسبِ معمول اس میں خمیرہ دھر دیا...... اب شانو سردار جابر کی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ وہ راستے میں ایک جگہ ایک دو منٹ کے لیے رُکی، شاید وہ اپنا دوپٹا دُرست کر رہی تھی۔ شانو ایک بڑی حیادار لڑکی تھی۔ وہ برقع تو نہیں پہنتی تھی، مگر دوپٹا اس طرح سے اوڑھتی کہ اس کا چہرہ بمشکل نظر آتا تھا۔ اس وقت بھی شاید وہ اپنا دوپٹا دُرست کرنے کے لیے رُک گئی تھی...... شاید یہی وجہ تھی کہ نذیر علی اس کو پسند کرتا تھا، اور اس کا پیچھا بھی کرتا رہتا تھا۔

شانو حکیم زمان کا خمیرہ طشت میں لیے آخر حویلی کے قریب پہنچ گئی۔ وہ عموماً حویلی کے پچھلے دروازے سے آیا کرتی تھی۔ وہ دروازہ عام طور پر ہمیشہ اندر سے بند رہتا تھا۔ شانو نے اس عقبی دروازے پر آہستہ آہستہ سے دستک دی...... دروازہ کھولا گیا...... دروازہ کھولنے والا دلیر خان تھا۔ جس کی عادات اطوار باپ کے بالکل ہی اُلٹ تھیں۔ اور یہ اس کی ماں کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اُس نے شانو کو دیکھتے ہی نظریں نیچی کر لیں اور طشت اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے حکیم زمان کا بھیجا ہوا خمیرہ وصول کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کے باپ کے لیے ہے۔ چنانچہ اس نے وہ پلیٹ اپنے باپ کے کمرے میں میز پر رکھ دی۔ سردار جابر خان اس وقت غسل خانے میں تھا۔ سلطانہ بیگم ''پیلوں'' منانے گئی ہوئی تھی۔ طشت کو میز پر رکھنے کے بعد دلیر خان پھر عقبی دروازے پر آیا کہ ممکن ہے حکیم زمان کی طرف سے سردار جابر کے نام کوئی زبانی پیغام بھی ہو...... مگر اب دروازے پر کوئی بھی نہ تھا۔ شانو حویلی کے اندر آنے کی بجائے واپس چلی گئی

تھی...... دلیر خان کو یاد آیا کہ آج "پیلوں" کی تقریب ہے۔ بھلا شانو اسے کیسے چھوڑ سکتی تھی...... وہ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہوگی...... چناں چہ اس نے غصّے میں دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی...... وہ اس خمیرے کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ خمیرہ اس بات کا ثبوت تھا...... کہ اس کے باپ کی آج کی رات پھر رنگینیوں میں کٹے گی۔

اور کل صبح حکیم زمان اور پیر شاہ جہاں حویلی ضرور آئیں گے...... دلیر خان کا کمرہ اس کے باپ کے کمرے سے بہت دُور تھا۔ وہ سر جھکائے بے دلی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

سردار جابر غسل خانے سے باہر نکلا تو حکیم زمان کے بھیجے ہوئے خمیرے کو اپنا منتظر پایا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں...... "آج موسم بھی رومان انگیز ہے۔ "پیلوں" کی تقریب ہے۔ پھر کئی دن سے کوئی نیا شکار کئی اور دلال نہیں لائے۔ پتا نہیں کیوں......؟ مگر اس خمیرے کا یہ مطلب ہے کہ حکیم زمان اور شاہ جہاں نے میری آج کی رات کا کوئی بندوبست کر لیا ہے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ میرے دوست میرے بڑے ہی مزاج شناس ہیں۔"

سردار جابر نے سوچا اور حکیم زمان اور شاہ جہاں کی قدر و قیمت اُس کی نظر میں اور بھی بڑھ گئی۔ سوچتے سوچتے اس نے خمیرہ اپنے حلق کے اندر اتار لیا اور مستی میں انگڑائیاں لینے لگا۔

☆......☆

آدھے گھنٹے کے بعد گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ سردار جابر کو خون کی قے آ رہی ہے اور اس کا بیٹا دلیر خان بھی لے کر حکیم زمان کو لینے گیا ہے، تا کہ باپ کا علاج ہو جائے...... لیکن جب دلیر خان وہاں پہنچا تو خود حکیم زمان کو بھی خون کی قے آ چکی تھی اور وہ نزع کے عالم میں تھا...... سراسیمگی کی حالت میں دلیر خان گھر واپس آیا۔ اس وقت سردار جابر خان دم توڑ چکا تھا...... معلوم ہوا کہ خون اُگلتا اُگلتا پیر شاہ جہاں بھی زندگی ہار گیا ہے۔ تین جگری اور وہ بھی ممتاز دوستوں کا بیک وقت اچانک موت کے منہ میں چلے جانا ایسا واقعہ تھا جس نے پورے ضلع اور علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔

☆......☆

لڑکیاں اور عورتیں گاؤں سے کافی دور میدان میں رقص و سرور میں مست تھیں کہ کسی نے وہاں یہ خبر پہنچائی کہ سردار جابر کو خون کی قے آ رہی ہے۔ جس کسی نے یہ خبر پہنچائی، دیر سے پہنچائی، اس لیے کہ اسی وقت ایک دوسرا آدمی یہ خبر دینے آ گیا کہ سردار جابر، حکیم زمان اور پیر شاہ جہاں خون کی قے کرتے کرتے مر گئے ہیں۔

سلطانہ بیگم ساری عمر اپنے شوہر جابر خان کے رویے کی سخت شاکی رہی اور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتی رہی تھی کہ اُس کے اس سہاگ سے رنڈاپا اچھا اور رنڈاپے سے موت اچھی...... پھر بھی وہ ایک مشرقی عورت تھی۔ شوہر کی موت کی خبر سُنی تو اس کے حواس معطّل ہونے لگے اور اسے غش آ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے یہ خبر اچانک ملی تھی۔ بہر حال شانو نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور بڑی مشکل سے اسے حویلی تک لائی۔

گاؤں والوں کو پہلے تو سردار جابر کی موت کا یقین نہ آیا۔ یہ بات کسی کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ وہ مر سکتا ہے...... جب یہ ثابت ہو گیا کہ واقعی وہ مر گیا ہے تو لوگ پہلے اس کی موت پر کچھ حیران ہوئے اور پھر ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ صرف چند گھنٹے بعد وہ غریب لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے، جن کی بیٹیاں جوان ہونے والی تھیں۔

☆......☆

پولیس آئی...... تینوں نعشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا...... رپورٹ میں لکھا گیا کہ ان تینوں کی موت کسی مارنے والے زہر سے ہوئی ہے۔ کچھ تفتیش ہوئی، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کو زہر کس نے اور کیسے دیا۔"

گاؤں کے مردوں کا بیان تھا کہ انہوں نے شانو کو رومال پوش طشت لیے ان تینوں کے گھروں میں جاتے دیکھا تھا...... جب کہ ادھر تمام عورتوں کا کہنا تھا کہ شانو تمام وقت "پیلو" کی تقریب میں سلطانہ بیگم کے پاس موجود رہی ہے۔ خود سلطانہ بیگم کا بھی یہی بیان تھا۔ شانو سے متعلق یہ معما پولیس بھی حل نہ کر سکی تھی اور کیس داخل دفتر ہو گیا تھا۔

پولیس نے اپنے طور پر تفتیش کی تھی، مگر پہلے دن تفتیش شروع ہونے سے پہلے نذیر علی نے زیبو کے جہیز والے کپڑوں کا ایک جوڑا اپنے جسم سے اتار کر دوبارہ صندوق میں بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جابر خان کی حویلی پہنچ گیا، تا کہ وہ اپنے دوست دلیر خان کی دلجوئی بھی کرے اور پولیس کو تفتیش میں مدد بھی دے۔

☆......☆

دوسری سچ بیانی



زندگی پنجرہ چاندی کا

محمد فہیم

کراچی سے ایک شخص کا زندگی نامہ، عمر بھر کی ریاضتیں

بے ثمر ہو جائیں تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں

اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے صحن میں ایستادہ درخت پر چڑیا کے ویران اور اُجاڑ گھونسلے کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں چند روز پہلے تک دو ننھے ننھے بچے چوں چوں کر رہے تھے لیکن اب وہ گھونسلا ویران پڑا تھا۔

جس روز سے چڑیا کے انڈوں سے یہ بچے نکلے تھے، ننھے فرحان کو اک دل چسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ دن بھر اس گھونسلے پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہتا، جہاں چڑیا تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہیں سے دانہ دُنکا اپنی چونچ میں دبائے لے کر آتی اور دونوں بے بال و پر کے بچے لپک کر اپنی چونچیں بڑھاتے اور وہ دانہ ان کے پیٹ میں اُتار دیتی، اس طرح جب کئی چکر لگانے کے بعد ان بچوں کے پیٹ بھر جاتے تو چڑیا چہکنے لگتی، یوں لگتا کہ وہ اب اطمینان کا اظہار کر رہی ہے۔

☆......☆

اب ان بچوں کے جسم پر بال و پر نمودار ہونے لگے تھے اور کچھ ہی دن بعد وہ اپنے گھونسلے سے باہر بھی نکلنا شروع ہو گئے۔ جب چڑیا ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے باہر جاتی تو وہ گھونسلے سے باہر نکل کر شاخوں پر بیٹھ کر چڑیا کا انتظار کرتے اور اسے آتے دیکھ کر چوں چوں کر کے اپنی بے تابانہ خوشی کا اظہار کرتے۔

کچھ دن اور گزر گئے اور اب وہ بچے پُھدک پُھدک کر ایک شاخ سے دوسری شاخوں تک جانے لگے تھے، بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے تک اُڑنے کی کوشش بھی کرنے لگے تھے اور ناکامی سے گرنے کے بعد چیخ چیخ کر پورا صحن سر پر اُٹھا لیتے اور بیچاری چڑیا انہیں واپس گھونسلے تک پہنچانے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتی۔

آج صبح ریحان جیسے ہی صحن میں آیا تو اس نے دیکھا کہ دونوں بچوں نے ایک لمبی اُڑان بھری اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، اس روز ننھے ریحان نے وقفے وقفے سے اس گھونسلے پر نظریں جمائے رکھیں لیکن ان دونوں کی واپسی نہیں ہوئی۔ چڑیا بھی شام تک ان کا بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ آج دوسرا روز تھا لیکن وہ بچے تو شاید واپسی کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔ انہوں نے نہ واپس آنا تھا نہ ہی آئے، چڑیا بھی دن بھر کے انتظار کے بعد شاید مایوس ہو کر کہیں چلی گئی۔ نجانے کیوں؟

بچے بھر گئے اُڑان
اب تک راہیں تا کے ان کی
مائیں ہیں نادان......

اس ویران اور اُداس گھونسلے کو دیکھ کر ننھے ریحان



نے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر اس کی ماں گھبرائی ہوئی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی۔ بے اختیار ریحان کو اپنی بانہوں میں بھر کر رونے کا سبب پوچھا اور وجہ جان کر بے ساختہ ہنسنے لگی۔

"نہ رو میری جان! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی، یہ بھی کوئی رونے کی بات تھوڑی ہے بیٹا! یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ ماں باپ بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں اور ان بچوں کی یہ فطرت ہے کہ جب انہیں پرواز آجاتی ہے تو پھر وہ پلٹ کر اس آشیانے کی جانب دیکھتے بھی نہیں جہاں انہوں نے آنکھ کھولی اور ماں باپ کے زیرِ سایہ اُڑان سیکھی۔ انہیں اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی کہ ان کے بعد اس آشیانے پر کیا بیتے گی، جسے صرف اور صرف ان کے لیے دن رات کی محنت کے بعد تنکا تنکا جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ایک ایک دانہ چگ کر انہیں اس قابل بنایا تھا کہ وہ اپنے زور بازو پر پرواز کرسکیں۔" ماں کے دلاسے دینے پر وہ اس کی شفیق بانہوں میں ہی سو گیا تھا۔

☆......☆

میرا نام مینا شفیق ہے۔ میرے اپارٹمنٹ کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں ایک شفیق سے انسان رہتے ہیں قاضی ریحان صاحب! لکھنے پڑھنے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ میرے شوہر شفیق صاحب سے اکثر ان کی بیٹھک رہتی ہے اور علم و ادب پر گفتگو! یہ صرف ایک کمرے کا فلیٹ ہے۔ ایک بیڈ اور لاؤنج پر مشتمل نہایت صاف ستھرا اور نفاست سے سجا ہوا۔ اُن کے بیڈ روم کی خاص بات ان کے بک شیلف ہیں، جن میں دنیا بھر کے مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ تنہا رہتے ہیں اور کھانا بنانے اور صفائی ستھرائی کے لیے ایک خادمہ ہے جو صبح آکر کام انجام دے جاتی ہے۔ میں جب بھی کوئی خاص ڈش بناتی ہوں تو قاضی انکل کے لیے ضرور لے کر آتی ہوں اور وہ جو دعائیں دیتے ہیں وہ میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہیں کیوں کہ میں اس خیال کی حامی ہوں کہ دعا میں وہ تاثیر

ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ قبول فرمالے تو مرتا ہوا شخص بھی اُٹھ کر کھڑا ہو جائے۔

آج میں نے شام کی چائے پر بارش کے موسم کے حوالے سے پکوڑے تلے تھے، چناں چہ پکوڑے پودینے کی چٹنی اور چائے ایک ٹرے میں سجا کر انکل قاضی کو دینے کے لیے ان کے فلیٹ میں داخل ہوئی، انکل اس وقت دیوار کے رُخ رکھی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ وہ دو لائنیں لکھتے، رک کر اسے پڑھتے اور پھر کچھ سوچتے اور دوبارہ لکھتے۔ میں نے ان کی محویت کو دیکھ کر نہ جانے کیوں انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے ٹرے ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد انہوں نے لکھنا ختم کر کے اس تحریر کو پڑھنا شروع کیا اور پھر میں نے دیکھا کہ ان کے جسم میں لرزش سی شروع ہو گئی جیسے وہ رو رہے ہوں، میں برداشت نہ کر سکی اور آہستگی سے انہیں مخاطب کیا۔

''انکل! دیکھیے میں آپ کے لیے کیا لائی ہوں!''

انکل چونک کر بے ساختہ میری جانب مڑے تو میں نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں دو موتی چمک رہے تھے جنہیں انہوں نے جلدی سے انگلیوں سے پونچھ ڈالا۔

''ارے بیٹا تم...... تم کب آئیں اور کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو!'' انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ روز روز تکلف کیوں کرتی ہو تم......''

یہ سب کچھ وہ ایک سانس میں ہی کہہ گئے۔

جیسے وہ اس سچویشن سے کچھ پریشان سے ہو گئے ہیں اور اپنی ندامت مٹانا چاہتے ہوں۔ حالاں کہ اس سے پیش تر انہوں نے کبھی میرے کچھ لانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، بلکہ ہمیشہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لاتعداد دعاؤں سے نوازتے تھے۔

''انکل آپ کیا لکھ رہے تھے؟'' میں نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

''نہیں! کچھ خاص نہیں، بس یونہی، دو چار اشعار کلبلائے تھے ذہن میں، سوچا صفحۂ قرطاس پر منتقل کرلوں۔

''اوہو! انکل شاعر بھی ہیں!'' میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ارے ارے!! نہیں کیا فضول سے اشعار پڑھ کر اپنا وقت ضائع کرو گی تم!''

''نہیں انکل! آج تو میں آپ کی شاعری سن کر ہی جاؤں گی۔ تھوڑے سے ردّوقد کے بعد انکل نے وہ ڈائری میرے حوالے کردی۔

☆......☆

پہلے ہی صفحہ پر تحریر تھا۔

میں ہوں انسان اک تھکا ہارا
دُکھ سے مجبور اور غموں سے چُور
میرے اندر کبھی کوئی جھانکے
کتنا بے بس ہوں کس قدر مجبور!

☆......☆

نصف میری حیات کا حصہ
صرف گزرا ہے گھر بنانے میں
باقی ماندہ حیات گزری ہے
یہ گھر مجھے سجانے میں

☆......☆

سنگی ساتھی تمام چھوٹ گئے
اور بچے بھی بس گئے ہیں دور
ایسا لگتا ہے مرچکا ہوں میں
کررہا ہوں پُل صراط عبور!!

☆......☆

''اُف میرے خدا!! انکل اتنے دُکھی ہیں؟

میں نے ڈائری کا ایک صفحہ پلٹا جس پر تحریر تھا۔

میں اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر جانے والا ہوں
اے میرے بچو! جلد تمہیں میں چھوڑ کے جانے والا ہوں
اب اوڑھ کے مٹی کی چادر میں سونے والا ہوں تھک کر
یہ جتنے رشتے ناتے ہیں سب توڑ کے جانے والا ہوں

☆......☆

اُف میرے خدا! یہ ہر وقت لبوں پر تبسم سجائے، لوگوں کے دُکھ درد بانٹنے والا شخص اندر سے اتنا دُکھی ہوگا؟ یہ تو کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا، نہ ہی ایسی سچویشن سے میرا پہلے کبھی واسطہ پڑا تھا۔ بڑی عجیب وغریب سی کیفیت تھی اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ میں نے سوچا کہ اگر میں نے اس وقت انہیں کریدنے کی کوشش کی

تو ان کے دُکھ اور بڑھ نہ جائیں۔ چناں نچہ منٹ کے ہزارویں حصے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ فی الحال انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ ان کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ صبح کسی وقت آکر ٹٹولنے کی کوشش کروں گی۔ ان کی اس کیفیت سے نکلنے کے بعد کچھ دریافت کروں گی تاکہ اُن کے اِن دکھوں کے مداوے کی کوئی صورت نکل سکے جو وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا کہ "انکل! اب میں چلتی ہوں۔ شفیق صاحب دفتر سے آگئے ہیں انہیں بھی چائے دیتی ہوں، برتن صبح لے جاؤں گی۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆......☆

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ بارش میرا پسندیدہ موسم ہے جس کے ایک ایک لمحے کو میں بچپن ہی سے انجوائے کرتی رہی ہوں، لیکن آج رات کی بارش! آج کی بارش میرے تن من میں اِک بے چینی، اِک بے نام سی کسک پیدا کر رہی تھی اور میں دل ہی دل میں ایک ندامت محسوس کر رہی تھی کہ میرے باپ کی عمر کا اِک شخص اتنا دُکھی ہے کہ وہ تنہائیوں میں چپ چاپ آنسو بہا رہا ہے اور ہم اتنے بے خبر!

رات بھر بارش کی بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر گرتی رہیں اور میں جوان آوازوں کو جلترنگ بجنے کی آوازوں کے مماثل قرار دے کر انجوائے کرتی تھی۔ آج یہ آوازیں میرے دل و دماغ میں ایک تلاطم سا برپا کر رہی تھیں۔ جو مجھ سے برداشت نہ ہو پا رہی تھی۔

فجر کی نماز کے قریب جا کر میری آنکھ لگی اور صبح سات بجے کہیں شفیق صاحب کے جھنجوڑ کر بیدار کرنے پر میں ہڑ بڑا کر اُٹھی، جلدی جلدی انہیں ناشتا دیا اور ان کے چلے جانے پر فجر کی قضا نماز ادا کی اور پھر کل شام کے واقعے پر غور کرنے لگی اور فیصلہ کیا کہ دوپہر کا کھانا تیار کر کے انکل کے لیے بھی لے کر جاؤں گی اور ان سے اُن کے دُکھ درد شیئر کروں گی۔

☆......☆

دوپہر ایک بجے میں گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر ایک ٹرے میں بریانی، قورمہ، رائتہ اور کسٹرڈ سجا کر انکل کے گھر میں داخل ہو گئی۔ دروازہ کھلا تھا اور ان کی ملازمہ ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ ابھی کھانا نہیں نکالا تھا اور انکل اپنے بیڈ پر لیٹے کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"انکل! اٹھیے کھانا کھائیے۔"

"ارے بیٹا۔ یہ کیا؟ یہ تم روز روز کے تکلف سے باز نہیں آؤ گی؟" کل شام بھی میں نے منع کیا تھا اور تم آج صبح ہی صبح!!"

"ہاہا...... انکل یہ صبح ہی صبح ہے آپ کی؟ دیکھیے دن کا ایک بج چکا ہے۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟" انکل اُٹھتے ہوئے تکلف سے بولے۔

"انکل کھانا تو ہر ذی روح کی ضرورت ہے اور پھر آج میں آپ کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گی۔ جلدی اُٹھیے مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے اور یہ آپ کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں۔"

"شہر خموشاں کے مکین" انکل نے اُٹھتے ہوئے رسانیت سے جواب دیا۔

"یا اللہ! کتابیں بھی ایسی جن کے نام ہی سے انسان خوف زدہ ہو جائے!"

ہم خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے کہ میں نے اس خاموشی کے تالاب میں پہلا کنکر پھینکا۔

"انکل! یہ آپ اتنی دردناک شاعری کیوں کرتے ہیں؟"

"بیٹا! زندگی میں دُکھ درد کے سوا باقی بچا ہی کیا ہے؟" بے ساختہ اُن کی زبان سے نکل گیا اور مجھے لگا کہ وہ اپنی اس بے ساختگی پر متاسف بھی ہوئے۔

"انکل! آپ مجھے صرف بیٹی کہتے ہیں یا سمجھتے بھی ہیں؟"

"کیوں نہیں بیٹا! تم میری بیٹی ہو اور میں تمہیں دل و جان سے بیٹی مانتا ہوں۔"

"تو پھر انکل آج آپ اپنی اس بیٹی کا مان رکھ لیں اور اپنے دُکھ درد مجھ سے شیئر کریں۔"

"واہ بھئی! زبردستی! ارے کوئی دُکھ درد ہو تو شیئر کریں، دیکھو کتنی بے فکری کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے صد ہزار کہ اپنی رحمتوں سے رزق کریم سے نواز

رہا ہے، جانتی ہو بیٹی! رزق کریم کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں انکل! آپ ہی بتایئے۔"

"دیکھو بیٹا! اللہ جو سب کا رازق ہے وہ تین اقسام کے رزق اپنی مخلوق کو دن رات بغیر کسی پوچھ پچھ کے تقسیم کرتا ہے۔ وہ اس تقسیم میں کبھی نہیں پوچھتا کہ تم میری پارٹی کے ہو؟ میرے قبیلے کے ہو؟ بس دن رات ہر شخص کو رزق دیتا ہے۔"

میں سمجھ رہی تھی کہ انکل بات ٹالنے کے لیے اصل موضوع سے ہٹ رہے ہیں لیکن میں نے انہیں ٹوکنا مناسب نہ جانا۔

"دیکھو ایک ہوتا ہے رزق حلال، جسے حاصل کرنے کے لیے انسان کو بار بار قرآن پاک میں ہدایت کی گئی ہے، لیکن رزق حلال کے حصول کے لیے انسان کو بہت محنت کرنی پڑتی ہے، دوسرا ہے رزق حرام جس کی سخت ممانعت کی گئی ہے، لیکن اس قسم کے رزق کا حصول بہت آسان ہوتا ہے۔ صرف ضمیر کو مارنا اور اللہ کے احکامات کو پس پشت ڈالنا اولین شرط ہے، لیکن اس قسم کے رزق کے حصول کے بعد دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سخت ذلت و رسوائی اور سزا مقرر ہے اور تیسری قسم ہے رزق کریم! یہ رزق اللہ کسی کسی کو نصیب کرتا ہے، اس کے حصول کے لیے نہ محنت اور نہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بس اللہ پاک کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو یہ رزق کریم اس کی رحمتوں کے نتیجے میں آپ کو بلا کاوش حاصل ہوتا رہتا ہے، جیسے کہ آج کل مجھے رزق کریم اللہ کی جانب سے گھر بیٹھے عطا ہو رہا ہے۔"

"انکل نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے ہزاروں آنسو ان کی آنکھوں سے برس پڑنے کو تیار ہیں۔ سب کہتے ہوئے ان کی آواز کی لرزش میں نے صاف محسوس کی تھی۔

"انکل! بہت سے دکھ ہیں جو کسی کے ساتھ شیئر کرنے سے ہلکے ہو جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے آس پاس کوئی ایسا نہیں جسے آپ اپنے من کی بات سنا کر اپنے دکھ سکھ بانٹ سکیں۔" میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ "میں ہوں نا آپ کی بیٹی! اگر آپ مجھ پر بھروسا کرنے کو تیار ہوں!!"

بالآخر انکل اپنی کہانی سنانے کو تیار ہو ہی گئے۔

☆......☆

"بیٹا عینی! یہ دنیا ہے اور دکھ سکھ، غم و خوشی سے ہر اک کا واسطہ پڑتا ہے اور مقدر کا لکھا جھیلنا بھی ہوتا ہے، سو میں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن بیٹا! دو دکھ بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں، تنہائی کا دکھ۔ اولاد کے دیے ہوئے دکھ، اور یہ ایسے دکھ ہوتے ہیں جو قبر تک انسان کے ساتھ جاتے ہیں اور کیا خبر کہ یہ دکھ قبر میں بھی ستاتے ہوں انسان کو، لیکن کیوں کہ آج تک اس فانی دنیا سے چلے جانے والا کوئی بھی کبھی واپس نہیں آیا اس لیے کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے۔

عینی بیٹا، بچپن سے آج تک میں نے بہت دکھ جھیلے۔ اپنوں سے بھی اور غیروں سے بھی، لیکن میں بھی شکوہ زبان پہ نہیں لایا۔ عین جوانی میں میری شریک حیات بیگم خداوندی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اگرچہ یہ دکھ سہنا میرے لیے آسانی نہ تھا لیکن امر ربی کے آگے سر جھکائے ہوئے اس غم کو بھی جھیل گیا اور اپنی پوری توجہ اور توانائی اپنے ننھے ننھے تین بچوں پر مرکوز کر دی۔ اپنی تمام سوشل زندگی ختم کر دی اور ان کی پرورش اور نگہداشت کو ہی اپنی زندگی کا محور بنالیا۔ میرے بہی خواہوں نے بہت کوشش کی کہ میں دوسری شادی کرلوں اور بہت سے رشتے آئے بھی، کیوں کہ میں جوان بھی تھا اور جاذب نظر بھی۔ سب سے بڑھ کر کماؤ پوت بھی اور ایک قومی سطح کی کمپنی میں ایگزیکٹو عہدے پر فائز بھی۔

میں اپنے ارادے پر ثابت قدم رہا کہ شادی نہیں کرنی، میں سمجھتا تھا کہ اس سے شاید میری زندگی تو کچھ بہتر ہو جائے لیکن میرے بچے نقصان اٹھائیں گے، کیوں کہ بچے ماں کی جگہ کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دوسرے ہمارے معاشرے میں سوتیلی ماں کے لیے کوئی بہت اچھا مقام نہیں ملتا۔ چاہے وہ بے چاری سوتیلی اولاد کے لیے اپنا دل ہی کیوں نہ نکال کر رکھ دے، حتیٰ کہ پاس پڑوس والے بھی اس سلسلے میں اپنا منفی کردار ادا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ میں نے اپنی بھرپور جوانی ان کی نگہداشت میں صرف کر دی۔ اللہ کا شکر ہے بیٹیاں

اپنے گھروں میں خوش ہیں اور دونوں بیٹے اپنے بچوں میں خوش اور رہ گیا میں...... تو میں اپنی تنہائی میں خوش......

عینی! میں نے یہ قربانی اس لیے دی تھی کہ میرے بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ معاشرے میں ایک اچھا مقام پائیں گے تو میں فارغ ہو کر اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیل کود کر اپنی زندگی کے بقایا ایام یادِ الٰہی میں گزارا کروں گا۔ عینی بیٹا! میں نے بالآخر اپنا خود سے کیا عہد تو پورا کر لیا لیکن!! لیکن مجھے کیا ملا؟ جانتی ہو! تنہائی اور فقط تنہائی۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش و خرم آباد ہیں اور بیٹے...... غیر ممالک میں مگن، جن پوتے پوتیوں کو گود کھلانے کی تمنا لیے میں لبِ گور پہنچ گیا ہوں، ان سے کبھی کبھار فون پر بات کرا دی جاتی ہے۔ ویسے وہ مجھے جانتے بھی اس حد تک ہی ہیں کہ دادا نام کی کوئی شے پاکستان میں ہوتی ہے، جن سے گاہے گاہے ممّا اور بابا کو بات کرنا پڑتی ہے۔ ان کی صرف اپنے ماموں، خالائیں اور ان کی اولادیں ہیں جن سے بلاناغہ Skype پر ان کی باتیں ہوتی ہیں کہ ان کی ماؤں نے انہیں ان رشتوں کی اہمیت سے آگاہ کر رکھا ہے۔ بیٹے! اللہ انہیں خوش اور آباد رکھے، میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے ہیں۔ دوا دارو کے وقت پر استعمال کی ہدایت کرتے ہیں، مالی ضروریات کا نا صرف پوچھتے رہتے ہیں بلکہ انہیں بروقت پورا بھی کرتے ہیں۔ تہوار پر جوڑا پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں۔ بہوئیں بھی اپنے میکے والوں کی روزانہ فون پر خبر گیری کے بعد مہینے دو مہینوں میں فون پر بات کرنا نہیں بھولتیں، میری ضروریات کا پوچھنا اور اپنا خیال رکھیے گا کہنا فرض سمجھتی ہیں۔ تم ہی بتاؤ عینی بیٹا کہ اگر تم کسی خوش الحان پرندے کو چاندی کے خوب صورت پنجرے میں بند کر کے اُسے سونے کی کٹوریوں میں کھلاؤ تو کیا وہ اس طرح خوش ہو کر اپنی خوش الحانی برقرار رکھ سکیں گے جیسے وہ کھلی فضا میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش نما گیت الاپتے ہیں۔

"عینی تمام دوست احباب جنہیں میں اپنے بچوں کو وقت دینے کی خاطر چھوڑ چکا تھا، اب وہ میری ضرورت کے وقت مجھے بھول بیٹھے ہیں اور اب میں ہوں اور میری تنہائیاں! اور یہ یادیں جو دراصل مجھے مارے ڈالتی ہیں بس یہی میری ساتھی ہیں۔ یہ یادیں ہی میرے ساتھ رہتی ہیں، سنسان تڑپا دینے والی دوپہریں ہو یا سرد اور رگوں میں خون جما دینے والی راتوں کے مہیب سناٹے۔ یہ یادیں تھپتھپا کر مجھے لوری سناتی ہیں اور جینے کا حوصلہ دے کر نئی راہیں سجھاتی ہیں اور پھر میں تھک کر ان مہرباں یادوں کی گود میں سر رکھ کر خوش ہو ہی جاتا ہوں...... لیکن یہ تو بتا دو بیٹا...... یہ اولادیں ایسا کیوں کرتی ہیں؟ کیوں؟"

اور بس اُس کے بعد سے میں اسی سوال کے جواب میں الجھی ہوئی ہوں...... کل کو مجھ پر بھی تو یہ وقت آنا ہے؟ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا...... کیا آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے......؟

☆......☆

تیسری سچ بیانی

ابھاگن



محمد اسلم آزاد

بلوچستان سے اندھی محبت کا تحفہ

ایک دوشیزہ کی سچ بیانی

گلاب کے حسین پھول اور مہکتی ہوئی خوشبوؤں سے بجی سیج کے سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن (رفعت) اپنا گھونگھٹ اوڑھے غم سے نڈھال اپنی کلائی میں پہنی ہوئی رنگ برنگی چوڑیوں سے کھیلتی ہوئی ساری دنیا سے بے خبر ہوجاتی، کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے بے اختیار ہنستے ہنستے رو پڑتی تو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے موتی جیسے آنسو اُمڈ آتے اور وہ اپنے مہندی سے رچے ہوئے پیلے ہاتھوں میں انہیں جذب کر لیتی تو اُسے ایک سکون سا ملتا۔ اس کے دل کو راحت سی آجاتی، کیوں کہ اِن آنسوؤں میں اس کی محبتوں، چاہتوں، حسرتوں کا خون شامل تھا۔

وہ سب محبتیں، چاہتیں، حسرتیں کہاں چلی گئیں......؟ وہ پیار کا سماں، خوشیوں کے گیت، شہنائیوں کی آواز کہاں دب کے رہ گئیں......؟

اور یہ فضاؤں میں خاموشی اور سناٹا کیسا ہے......؟

یہ سسکیاں، آہیں اور خون کے آنسو روتی آنکھیں کس کو تلاش کر رہی ہیں......؟

وہ پیار جو کبھی لوٹ کے آنے والا نہیں......!

اس کے انتظار نے ہوش چھین لیے ہوں جیسے زندگی چھین لی ہو جیسے......ایک سیج پر بیٹھی دلہن کی آنکھوں کے سامنے خون سے لت پت، گولیوں سے چھلنی جب اس کا جیون ساتھی لایا جائے تو اعصاب کیوں نہ کام کرنا چھوڑ دیں، ذہن کیوں نہ مفلوج ہو......؟ کلیجہ کیوں نہ منہ کو آئے اور آنکھیں آنسوؤں کے دریا کیوں نہ بہائیں......؟ یہ درد، یہ غم اب رفعت کا مقدر ہیں، جو اپنے نصیبوں پہ پہلے بہت خوش اور نازاں تھی۔

اس کے بوڑھے ماں باپ بھی اپنی بیٹی کی خوشیوں پہ سدا نہال رہتے تھے، مگر اب ان کی آنکھوں میں بھی ایک آنسوؤں کا سیلاب سا رہتا ہے، میں ان کا یہ درد، دکھ محسوس کرتی ہوں اور ان سے گلے مل کر خوب جی بھر کے رونا چاہتی ہوں، مگر مجھ پر ایک سکتہ اور خاموشی سی طاری ہوجاتی ہے۔ میں کچھ کہتے کہتے چپ سی ہوجاتی ہوں۔

اس بات کا احساس شاید رفعت کو بھی ہو، مگر وہ اب ذہنی مریضہ بن کر یہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی کہ اس کے سب خواب، ارمان۔ کیسے ٹوٹ کر بکھر گئے......؟ اس بات کا اندازہ پہلے تو رفعت کو بھی نہیں تھا، مگر میں نے اس کو ایک دن ضرور یہ کہا تھا کہ ”رفعت یہ تم کیسی نادانی کر رہی ہو کہ ایک ٹھیلے والے کے ساتھ تم آنکھیں چار کر کے رفتہ رفتہ اس کے قریب تر ہوتی جا رہی ہو اور کسی اجنبی پر اتنا اعتبار اچھا نہیں کہ جس کے بارے میں تم ذرا بھی نہیں جانتی ہو۔“

میری اس بات پہ وہ کس طرح ہنس کر بولی تھی کہ ”راحیلہ تم کیا جانو اس محبت کو......محبت میں تو ذات پات،

اونچ نیچ، رسم و رواج نہیں دیکھے جاتے اور تم جو اسد کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ وہ بالکل ایسا نہیں۔ ہاں اگرچہ وہ غریب بہت ہے، مگر دل کا بہت امیر ہے اور میرے لیے وہ سب کچھ کرسکتا ہے، حتیٰ کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر بھی تیار ہے، مگر میں نے اس کو ابھی تک منع کر رکھا ہے۔"

یہ سن کر میں چونک سی گئی تھی اور اس سے پوچھنے لگی کہ" کیا اسد شادی شدہ بھی ہے اور تم اس کے باوجود بھی اس سے پیار کرنے کی غلطی کر رہی ہو......؟"

"راحیلہ اس میں غلطی کیسی......؟ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں، مگر اماں جی والوں کی یہ ضد ہے کہ یہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے تو پھر شادی کے بارے میں سوچیں گے۔" رفعت نے بڑے شوخ انداز میں کہا۔ یہ سن کر میں خاموش سی ہو کر رہ گئی۔

کچھ عرصے کے بعد ہم کالج سے نکلے تو کالج کے گیٹ پر ایک نئی کار کھڑی ہوئی تھی۔ رفعت نے گاڑی کو دیکھ کر اس کی جانب رُخ کیا تو میں حیران رہ گئی۔ وہ میری حیرانگی کو دیکھتے ہوئے بولی۔" راحیلہ تم گھبراؤ مت یہ میرا کزن ہے جو لاہور میں پڑھتا تھا۔ اب سے چند دن پہلے یہاں آیا ہے۔" اس دوران ہم گاڑی تک پہنچ گئے تو رفعت نے مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔" جان! اب لوکل بس کے دھکوں سے جان چھوٹ گئی تم آرام سے یہاں بیٹھ جاؤ، ہم تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دیں گے۔" یہ سن کر میں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور رفعت فرنٹ سیٹ پر اس لڑکے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ راستے بھر میں رفعت اور اس لڑکے کے درمیان ہنسی مذاق اور رومانٹک انداز دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کل تو یہ اسد پہ اپنی جان نچھاور کرتی تھی اور اب اس لڑکے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خوش گپیوں میں مشغول ہے۔

اس کے رویے پر مجھے حیرانگی اور بہت افسوس بھی ہوا کہ جب اسد کالج کے قریب لگے ٹھیلے میں فروٹ بیچ رہا تھا اور اس کی نظر ہم دونوں پر پڑی تھی، اس سے پہلے تو ہم اکثر اس کے ٹھیلے کے قریب ٹھہر جاتے تھے یا لوکل بس کے دیر ہونے پر ایک بینچ پر بیٹھ جاتے تھے اور اسد ہم دونوں کی خوب آؤ بھگت کرتا تھا، مگر یہ اچانک کیا ہو گیا......؟

اس وقت اسد پہ کیا بیتی ہو گی جب ہم کار میں بیٹھ کر چلے گئے اور اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

اگلے دن رفعت اسی لڑکے کے ساتھ کالج آئی، فزکس کے پیریڈ کے بعد ہم دونوں کینٹین آئیں تو چائے کے دوران میں نے اس سے پوچھا۔

"رفعت تم اپنے کزن کے ساتھ کل بہت فری



ہو رہی تھیں، آخر معاملہ کیا ہے......؟"

وہ چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ کہ "راحیلہ دراصل تم سچ کہتی تھیں کہ کسی اجنبی کے زیادہ قریب مت جاؤ۔ اب اس نادان اسد کو دیکھو کہ گاؤں جا کر اپنی بیوی کو طلاق دے کر آیا ہے اور اب اس ضد پہ اڑا ہے کہ میں اس سے شادی کروں جب کہ اس بات پہ گھر والے راضی نہیں اور میرا خاموشی سے میرے کزن عاقب سے رشتہ طے کر دیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ عاقب پڑھا، لکھا، سلجھا ہوا، امیر باپ کا بیٹا ہے اور اسد ایک ٹھیلے والا، میں کس طرح اپنی زندگی کو تباہ کروں اس کے لیے......؟"

اس کی یہ بات سن کر مجھے پہلی بار اس پہ بہت غصہ آیا اور میں نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم یہ کیا احمقانہ بات کر رہی ہو کہ اسد نے تمہاری محبت میں اپنا گھر تباہ کر دیا، اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور تم اس کو نادان (پاگل) کہہ رہی ہو۔"

"ہاں اگر وہ پاگل ہوا ہے تو تم نے ہی اس کو پاگل کیا ہے اور اس کی ذمے دار بھی تم ہی ہو۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں رفعت سے کہا۔

میری یہ بات سن کر رفعت غصے سے اٹھی اور بے رحمانہ انداز سے بولی کہ "اسد پاگل ہوتا ہے تو اس کو پاگل ہونے دو، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"

"اچھا تو اب تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں......؟ تمہارا وہ پیار، محبت سب جھوٹ تھا......فریب تھا......؟"

میں نے اس کی لاپروائی سے جل کر اس سے یہ سوال کر دیا۔

"نہ وہ پیار تھا اور نہ محبت۔ بس میری نادانی تھی کہ میں اس سے دل لگا بیٹھی اور اس دل لگی کو میں خواب سمجھ کر بھلا بیٹھی ہوں، کیوں کہ میرے سامنے عاقب کی صورت میں ایک اچھا اور سہانا مستقبل ہے، یہ بے چارہ ایک ٹھیلے والا میرے خواب، میری حسرتیں، میری خواہشیں کیسے پوری کر سکتا ہے......؟" رفعت نے تنگ کر میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

رفعت اس طرح رنگ بدل سکتی تھی، مجھے اس کا اندازہ پہلے کبھی نہ تھا۔ اس لیے میں نے خاموشی کو ہی بہتر سمجھا، مگر ایک دن جب میں لوکل بس سے اتر کر کالج کے اندر جانے لگی تو ایک بھرائی ہوئی آواز سن کر میرے قدم رک گئے۔ "بہن جی آپ رفعت کو سمجھائیں میں نے اس کی محبت میں سب کچھ گنوا دیا، اپنی بیوی کو طلاق دے کر سارے گھر والوں کی ناراضگی اٹھا کر ایسے آیا ہوں کہ بس واپسی کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔"

اسد کی دردمندانہ التجا سن کر مجھے بھی اس کی نادانی اور پاگل پن پہ بہت غصہ آیا کہ وہ اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ کر آیا ہے تو میں اس کی کیا مدد کر سکتی ہوں......؟ لیکن پھر بھی اسے صرف یہ کہہ سکی کہ "آئندہ آپ میرے پاس نہ آئیں اور نہ ہی رفعت سے کوئی امید رکھیں۔" میری بات سن کر وہ ایک بت بن گیا اور میں کالج چلی آئی، مگر اس کے بارے میں رفعت کو کچھ بھی نہ کہا، کیوں کہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ رفعت نے اپنا جو فیصلہ کر لیا تھا، وہ اس سے کبھی پیچھے ہٹ نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ اس کی شادی کے دن بھی بہت قریب آ رہے تھے۔

رفعت اور اس کے گھر والے اس رشتے پر بہت خوش تھے، کیوں کہ عاقب رشتے دار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک امیر گھرانے کا تعلیم یافتہ بیٹا تھا۔

شادی کے دن جوں جوں قریب آتے گئے، گھر میں شور شرابا، تزئین و آرائش بڑھتی گئی۔ دور دور سے رشتے دار بھی آنے شروع ہو گئے تھے۔

دلہن کے لیے سرخ جوڑا، میک اپ، چوڑیاں، بندیا وغیرہ لینا اور اس کو سنوارنا، سجانا میرے ذمے تھا۔ آنٹی کے ساتھ سارا سارا دن بازار میں جہیز اور دلہن کا سامان خریدتے شام ہو جاتی۔ جب ہم تھکے ہارے گھر کو لوٹتے تو رفعت کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر سارے دن کی تھکن دور ہو جاتی۔ کیوں کہ رفعت کی خوشیاں سب کو عزیز تھیں۔ اس سے بڑھ کر میری تو وہ بچپن کی سہیلی تھی۔ اس لیے میں بڑھ چڑھ کر اس کی شادی کے انتظامات کر رہی تھی...... مگر نہ جانے کیوں میرے کانوں میں اسد کی بھرائی ہوئی آواز آ جاتی کہ "بہن جی آپ رفعت کو سمجھائیں کہ میں نے اس کی محبت میں سب کچھ گنوا دیا ہے اور اب گھر واپس جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں۔"

یہ سن کر میں اداس سی ہو جاتی اور میرے دل میں ایک عجیب سا خوف پیدا ہو جاتا۔ سیج پر بیٹھی دلہن رفعت کے ارد

گرد مہکتے ہوئے پھول مرجھائے ہوئے دکھائی دیتے، اس کا گھونگھٹ اور عروسی جوڑا بے رنگ سا نظر آتا تو میرے دل سے اس کے لیے ڈھیروں دعائیں نکلتیں کہ وہ سدا خوش و خرم اور سہاگن رہے، اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔ انہی دعاؤں میں شادی کا دن بھی آ گیا۔ شام کو گھر میں بارات آئی تھی، میں رفعت کے ساتھ بیٹھی اس کو چھیڑ رہی تھی کہ اب تم شادی کے بعد ہم غریبوں کو بھول جاؤ گی۔

وہ گھونگھٹ میں اپنا چاند سا مکھڑا چھپائے خاموش بیٹھی تھی کہ اماں جی کی موبائل پر کال آئی کہ ”چند منٹوں کے لیے گھر سے ہو کر جاؤ۔“ یہ سن کر میں باہر آئی تو دور سے ڈھول اور شہنائیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں بڑے قدم اٹھاتے اٹھاتے گھر آئی تو اماں نے مجھے دولہا اور دلہن کے لیے دو جوڑے دیے۔ جنہیں لے کر میں باہر آئی تو بارات نزدیک آ چکی تھی، میں دولہے میاں کو دیکھنے کے لیے دروازے کے باہر ٹھہر گئی۔ ابھی وہ قریب ہی آئے تھے کہ ایک چھوٹی گلی سے ایک اسلحہ بردار شخص آیا اور اس نے دولہے کے سینے میں گولیوں کے وار کر دیے اور پھر ہوائی فائرنگ کرتا ہوا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، مگر میں نے اس کو بخوبی پہچان لیا، وہ اسد ہی تھا جو اپنی برباد زندگی کا بدلہ لے کر عاقب کی زندگی سے کھیل گیا تھا۔ اس کی خوشیوں کے گیت اب ماتم میں بدل چکے تھے، ڈھول اور شہنائیوں کی آواز دب چکی تھی۔

خون سے لت پت، گولیوں سے چھلنی لاش جب رفعت کے گھر آئی تو ایک کہرام سا مچ گیا۔ اس ہولناک واقعے پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ میں دوڑی دوڑی رفعت کے پاس آئی تو وہ ایک زندہ لاش بن چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے خون کے آنسو اور دل کو دہلا دینے والی ہنسی اس کے اڑے ہوئے ہوش و حواس کا پتا دے رہے تھے۔ اس وقت اس کے پیلے ہاتھوں میں اس کے ارمانوں کا خون نظر آ رہا تھا اور اس کی خون روتی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں، مگر وہ پیار بھی لوٹ کے آنے والا نہیں تھا اور جو اس کا پہلا پیار تھا وہ اس کو ذہنی مریضہ اور ابھاگن بنا کر اسے اپنے پیار کا تحفہ دے گیا تھا۔ اگر اس سے قبل رفعت اسے بے وفائی کا تحفہ نہ دیتی تو شاید آج اس کے سب خواب ٹوٹ کر بکھرے نہ ہوتے اور نہ دولت سے خریدا ہوا تحفہ اسے اتنا مہنگا پڑتا۔

☆……☆

چوتھی سچ بیانی

زنجیر ٹوٹ گئی

نسیم سکینہ صدف

آشنا کے لیے، اپنا بستا بستا آشیانہ چھوڑ کر

بھاگنے والی ایک عورت کی سچ بیانی، ڈسکہ سے

"**نوشین**......! تم شہر کے جنگل میں مجھ سے الگ ہو کر اتنی تنہا نہ گھوما کرو۔ برے وقت کا کوئی پتا نہیں' کیا خبر کسی جھاڑی یا کسی گاڑی کی اوٹ سے چار پہیوں سے چلتا کوئی بلا وا' چھلاوا آئے اور تمہیں دن دیہاڑے پکی سڑک پر گرا کے کچا کھا جائے۔"

میری بے بسی قابلِ رحم ہے جو کچھ محسوس کرتی ہوں اور کہنا چاہتی ہوں' الفاظ کی شکل میں ڈھل کر اس کی حقیقت اور خوب صورتی نا تمام رہ جاتی ہے۔ اس وقت میرے قریب کوئی نہیں' صرف میری ذات ہوتی ہے جس میں اتنی قدرت نہیں رہتی کہ حلق میں پانی بھی ٹپکا سکے۔ چارپائی پہ دھرے پاؤں میں پڑی زنجیر چھت کے شہتیر سے بندھی تھی اور نوشین کا مسکراتا چہرہ بس وعدے پہ وعدہ کیے جا رہا تھا۔

"دیکھو' میری جان! جو ہوا' اس پہ خاک ڈالو۔ چھوٹے بڑے بچوں کا ساتھ ہے۔ میری محبت ہے۔ جو بھی تم کر چکی ہو' چھوڑ دو' بس ایسا کرو' اب گھر کی طرف توجہ دو' بچوں کو سنبھالو' ننھا انصر جو تمہارا دودھ پیتا تھا' تمہارے جانے سے اس نے بوتل میں دودھ پینے سے بھی انکار کر دیا تھا' ضدی ہو گیا تھا' روتا ہی رہتا تھا۔ عروہ نے جانے کیسے کیسے جتن کر کے اسے منایا اور وہ دو گھونٹ دودھ پی کے پھر سے ایسے چیخ چیخ کے رونے لگتا جیسے اسے ماں کی یاد شدت سے آ رہی ہو۔ نوشین! تم ماں ہو ان سب بچوں کی۔ تمہارے سائے کی انہیں شدید ضرورت ہے۔ میں سب معاف کر دوں گا' لوگ چاہے مجھ سے تمہارے بارے میں کچھ بھی کہیں کہ تمہاری بیوی ایسی ہے' ویسی ہے' میں ایک کان سے سنوں گا اور دوسرے سے نکال دوں گا۔

ہم پھر سے نیا آشیانہ آباد کریں گے۔ بھول جائیں گے کہ کبھی ہمارے درمیان کوئی خنزیر آیا تھا۔" اور نوشین مسکرا مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتی رہی اور تابش نے جان لیا کہ نوشین اب سیدھے راستے پر آ گئی ہے۔

تیرہ سالہ بیٹی کا نکاح تابش نے اپنی بہن کے بیٹے سے کر دیا تھا اور اسے اپنے گھر ہی میں رکھ لیا تھا۔ وہ بھی انیس برس کا نوجوان تھا جو کہ سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا تھا کہ عروہ بہن بھائیوں کو بھی سنبھال لیتی اور اپنے شوہر کا بھی خیال رکھ لیتی۔ چھوٹی عمر میں ماں عذاب لمحے معصوم کے سر پر ڈال کر جو چلی گئی تھی تو نبھانا تو تھا ناں۔

دانش' عروہ سے چھوٹا بیٹا وہ ماں کی زنجیر اتارنے کی کوشش کرتا مگر تابش اسے آنکھ کی جنبش سے منع کر دیتا۔ اس کے اندر ابھی وسوسے پل رہے تھے۔



ذلت بھی تو نوشی نے اسے بہت دلائی تھی۔ پچھلی گلی میں رہنے والے خود سے دس سالہ چھوٹے زمان کے ساتھ بھاگ کے! اسے چھوٹا بھائی، چھوٹا بھائی کہتے کہتے اس کی زبان سوکھتی تھی اور ذلت کا ڈیڑھ ماہ گزار کر تابش نے جب اسے برآمد کیا تو وہ شوہر کے پاؤں پڑ گئی اور مگرمچھ کے آنسو بہا کر اسے رام کرلیا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھ پہ اس کنجر نے جانے کون سے تعویذ کیے تھے کہ میری مت ماری گئی اور میں کیسے اپنا ہنستا بستا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

بس تابش سے غلطی یہی ہوئی تھی کہ کام کی مصروفیت میں وہ بیوی کو بہت کم وقت دے پاتا حالانکہ وہ نت نئے ڈیزائن کے کپڑے اس کے لیے لاتا، جیولری، میک اپ، ہر چیز اسے دستیاب ہوتی۔ مہندی ہر وقت دلہنوں کی طرح اس کے ہاتھوں پہ سجی رہتی اور وہ بڑی خوش خوش رہا کرتی۔

جانے کیسے زمان کا ان کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا اور اس نے نوشین کی کمزوری جان کر اسے کچھ آسودہ لمحات دینا شروع کردیے اور نوشین اس کی بے دام غلام بن گئی۔

وہ اس کے لیے دیسی مرغ بنا کے رکھتی اور اپنے بدن کو خوشبو میں بسا کر اس کا انتظار کیا کرتی۔

زمان، تابش کے گھر سے جاتے ہی آجاتا۔ محلے کی عورتیں اپنے اپنے گھروں میں کام دھندوں میں مشغول ہوتیں اور نوشین اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہو رہی ہوتی۔

•......•......•......•

جب تابش کو اڑتی اڑتی سن گن ملی تو اس نے اس کا آنا جانا بند کروایا تو ریشماں نے منہ سے اس کی مخالفت نہ کی لیکن اندر سے وہ کسی اور فیصلے کے آخری مراحل میں تھی۔

آخر ایک دوپہر کو سب محو خواب تھے اور وہ غائب......

•......•......•......•

پچھلی گلی میں زمان اکیلا رہتا تھا۔ وہ مزدوری کے سلسلے میں ڈسکہ میں مقیم تھا' گھر والے ملتان کے کسی پس ماندہ گاؤں کے رہنے والے تھے۔

تابش غصے سے پاگل ہوگیا' اسے جہاں جہاں ڈھونڈا گیا' ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ادھر اکیلے گھر میں جوان بیٹی کی حفاظت کرنا بھی بڑا کٹھن مرحلہ تھا اور پھر جس بیٹی کی ماں یہ قدم اٹھا چکی ہو اس کی بیٹی پر الزام لگتے دیر نہیں لگتی۔

نوشین کی تلاش کی تھکن نے تابش کو لوگوں کی تجویز پر عمل کرنے پر مجبور کردیا۔ بھانجا ابھی پڑھ رہا تھا' اسی سے تیرہ سالہ عروہ کا نکاح کردیا۔

نا مہندی لگی' نا ڈھولک کی تھاپ پڑی اور وہ کسی جنازے کی طرح سرخ جوڑے میں لپٹی بڑے کمرے میں بہن بھائیوں کے ساتھ سونے کی بجائے ایک الگ کمرے میں ضیغم کے ساتھ سوگئی۔

نہ جذبوں کا علم نہ ازدواجی زندگی کے تقاضوں کی خبر...... غرض ماں کے جرم میں بیٹی بلی چڑھ گئی......

تابش نے کوشش ہنوز جاری رکھی' دن رات ایک کر کے تلاش میں اپنے روزگار کا ناس مار لیا۔ ذات کا جٹ تھا' زمینوں کو وقت بے وقت پانی سے محروم رکھ کر فصل کچھ ہری اور کچھ سوکھ کے تباہ کرکے نوشین کو بالآخر ڈھونڈ ہی نکالا۔

اس نے اپنے شوہر کے سامنے تو عہد کرلیا کہ اب وہ کبھی اپنی جنت کو چھوڑ کے نہ جائے گی۔

کٹی پتنگ اور گھر سے بھاگی عورت کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سب ہی اس کو لوٹنے کے لیے بھاگ پڑتے ہیں۔

تابش' نوشین سے بہت پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں کرکے بڑے دنوں بعد سکون کی نیند سویا۔

بچے بڑے خوش تھے' چھوٹا تو اس کی چھاتیوں سے لپٹ کر سو رہا تھا اور سوتے میں ایسے چسر چسر کر رہا تھا جیسے ابھی بھی ماں کا دودھ پی رہا ہو۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو سب سے پہلے تابش نے انگڑائی لیتے ہوئے پیار کی نظر اپنی بیوی کی چارپائی پہ ڈالی تو شہتیر سے بندھی زنجیر جھول رہی تھی اور نوشی کا بستر خالی تھا۔ بچہ سو رہا تھا۔ تابش سر تھام کے رہ گیا۔

نوشین ایک بار پھر اسے دھوکا دے کر جا چکی تھی۔

☆☆



پانچویں سچ بیانی

اُٹھ باندھ کمر...

محمد مدنی فدا

ملتان سے ایک نوجوان کی داستان، مایوسی کے

اندھیرے میں جسے امید کی کرن نظر آ گئی تھی

صبح کے 7 بجنے کو تھے۔ اپریل کی آخری تاریخوں کا نیم گرم سورج مشرق سے افق پر نمودار ہو رہا تھا۔ پرندے رزق کی تلاش میں گھونسلوں سے نکل کر میدانوں اور کھیتوں کا رُخ کر رہے تھے۔ اسکول جانے والے بچے بغلوں میں بستہ دبائے اٹھکیلیاں کرتے لڑتے جھگڑتے ہوئے اسکول جا رہے تھے۔ کھیتوں میں کسان گندم کی کٹائی میں جُتے ہوئے تھے اور چھوٹے سے گاؤں میں دو کمروں کے کچے گھر میں رہنے والی سدرہ آج معمول سے ذرا پہلے ہی جاگ گئی تھی، کیوں کہ اُس کے ننھے، لاڈلے پانچ سالہ اکلوتے بیٹے نے آج پہلی دفعہ اسکول جانا تھا۔ بچے کی تیاری کروانا تھی، یونی فارم پہنانی تھی، اور ناشتا تیار کرنا تھا۔ اس لیے وہ منہ اندھیرے ہی اُٹھ گئی تھی۔ بچے کو تیار کر کے اب وہ کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی کہ اُس کو یاد آیا کہ اس کا خاوند فرہاد تو ابھی تک نہیں اُٹھا اور وہ تو ابھی تک بستر پر ہی ہے۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے سدرہ اُس کو کمرے میں جا کر خود ہی جگا کر آئی تھی۔ اب کی بار اُس نے کچن سے ہی اُسے آواز دی، لیکن جب فرہاد کا کوئی جواب نہیں آیا تو اُس نے ناگواری کے تاثرات لے کر کچن سے نکل کر کمرے کی راہ لی اور وہ وہیں سے ہی آواز کستی ہوئی گئی۔

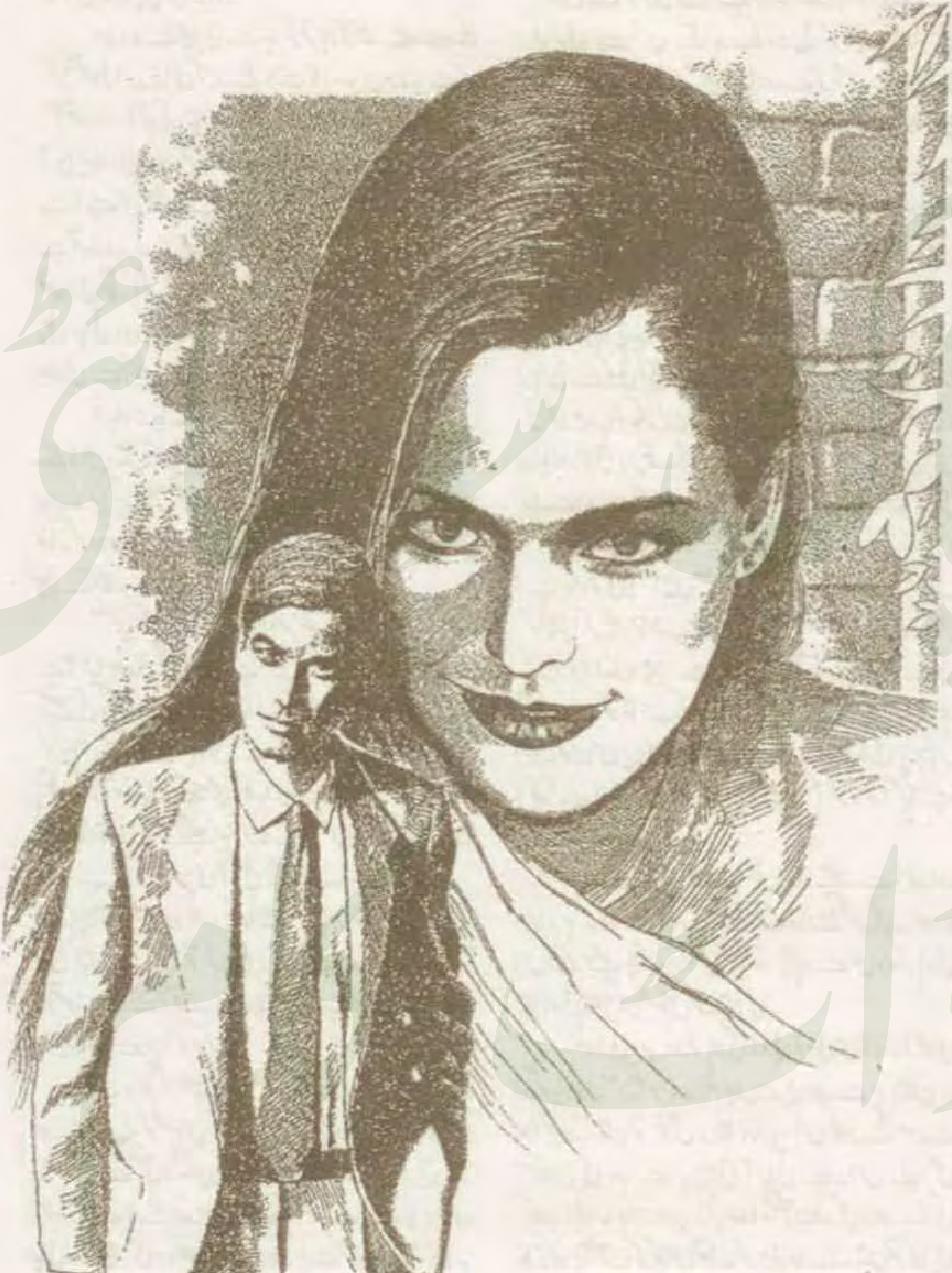
"ارے فرہاد! اُٹھ جاؤ، کافی دیر ہو گئی ہے۔ بچے کو اسکول داخل کروانے بھی جانا ہے۔ جلدی سے اُٹھو، سائیکل تیار کر لو، ناشتا تیار ہے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ کمرے کے دروازے پر پہنچی تو یہ دیکھ کر ہی خاموش ہو گئی کہ اس کا خاوند بستر سے نکل کر بیڈ پر سَر پکڑ کر گم صم بیٹھا ہے اور خاموشی سے خالی نگاہوں سے اپنے قدموں کو ٹکٹکی باندھ کر تک رہا ہے۔ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ اُس کو کمرے میں بیوی کی آمد کا احساس تک نہ ہوا اور سدرہ کو بھی احساس ہوا کہ فرہاد نے اُس کی آواز پر کوئی دھیان نہیں دیا، جیسے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ سدرہ جو کچن سے غصے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی، لیکن شوہر کو ایسے گم صم بیٹھا دیکھ کر چُپ کر گئی۔ وہ اسے اس حال میں دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی اور سوچنے لگی تھی اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟

گزشتہ چند دنوں سے اُداس اُداس سا رہتا ہے۔ اب تو میری بھی پروا نہیں کرتا، حالاں کہ سدرہ کی آواز پر آہیں بھرنے والا فرہاد، سدرہ کے معصوم خوب صورت چہرے کی تمازت دیکھ کر بہار کے رنگ بھول جانے والا فرہاد، کیسی ہی پریشانی کیوں نہ ہو، بیوی کی صحبت میں شاد ہو جانے والا فرہاد۔ خدا جانے آج کل فرہاد کو کیسی فکر

آ گئی تھی کہ اپنی بیوی کی آواز، جس کو وہ کسی پادری کا بلاوہ سمجھتا تھا، اَن سنا کر دیا اور سدرہ کے قدموں کی وہ آہٹ

جو فرہاد کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیا کرتی تھی، آج انہی قدموں کی آمد سے بھی فرہاد کو کچھ نہ ہوا۔ یہاں



تک کہ سدرہ کو محسوس ہوا کہ اس کے خاوند نے جیسے اُس کے بلاوے سُنے ہی نہ ہوں، جیسے اس کی آہٹ اُس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔

سدرہ نے تیزی سے جا کر فرہاد کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور تیزی گزرتے وقت کا احساس دلایا ہے کہ "اُٹھو...... اُٹھ کر تیار ہو جاؤ۔ بچے کا داخلہ کروانا ہے۔ آج پہلا دن ہے، تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ ہفتہ ہو گیا ہے، ایسے ہی ٹال دیتے ہو، روزانہ کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے تمہارا۔ اب بھلا اتنی لاپروائی بھی کوئی کرتا ہے؟ تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو پہلی فرصت میں ہی اسکول چلی جاتی اور اسے داخل کرا کے آجاتی۔ اب دیر نہ کرو جلدی سے اُٹھو۔ ناشتا تیار ہے، تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

فرہاد نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کیا پریشانی تھی اس کے ذہن میں کہ اس کو وقت کا احساس بھی نہ ہوا۔ خدا جانے کیا فکر لاحق تھی۔ جو کچھ بھی تھا ذہن میں، اچھا نہیں تھا۔ گردونواح سے بے خبر، سر پکڑ کر بیٹھا تھا تبھی تو بیوی پر چلّانے لگا۔

"کیا کرنے آئی ہو ادھر کمرے میں؟ کیا کام ہے؟ کیا جلدی لگی ہوئی ہے تمہیں ابھی سے اسے اسکول بھیجنے کی، گھر پر اچھا نہیں لگتا کیا؟ ابھی تو معصوم ہی ہے۔ کون سی عمر گزرتی جا رہی ہے، بچہ ہی تو ہے اور پھر مجھے پاگل سمجھتی ہو کیا۔ مجھے بھی احساس ہے اس کا۔ میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ کس وقت کرنا ہے؟ مجھے سب پتا ہے، بڑی آ گئی مجھے بتانے والی۔ جاؤ...... جا کر اپنا کام کرو اور پھر دیکھا نہیں کہ باہر موسم ٹھیک ہے۔ آج نہیں جائے گا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔" پھر تھوڑے سے توقف سے بولا۔ "اب کھڑی کیوں ہو؟ جاؤ یہاں سے اپنا کام کرو۔"

سدرہ جو گزشتہ چند ہفتوں سے فرہاد کے بدلتے ہوئے رویّے کو محسوس کر رہی تھی۔ فرہاد کی ساری باتیں خاموشی سے سنتی، لیکن اسے کوئی جواب نہیں دیتی اور آہستہ سے الٹے قدموں چل کر کمرے سے باہر نکل جاتی۔ آج بھی وہ تھوڑی دیر بعد پلٹ کر واپس آ گئی یہ سوچ کر کہ شاید فرہاد کے بدلے رویّے کی وجہ کوئی جان سکے کہ کون سی ایسی چیز ہے جس نے فرہاد کو بددل کیا ہوا ہے۔ وہ جا کر چپکے سے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور پھر بہت ہی محبت اور چاہت کے ساتھ فرہاد کے چہرے کو مضبوطی سے مگر نرمی سے اپنے دراز شگفتہ ہاتھوں میں لے کر نرمی سے اُس کے بدلے رویّے کا محبت بھرا شکوہ کرتے ہوئے بولی۔ "ایسا کیا ہوا ہے کہ جس سے وہ آج کل روٹھا روٹھا سا رہتا ہے۔ گھر کے معاملات پر دھیان نہیں دیتا اور تو اور اب تو بچے کے ساتھ بھی اس نے اپنا رویہ ترش کر لیا ہے، شام کو دیر سے گھر واپس آنا، رات دیر تک جاگتے رہنا...... آخر ایسا کیا ہوا ہے جو اتنا مایوس رہتے ہو۔"

فرہاد چُپ چاپ اس کی تمام باتیں سنتا رہا اور اپنی زبان سے کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا، پھر آرام سے سدرہ کی کلائیوں کو پکڑ کر اپنے چہرے سے اس کے ہاتھوں کو ہٹایا اور کافی دیر تک اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے سدرہ کے چہرے کو گھورتا رہا۔ کبھی غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا تو کبھی گول گول چہرے کو۔ سدرہ کو اپنے خاوند کی آنکھیں مضطرب سی لگیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو چھڑا کر پھر مخاطب ہوئی۔ "اتنا مضطرب کیوں۔ آخر کون سی ایسی چیز ہے جس نے تمہارے چہرے کی مسکراہٹ کو غائب کر دیا ہے، کیوں پریشان رہتے ہو اتنا۔ کون سی پریشانی لاحق ہے۔ اب تو تمہاری پریشانی دیکھ کر میرا دل بھی بجھا سا رہتا ہے۔ آخر ماجرا کیا ہے، کچھ تو بولو۔"

فرہاد جو ابھی تک خاموش تھا، چپکے سے اُٹھا اور دیوار پر لگے شوکیس کے شیشے کے سامنے ٹھہر گیا۔ سدرہ اس کے پیچھے پلنگ پر بیٹھی تھی اور پیچھے سے ہی وہ فرہاد کی تیز ہوتی دھڑکن محسوس کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد فرہاد کی ڈوبی ڈوبی سی آواز اُبھری وہ گویا ہوا۔ "دیکھو سدرہ تم یوں میری وجہ سے پریشان نہ ہوا کرو۔ میں تو خوش رہتا ہوں، بس چھوٹے موٹے مسئلوں کی وجہ سے پریشانی آجاتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھار الجھ سا جاتا ہوں۔ تم سدا چہکتی پھدکتی رہو۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں تھک کر بیٹھ جائے۔ میں تم کو اپنی وجہ سے پریشان ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے، میری خوشیوں کی حد ختم ہو گئی ہوگی، شاید اسی لیے

ہنسنا چاہوں تو بھی ہنسی آ کر ہونٹوں پر ساکن ہو جاتی ہے اور غم چہرے کو گھیر لیتا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو خدا بھلا کرے گزرتی خوشی کے ساتھ ساتھ زندگی بھی جلد ہی ختم ہو جائے گی، پھر غم سے بھی جی چھوٹ جائے گا۔ نہ رہے گا چہرہ میرا، نہ چہرے پر غموں کے منحوس سائے، پھر تم کو نہ تو میرا غمزدہ چہرہ نظر آئے گا اور نہ ہی کوئی غم۔ بہت خوش رہو گی تم، میں نے تو یہی سوچ لیا ہے۔ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے، بہت خوش رہو گی تم سدرہ، بہت خوش۔"

فرہاد کا ایک ایک لفظ مایوسی میں ڈوبا ہوا تھا اور فرہاد کے منہ سے نکلے ہر اک لفظ کا لہجہ سدرہ محسوس کر رہی تھی۔ سدرہ نے اپنے خاوند کی باتوں کے اندر قیامت خیز مایوسی کو جان لیا تھا، لیکن اس کی سمجھ پھر بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یک دم اتنی مایوسی کیوں؟

خدا جانے فرہاد ابھی اور کیا کچھ کہتا کہ سدرہ نے ٹوک دیا اور بولی۔ "خدارا ایسے نہ بولو، کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟ آخر میں بھی تمہاری شریک سفر ہوں۔ مسئلہ کیا ہے؟ کچھ بتاؤ گے، کچھ شیئر کرو گے تو وزن ہلکا ہو جائے گا۔ اب زیادہ ضد نہ کرو اور بتاؤ کیا ماجرا ہے کہ اتنا مایوس ہوئے بیٹھے ہو۔"

"کیا پوچھنا چاہتی ہو؟ کیا بتاؤں؟ تم کیوں پوچھتی ہو۔ میری زندگی ہے۔ گزر رہی ہے، گزر جائے گی میں جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔ تم میری فکر نہ کیا کرو۔ تم کو تو کوئی پریشانی نہیں، گھر کے بھی انتظامات ٹھیک چل رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ دو وقت کا کھانا میسر ہے، رہنے کے لیے چھت ہے، پہننے کے لیے بھی تمہیں اچھا مل جاتا ہے، پھر تم کو کیا پریشانی۔ تم گھر کے معاملات سنبھالو۔ بچے کی تربیت بہتر انداز میں کرو۔ گھر کے باہر کے مسائل کے بارے میں تم اپنا دماغ کیوں چلاتی ہو۔ تم کو تو ہر چیز مل جاتی ہے، پھر تمہیں کیوں پریشانی۔ تم میرے کام میں دخل اندازی نہ کرو اور اپنے کام پر دھیان دو......"

فرہاد نہ جانے اور کیا کیا کہتا رہا۔ سدرہ کو کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پیار کرنے والا خاوند، اس سے گہری محبت رکھنے والا فرہاد نہ جانے آج اتنا خود غرض اور لاپروا کیوں بنا بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے تو فرہاد نے کبھی تلخ لہجہ نہیں اپنایا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سدرہ کے پاس آ کر ہر غم بھول جاتا تھا۔ جب بھی جس وقت بھی تھکان سے ٹوٹا ہوا گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا، تو بیوی کی صحبت میں ہر غم، ہر تھکان بھول جاتا تھا۔ بیوی کی زلفِ گرہ گیر میں قید ہو جاتا اور یہ قید اُس کو زندگی کے مصائب سے آزاد کر دیتی تھی۔ بیوی کی دل آویز خوش آمدید کہتی مسکراہٹ اس کی تھکاوٹ کے لیے ہمیشہ بہار ثابت ہوتی، لیکن آج کیا ہوا تھا کہ فرہاد ایسی عجیب باتیں کر رہا تھا۔

سدرہ جو کمرے میں فرہاد سے اداسی کا سبب جاننے کی غرض سے پلٹی تھی، فرہاد کے ترش لہجے کی وجہ سے خود اُداسی کے گرداب میں آ گئی۔ مایوس سی ہو گئی اور خفا ہو کر بولی۔ "نہ بتاؤ کچھ۔ میں کچن میں تمہارے لیے ناشتا لینے جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر سدرہ کمرے سے نکل گئی اور فرہاد اندر کمرے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ کر کمرے کے اندر رکھے واٹر کولر سے پانی نکال کر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر تازہ دم ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سدرہ فرہاد کے لیے ناشتا تیار کر کے لے آئی اور پھر دونوں مل کر ناشتا کرنے لگے۔ اس دوران وہ ایک دوسرے کے چہرے پر دوڑتی عجیب سے احساس کی پرچھائیاں محسوس کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد جب ناشتا ختم کر کے بیٹھے تو سدرہ نے ایک دفعہ پھر اُداسی کی وجہ پوچھی۔ جس کے جواب میں فرہاد پہلے تو چپ رہا، پھر جیسے پھٹ پڑا ہو۔ آواز میں کرب بھر آیا اور شدتِ کرب کے ساتھ گویا ہوا۔ "کیا بتاؤں تمہیں سدرہ؟ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟ یہی بتاؤں کہ زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مہنگائی بہت ہے، بچے کو اسکول داخل کروانا ہے، لیکن پیسے نہیں ہیں کتابوں کے، تین سال ہو گئے ہیں ڈگریاں لے کر سارے شہر کے تمام دفاتر کے چکر کاٹ رہا ہوں، کوئی نوکری نہیں ملتی۔ جہاں جاؤ وہاں سفارش طلب کرتے ہیں۔ سفارش نہیں ہے تو پھر رشوت، اب بھلا کہاں سے لاؤں رشوت اور پھر غریب کسان کا بیٹا ہوں۔ کوئی Social Status نہیں ہے، کس کی سفارش کرواؤں۔ بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہ ڈگریاں نہ

ہوں کوئی خالی کاغذ ہوں، جیسے کورے صفحے ہوں۔ ابا کی وفات کے بعد بھائیوں نے بھی علیحدہ کر دیا ہے اور اُدھار ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اپنی تو خیر جیسے تیسے گزر رہی ہے اور گزر ہی جائے گی، لیکن مجھے تو تمہاری اور سب سے بڑھ کر ننھے کی فکر رہتی ہے۔ روزانہ شام کو خالی ہاتھ لوٹتا ہوں۔ بچہ کھلونے طلب کرتا ہے اور میں روزانہ اگلے دن پر ٹال دیتا ہوں۔ مجھ سے یہ مفلسی دیکھی نہیں جاتی۔ بچے کی آنکھوں میں دم توڑتی، مرتی ہوئی خواہشات دیکھ کر میرا دم گھٹتا ہے، جی بھر آتا ہے۔ میں تنگ آ گیا ہوں ایسی زندگی سے، اُکتا گیا ہوں، دل کرتا ہے کہ اس زندگی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔"

سدرہ خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہے۔ کیسے تسلی دے اپنے خاوند کو۔ بات تو فرہاد کی بھی ٹھیک تھی اور سدرہ خود بھی گھر کی مفلسی سے باخبر تھی اور کافی فکر مند بھی، لیکن خاوند کی طرح مایوس نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح امید کی کرن سے بندھی ہوئی تھی، جیسے کہ مستقبل کے نقشے میں اس نے بہتری کی کوئی صورت دیکھ لی ہو اور پھر اُس کو اپنے خاوند کی صلاحیتوں پر بھی پورا بھروسا بھی تو تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ بہت جلد تمام معاملات کی ڈور سلجھ جائے گی۔ بس اِک موقع کی دیر ہے کہیں سے بھی، جیسے تیسے کوئی موقع مل جائے، پھر فرہاد اپنی قابلیت کی بنیاد پر سب کچھ سنبھال لے گا، کیوں کہ فرہاد کی تعلیمی اسناد کے ساتھ ساتھ اس کی بہترین کارکردگی کی اسناد اس کی قابلیت کا ثبوت تھیں۔

سدرہ جو حالات سے خود بھی پریشان تھی، فرہاد کی مایوسی سے کچھ زیادہ ہی رنجیدہ ہو گئی۔ آج سے پہلے فرہاد نے اتنا مایوسی کی کوئی بات نہ کی تھی اور پھر آج تو زندگی سے ہی مایوس ہوا بیٹھا تھا۔ فرہاد نے زندگی کے خاتمے کی بات کی تو گویا سدرہ دہل کر رہ گئی، پھر سدرہ کافی دیر توقف کے بعد بولی۔

"دیکھو فرہاد۔ اتنی مایوسی والی باتیں نہ کرو۔ دن پھریں گے سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے بھی حالات کا اندازہ ہے۔ لیکن اس طرح سر جوڑ کر بیٹھنے سے کیا حاصل۔ ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ اپنی صلاحیتوں پر بھروسا رکھو اور ہمیشہ امید کی رسی سے جڑے رہو۔ ایسے مایوس رہتے ہو تو میرا جی بھی ہلکان رہتا ہے اور پھر بچے کی تربیت پر بھی اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جیسے تیسے کر کے گزارا ہو رہا ہے، ساری بنیادی ضروریات زندگی پوری ہو رہی ہیں اور خدا کرے گا ہوتی رہیں گی۔ بس ذرا سنبھل کے چلنا ہوگا۔ حالات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دو۔ تمہارے ہر کام کا ہم پر اثر ہوتا ہے۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جائے تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم کیا کریں گے۔"

فرہاد بہت ہی ٹوٹے دل سے سدرہ کی باتیں سنتا رہا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "کب تک امید لگاؤں؟ کس سے لگاؤں اور کب تک بہتری کی امید لگائے جی ہلکان کرتا رہوں۔ سارے کام کر کے دیکھ لیے، مگر بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس زندگی سے اُکتا گیا ہوں۔ اب موت ہی بچی ہے۔ مر جاؤں گا تو آزاد ہو جاؤں گا اس جھنجھٹ سے۔" یہ کہتے کہتے فرہاد کی ہچکی بندھ گئی۔ تو سدرہ گویا ہوئی۔ "خدارا فرہاد ایسی باتیں نہ کرو۔ ہر حالت میں خدا پر بھروسا رکھو۔ زندگی کئی رنگ بدلتی ہے۔ اگر آج سیاہ ہے تو کل سفید ہو کر رہے گا، یوں مزاج ہلکان نہ کرو۔ روزمرہ کے معمولات پر دھیان دو۔ ہر حالت میں خدا کی مدد کا یقین کرو، اس طرح مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ خدا کرے گا سب معمول پر آ جائے گا اور پھر ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ آزماتا ہے انسان کو۔ کبھی رزق دے کر تو کبھی سب کچھ چھین کر، ہر وقت کو خدا کا امتحان سمجھو، عنایت سمجھو، جس طرح بچپن کے بعد لڑکپن اور عمر میں پختگی آتی ہے، ویسے ہی ہر برے وقت کے بعد اچھا وقت ضرور آتا ہے۔ فرہاد بس صبر کرو اور خدا پر کامل بھروسا رکھو۔"

فرہاد یہ ساری باتیں سُن کر جھنجلا گیا اور سدرہ پر برس پڑا۔ "ہارے ہوئے حوصلوں اور ہر روز نئے سرے سے مُردہ امیدوں کو پھر سے زندہ کر دکھانے کے جھوٹے بہکاووں سے جی اُکتا گیا ہے۔ جو قسمت میں لکھ دیا گیا ہے وہ تبدیل نہیں ہونے والا۔ میں اب ہر نئی صبح نت نئے بہانوں اور جھوٹی تسلیوں سے خود کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں اب مفلسی کے دن نہیں

دیکھے جاتے۔ زندگی میں تو کوئی اور کام اپنی مرضی ومنشاء کا نہ ہوسکا زندگی گزار اپنی مرضی سے نہیں سکتے تو کیا زندگی کا خاتمہ تو اپنی پسند کا کر سکتے ہیں ناں۔"

فرہاد کا ہر لفظ سدرہ کے کانوں میں صور کی آواز کا اثر بھر رہا تھا۔ اُس کا شوہر اپنی زندگی کے خاتمے کی بات کر رہا تھا۔ اس کی قوت سماعت معذور ہوتی جارہی تھی، لیکن پھر بھی وہ حواس پر قابو رکھے ہوئے تھی۔ اس کو خدا پر بھروسا تھا۔ سدرہ کو اچھے وقت کی یقین کی حد تک امید تھی۔ اسی لیے وہ اپنا خاوند کو بار بار سمجھا رہی تھی۔ کچھ دیر سوچتے ہوئے سدرہ پھر سے مخاطب ہوئی۔ "تمہیں وہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی جو میں بتا رہی ہوں۔ تم باصلاحیت ہو اپنی صلاحیتوں پر اعتبار کرو۔ روز مرہ کے معمولات پر دھیان دو۔ بگڑے ہوئے حالات پر اپنی گرفت ڈھیلی کر کے حالات مزید تنگ نہ کرو۔ خدا کرے گا سب معمول پر آجائے گا، بس صبر اور ہمت کی ضرورت ہے۔ بار بار بار زندگی کے خاتمے کی بات کیوں کرتے ہو۔ سدرہ بولتی چلی گئی۔ تم مرجاؤ، لیکن کبھی یہ سوچا ہے کہ تمہارے بعد ہمارا کیا ہوگا۔ بچے کدھر جائیں گے۔ میں کیا کروں گی۔ ہمارا سہارا کون بنے گا۔ ہم کس سے امید لگائیں گے۔ یا پھر ایسا کرو۔ پہلے ہمیں ماردو۔ ہمارا خاتمہ کردو۔ ہماری وجہ سے ہی فکر مند رہتے ہو، ہاں تم آزاد ہوجاؤ گے ہماری فکر سے۔ پھر تم جو جی میں آئے کرتے رہنا۔ میں کچھ نہیں کہوں گی تمہیں۔"

بولتے بولتے سدرہ کی آواز مدھم ہوتی گئی اور الفاظ ہونٹوں پر آ کر سر پٹخنے لگے۔

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟ تمہارا کیا ہے چلی جانا میکے، تمہارے بھائی زندہ ہیں۔ ابا تمہارے حیات ہے، بہت خیال رکھیں گے تمہارا۔ میں نے تو بس فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے "خودکشی" کرلینی ہے۔ مجھ سے مزید تنگدستی برداشت نہیں ہوتی۔ تم بس میکے چلی جانا۔ بہت خوش رہو گی تم۔ میں بہت جلد ہی خودکشی کر رہا ہوں، مرجاؤں گا۔"

اب تو فرہاد نے واضح الفاظ میں ہی کہہ دیا تھا۔ سدرہ کا دماغ یہ سن کر سن ہوا جارہا تھا۔ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اب فرہاد کو کیا سمجھائے اور کیسے سمجھائے۔ کتنا آسانی سے کہہ دیا کہ خودکشی کرلوں گا، مرجاؤں گا۔ جیسے فرہاد کو اس کی کوئی فکر ہی نہ ہو، بچے کا کوئی دھیان ہی نہ ہو۔

جب کچھ سمجھ نہ آئی تو روہانسی سی صورت بنا کر فرہاد سے بولی۔

"ٹھیک ہے تم مرجاؤ، ہوجاؤ آزاد زندگی سے، پالو چھٹکارہ زندگی کے مسائل سے۔ اگر تمہیں آزادی ملتی ہے، غم سے جی چھوٹتا ہے تمہارا اور اگر موت ہی تمہارے مسائل کا حل ہے تو ٹھیک ہے، مرجاؤ۔ کرجاؤ خودکشی، کرلو اپنی زندگی کا خاتمہ۔ میں بھی میکے چلی جاؤں گی، بہت خوش رہوں گی وہاں۔ ہاں لیکن اک کام کرو کہ جب خودکشی کرنی ہو تو اِک دن پہلے بتانا تا کہ دو جنازوں کا بندوبست ہو اور دو قبریں اکٹھے کھدوائی جائیں۔"

"دو قبریں کیوں؟ دو جنازوں کا بندوبست کیوں۔" فرہاد نے پوچھا...... تم اپنی قبر میں خوش رہو گے میں میکے چلی جاؤں گی اور میں اُدھر خوش، چھوٹے کا کیا بنے گا؟ اس کا بھی کچھ سوچا ہے؟ وہ کدھر جائے گا؟ اس کو بھی مارتے ہوئے جانا۔ گلا دبا دینا وہ بھی تمہارے ساتھ قبر میں عیش کرے گا۔ وہ بھی تمہاری طرح مسائل سے آزاد خود مختار زندگی بسر کرے گا۔" یہ کہہ کر سدرہ سسکتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی، کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھائی رہی، تھوڑی دیر بعد فرہاد جھٹکے سے اٹھا اور لپک کر سدرہ کے سامنے آ گیا اور رونا شروع کردیا، پھر روتے روتے کہا۔

"ہاں! میں جیوں گا، میں زندہ رہوں گا۔ میں تمہاری خاطر زندہ رہوں گا۔ میں حالات کا سامنا کروں گا۔ مجھے ننھے کی خاطر جینا ہوگا۔ ہاں ہاں میں جیوں گا۔"

اور بس یہیں سے میرے فرہاد نے دوبارہ سے ہمت پکڑی اور خدا نے ساتھ دیا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انہیں جاب مل گئی۔ محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ خدا ہمیشہ محنت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ بس ہمت کرنے کی دیر ہوتی ہے۔

☆......☆

چھٹی سچ بیانی

اُجالوں کا ماتم

ایم ارشد وفا

گوجرانوالہ سے بے حسی کی زندہ تصویر، اس شخص کی سچ بیانی جسے خوشی بھی راس نہ آئی

میں اور سرور ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں، ہم کلاس فیلو ہی نہیں اچھے دوست بھی تھے۔ سرور کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اس کے والد ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ ہماری زمین بارانی تھی۔ بارش کے قطرے ہی ہمارے لیے گندم کے دانے ہوتے تھے۔ سرور کے گھر میں تنگدستی تھی، اس کے باوجود اس کے گھر والے مطمئن تھے۔ گھر میں سکون تھا اور سب لوگ آپس میں پیار محبت سے رہتے تھے۔ ہر چیز میں برکت تھی۔ اس کی دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا...... ان کے دن کا آغاز خدا کے پاک نام سے ہوتا تھا۔ اس کے والد ہمیشہ فجر کی اذان دیتے اور دونوں باپ بیٹے فجر کی نماز باجماعت ادا کرتے۔ سرور نے مڈل تک ہی تعلیم حاصل کی تھی، جب کہ میں نے قصبے کے اسکول سے میٹرک کر کے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اتنے فاصلوں کے باوجود ہماری دوستی اسی طرح برقرار تھی۔ سرور کے ایک ماموں عرصہ قبل انگلستان چلے گئے تھے۔ وہ وہاں کسی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ وہ گاہے بگاہے پاکستان کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ سرور کی بھی یہ خواہش اٹھی کہ وہ بھی انگلینڈ جائے اور وہاں جا کر ڈھیروں دولت کمائے۔

اس نے اس خواہش کا اظہار اپنے ماموں سے بھی کیا تھا، مگر اس وقت انہوں نے اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا، مگر بعد میں جب سرور کی شادی اسی ماموں کی بیٹی سے ہوگئی تو انہوں نے سرور کے لیے انگلینڈ میں نوکری کی کوشش شروع کردی، بالآخر سرور انگلینڈ چلا گیا......

اس روز سرور بہت خوش تھا۔ انگلینڈ میں اس کے ماموں نے اسے اسی فیکٹری میں ملازم کرادیا، جہاں وہ خود کام کرتے تھے۔

یوں ہی پانچ سال بہت گئے۔ سرور کو برطانیہ کی شہریت مل گئی تو اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی وہاں ہی بُلوالیا۔ وہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ میں تعلیم مکمل کر کے ایک سرکاری ادارے میں جاب کرنے لگا تھا۔ سرور سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار فون پر بھی بات ہوجاتی تھی۔ وہ بہت ہی مسرور تھا کہ اس کی زندگی نہایت ہی پرسکون گزر رہی تھی۔ پہلے تو وہ ماموں سُسر کے ساتھ ہی رہتا تھا، مگر اب اس کا اپنا گھر تھا، گو کہ چھوٹا تھا، لیکن اسے زندگی گزارنے کے لیے ہر شے میسر تھی۔ ٹیلی ویژن، فریج، قالین، صوفے۔ اس کے بچے بھی تعلیمی اداروں میں داخل ہوگئے تھے۔ جب بھی اس سے فون پر بات

ہوتی تو وہ کہا کرتا تھا۔

"اکرم! زندگی گزارنے کا اصل مزا تو انگلینڈ میں ہی ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ یہاں آ گیا ہوں۔ اگر پاکستان میں رہتا تو بکریاں چرا رہا ہوتا۔"

میں اسے جواب دیتا کہ "نہیں مسرور! ایسا نہیں ہے...... محنت اور لگن سے کام کرو، تو اپنا وطن ہی جنت ہے۔ مجھے دیکھو میں نے محنت کی ہے اور اب گریڈ اٹھارہ کا ملازم ہوں، میری زندگی بھی سکون سے گزر رہی ہے۔"

میرا جواب سن کر وہ بات کا رُخ موڑ دیتا اور کہتا۔

"کبھی آؤ نا انگلینڈ" میں اس سے کہتا کہ "ہاں ضرور آؤں گا، مگر صرف سیر کرنے کے لیے۔" میں یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا۔

"کچھ عرصہ یوں ہی گزرا، پھر آہستہ آہستہ سرور سے میرا رابطہ کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا۔ میں بھی مصروف ہو گیا۔ اس کا فون نمبر بھی بدل گیا اور وہ عرصے سے پاکستان بھی نہ آیا، تو ہم ایک دوسرے کو قریباً بھول ہی گئے، یوں ہی چند سال اور بیت گئے۔



☆.....☆

وہ میری سروس کا آخری سال تھا۔ میں نے ایک سال بعد ریٹائر ہو جانا تھا۔ کہ مجھے ادارے کی طرف سے ایک سرکاری ڈیلی گیشن کے ساتھ ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے انگلینڈ جانے کا موقع مل گیا۔

وہاں پہنچ کر مجھے سرور کی یاد آئی، مگر میرے پاس اس کا ایڈریس اور فون نمبر ہی نہ تھا۔ اس لیے اس سے ملاقات ناممکن تھی، لہٰذا میں نے اس خیال کو دل سے نکال دیا اور اپنے کام میں ہی مگن رہا...... کانفرنس ختم ہوئی تو ہمارے پاس ایک ہفتہ باقی تھا، جو ہم نے سیر وتفریح میں گزارنا تھا۔

☆.....☆

مانچسٹر کے ایک پارک میں میری نظر اچانک سرور پر پڑ گئی۔ وہ سرور ہی تھا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی قمیص کا کالر یہ بتا رہا تھا کہ اس نے کئی دنوں سے کپڑے تبدیل نہیں کیے ہیں، جب کہ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ تین چار دن سے سویا بھی نہیں...... میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک تصویر ہے جو پارک میں سیر کرنے والے افراد کو دکھا رہا ہے...... میرا تجسس مجھے اس کے اور بھی قریب لے گیا...... میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھوں میں اُٹھائی ہوئی تصویر ایک ایک شخص کو دکھا کر پوچھ رہا تھا۔

”بھائی! آپ نے اس بچی کو تو نہیں دیکھا؟“ وہ ہر ایک سے یہی سوال کرتا اور جواب نفی میں پاتا۔ میں پریشان سا ہو گیا اور جلدی سے اس کے سامنے آ گیا اور میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سرور......!“

اس نے مجھے فوراً ہی پہچان لیا اور ”اکرم تم“ کہہ کر میرے گلے لگ گیا اور رونے لگا۔ اس کی سسکیاں مجھے سنائی دے رہی تھیں...... کچھ دیر بعد ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے اور قریب ہی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے پوچھے بغیر ہی اسے بتایا کہ ”میں سرکاری طور پر ایک وفد کے ہمراہ آیا ہوں اور اگلے ہفتے واپسی ہے۔ تم سے ملاقات ایک اتفاق ہے، مگر تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اور یہ تصویر والا کیا معاملہ ہے؟“

سرور کی آنکھیں چھلک اُٹھیں اور وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔

”اکرم! کاش میں انگلینڈ نہ آیا ہوتا۔ پاکستان کی غربت اس سے بہتر تھی......“

”کیوں کیا ہوا؟ تم مجھے اپنا دُکھ سناؤ تو سہی؟“ میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”جب میرے بیوی بچے یہاں آ گئے تو میں مطمئن ہو گیا کہ اب میری زندگی میں چین ہی چین ہوگا......“

ایسا ہی ہوا، مگر جب بچے اسکولوں میں جانے لگے تو میرے خوابوں کی تعبیریں بھی اُلٹی ہونے لگیں، بچے بڑے ہوتے چلے گئے، اسکول کی کلاسوں میں زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتے گئے، لیکن ساتھ ہی ان میں انگریزوں کی تہذیب کا رنگ چڑھتا گیا۔ وہ پہلے بے شرم، ڈھیٹ، پھر گستاخ، پھر نافرمان اور آخر میں باغی بن گئے۔ وہ اپنی مادری زبان اردو اور پنجابی کو بھول گئے۔ اس لیے میری کسی بات کا ان پر اثر ہی نہ ہوتا۔ وہ میرے ساتھ انگریزی میں بات کرتے۔ ان کی سوچ، فکر، انداز، طور اطوار ہر شے بدل گئی...... یہاں کا قانون بھی بہت سخت ہے، ہم بچوں کو مار بھی نہیں سکتے کہ اس سے بچوں کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے......

بیٹا آوارہ ہو کر گھر سے نکل گیا...... معلوم ہوا کہ اسے نشے کی لت پڑ گئی ہے اور وہ ہپیوں کے ایک گروہ کے ساتھ دنیا کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گیا ہے...... وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ نہ جانے وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مر گیا...... اس نے تو میرا بازو بننا تھا۔ میرے بڑھاپے کا سہارا بننا تھا...... بڑی بیٹی کی شادی میں نے اپنے رشتہ داروں میں کر دی ہے۔ لڑکا شریف اور سیدھا سادا ہے۔ اسے میں نے پاکستان سے یہاں بلوایا ہے۔ میری ایک کزن کا بیٹا ہے۔ وہ بھی غریب ہیں۔ وہ بھی میری طرح انگلینڈ کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس لیے یہاں چلا آیا، لیکن اب وہ میری بیٹی کے ہاتھوں رُسوا ہو رہا ہے...... وہ اسے ڈانٹتی ہی نہیں مارتی بھی ہے۔ روز لڑائی ہوتی ہے اور میں یہ

تماشا بے بسی سے دیکھتا رہتا ہوں...... اس سے چھوٹی بیٹی یہ ہے۔'' اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے بارے میں کیا بتاؤں...... اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں خودکشی کر لیتا۔ شاید میں بزدل ہوں کہ موت کو گلے لگانے سے ڈرتا ہوں...... شاید میں بے غیرت بھی ہوں کہ اپنی بے غیرتی کا تماشا دنیا کو دکھا رہا ہوں...... ایسے باپ تم نے کم ہی دیکھے ہوں گے، جو خود ہی تماشا ہو اور تماشائی بھی ہو۔ یہ میرے اندر کا ردِعمل ہے...... میں دنیا والوں اور خاص کر اپنے ہم وطنوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہر چمکتی چیز کو سونا مت سمجھو...... یہاں کی روشنیوں، رنگوں اور جگمگاتی زندگی کو تمنا نہ کرو۔ یہ زندگی نہیں موت ہے...... بھیانک موت...... میں یہی بتانے کے لیے کئی دنوں سے شہر شہر پھر رہا ہوں۔ میں صرف کسی پاکستانی سے ہی اپنی بیٹی کا پتا پوچھتا ہوں...... اپنی وہ لاڈلی بیٹی جسے میں نے اپنی آنکھوں سے ایک گورے کی بانہوں میں مدہوش دیکھا تھا...... شاید ان دونوں نے شراب پی رکھی تھی کہ میری بیٹی...... میرے خون نے ہی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا...... وہ گورا اسے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ تو میرا خون کھول اٹھا۔ میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اس رات اپنی بیٹی کو خوب مارا۔ مجھے اس بات کی پروا ہی نہ رہی کہ وہ میرے خلاف پولیس کو بلائے گی۔ وہ مار کھاتی رہی اور واہی تباہی بکتی رہی...... اگلی صبح وہ اٹھی اور گھر سے نکل گئی۔ اسے وہی گورا لینے آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ نہیں معلوم کہ وہ اس کے ساتھ گرل فرینڈ بن کر رہ رہی ہے یا کہیں اور کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے...... میں تین ماہ سے اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ آخر میں اس کا باپ ہوں۔ وہ میرا خون ہے۔ اس کی ماں شدید بیمار ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی راہیں دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے ہماری بیٹی کس حال میں ہو گی۔ وہ ہماری عزت اور غیرت کو روند کر چلی گئی ہے اور میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں...... کاش، اے کاش میں نے پاک سرزمین نہ چھوڑی ہوتی۔ کاش میں سوہنی دھرتی کی بارانی زمینوں میں ہل چلا کر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا کر رہا ہوتا۔ بے شک میری اولاد ان پڑھ رہ جاتی۔ میری بیٹی بھینس کے گوبر سے اُپلے بنا کر گھر کی دیواروں پر تھاپ رہی ہوتی۔ وہ کسی سادہ دِل دیہاتی نوجوان کی شریکِ زندگی بن جاتی، تو آج مجھے اپنی غیرت کا یہ جنازہ نہ اٹھانا پڑتا جواب میں اٹھا کر شہر شہر پھر رہا ہوں۔

یہ سب کچھ کہتے ہوئے سرور کی آواز بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے...... میں خاموش اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ میں بھلا اب اسے کیا کہتا۔ اسے کیا دلاسا دیتا۔ کس طرح اس کے دکھ کا مداوا کرتا۔ میں تو خود وہاں اجنبی مسافر تھا۔ میں چپ چاپ اس کے سلگتے آنسوؤں کا دھواں دیکھتا رہا اور پھر اسے جھوٹی تسلیاں دے کر لوٹ آیا...... تین دن بعد میں پاکستان میں تھا، مگر میں سرور اور اس کے غم کو نہیں بھولا تھا۔ اس کا روتا ہوا چہرہ مجھے تڑپا دیتا تھا......

یوں ہی ایک سال بیت گیا۔ میں ریٹائر ہو گیا، تو میں نے کچھ عرصہ آرام کی غرض سے گاؤں میں گزرنے کا ارادہ کیا۔ اور گاؤں آ گیا...... دو ماہ بعد گاؤں میں سرور کی وفات کی خبر آ گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا کہ اس کی ڈیڈ باڈی پاکستان لائی جا رہی ہے۔ میں بھی اس دن ایئر پورٹ چلا گیا۔ سرور کی میت کے ساتھ صرف اس کا داماد آیا تھا...... اس کا اپنا کوئی بھی ساتھ نہ تھا۔ اتنی بے حسی دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ مجھے بہت دُکھ ہوا تھا کہ میرا دوست اور کلاس فیلو اولاد کا غم لے کر اس دنیا سے چلا گیا۔

اس کے داماد نے بتایا کہ سرور نے اس سے قسم لی تھی اور وصیت کی تھی کہ اس کی موت کے بعد اس کو پاکستان کی مٹی میں دفن کیا جائے۔ یہ اس کے داماد کی سعادت مندی تھی کہ وہ اس کی میت کو پاکستان لے آیا۔ وہ بھی چند دن بعد انگلینڈ لوٹ گیا...... کتنا بدنصیب ہے سرور...... کہ اس کی قبر پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہیں ہے۔ کاش، اُسے اُجالے راس آ جاتے...... تو وہ اتنی بے کسی کی موت نہ مرتا۔

☆......☆

ساتویں سچ بیانی

امر نامہ



غلام مصطفیٰ

نادان محبت کی آنچ میں پگھل جانے والی ایک دوشیزہ کی سنگین کتھا

"دل میں اُتر جانا اور دل سے اُتر جانا" میں بظاہر تو لفظوں کا ہیر پھیر ہے، لیکن اس کا اندازہ تب ہوتا ہے جب انسان کی آرزوئے محبت کا دامن تار تار ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

سردیوں کی یخ بستہ رات تھی اور رات بھی آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، مگر وہ کرسی پر بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ اُسے سردی کا کوئی پتا تھا اور نہ رات کے ڈھل جانے کا احساس۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی پتھر کی مورتی ہو، جسے دسمبر کی سردی سے بھی کچھ سروکار نہیں تھا۔ سوچوں میں گم، آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے سامنے موجود بچپن کی ڈائری پر گرے اور ڈائری کے ورق کو گیلا کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے تو اچانک اس کی نظر وال کلاک پر پڑی اور اس میں ایک بجے کا وقت دیکھ کر وہ حیران ہوگئی کہ اتنی رات گزر گئی اور اسے پتا تک نہ چلا۔

وہ جلدی سے اُٹھی اور کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ پردے سے ٹکراتی یخ بستہ ہوا کے جھونکے نے اس کی پیشانی کو چھوا تو اسے سردی کا احساس ہوا۔ جلدی سے گردن کھڑکی سے باہر نکال کر جھانکا تو ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ دور کہیں کہیں سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سرد ہوا کے جھکڑ بار بار کھڑکی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے، مگر پتھر کا دل رکھنے والی ان دیواروں پر ان کا کوئی بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پھر اسے اپنا احساس ہوا کہ میری زندگی بھی انہیں سرد ہوا کے جھونکوں کی طرح رائیگاں گئی اور اس پتھر دل انسان پر میری محبت کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ یہ خیال آتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔

☆......☆

امر کی پیدائش ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔ وہ پانچ بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور ایک چھوٹا بھائی طلحہ بھی تھا۔ اسے سب کا لاڈ پیار ملا تھا۔ چھوٹے بڑے بھی اس کے ناز نخرے برداشت کرتے تھے، کرتے بھی کیوں نہ، ایک تو وہ بہت ہی حسین تھی اور اس کے علاوہ عقل مندی اور سلیقہ مندی میں بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس کے والد اپنی زمینوں میں کام کرتے تھے اور ساتھ دو تین ملازم بھی تھے جو ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

ابھی وہ مشکل سے پانچ برس کی ہی ہوئی تھی کہ اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے چچا کا بیٹا سجاد بھی اس کے ہمراہ جاتا تھا۔ وہ عمر میں اس سے تھوڑا سا بڑا تھا اور دیکھنے میں بھی بہت خوب صورت نظر آتا تھا، دونوں

اکٹھے راستے میں باتیں کرتے، لڑتے، جھگڑتے اور راستوں میں درختوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ کبھی کبھار لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا تو پھر خود ہی صلح کر لیتے تھے۔

وقت کے گزرنے کا پتا نہیں چلتا، امر تیسری اور سجاد چوتھی کلاس میں پڑھتے تھے۔ دونوں کا آنا جانا ایک ساتھ تھا۔ وہ اسکول آتے جاتے جس راستے سے گزرتے تھے وہاں پر ایک پرانا مکان بھی موجود تھا، جس کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ یہاں پر ایک جوڑا رہتا تھا۔ دونوں کو کسی دشمن نے قتل کر دیا تھا، لیکن ان کی روحیں ابھی تک اس مکان میں رہتی ہیں۔

ایک دن دونوں نے اس مکان کو دیکھنے کا فیصلہ کیا اور ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔ دونوں اس مکان میں داخل ہوئے، مکان میں تاریکی کا راج تھا۔ چھت پر اُلوؤں کا بسیرا تھا جب ایک اُلو اس سے ٹکرایا تو اس نے زور زور سے رونا اور دھاڑیں مارنا شروع کر دیا تھا۔ سجاد نے اسے کتنا منایا اور دلاسا دیا تھا لیکن اس کا روتے روتے بُرا حال تھا۔ گھر جاتے ہی وہ بخار میں مبتلا ہو گئی تھی اور دو دن اسکول بھی نہیں گئی تھی۔

☆......☆

اُسے وہ وقت بھی یاد تھا جب وہ اسکول سے واپسی پر ایک تالاب کے کنارے بیٹھ کر پانی میں پتھر پھینکا کرتے تھے اور کیسے سجاد قریبی باغ سے چوری چوری آم توڑ کر لایا کرتا تھا۔ کیسے اسے گھر سے چُرائے ہوئے بادام کھلایا کرتا تھا اور ساتھ ہی اس سے یہ وعدہ بھی لیتا کہ وہ گھر میں کسی کو نہ بتائے۔

وقت گزرتا چلا جا رہا تھا، سجاد پانچویں میں تھا اور اسے اب ایک سال بعد یہ اسکول چھوڑنا تھا، کیوں کہ یہ پرائمری اسکول تھا اور وہ مزید یہاں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ جب امر یہ سوچتی کہ سجاد کے جانے کے بعد وہ اکیلی رہ جائے گی، تو وہ اُداس ہو جاتی تھی۔ اصل میں وہ دونوں



ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے تھے، مگر محبت کا اظہار کرنا نہیں جانتے تھے۔ سجاد بھی اُسے بہت ہی پسند کرتا تھا۔ سجاد پانچویں کا امتحان پاس کر کے شہر کے ہائی اسکول میں جا چکا تھا اب جب وہ ان راستوں پر اکیلی اسکول جاتی تو سجاد کتنا یاد آتا تھا اور وہ کتنا اُداس ہوتی تھی۔

وہ دن کتنا ہی سہانا تھا جب اتوار کے دن سجاد کی امی امر کے گھر آئی تھی اور اس کی امی سے امر کا سجاد کے لیے ہاتھ مانگا تھا تو اس کی امی کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ بھی یہ بات سن کر پھولے نہ سمائی تھی اور آن کی آن میں سب گھر والوں کی رضامندی سے دونوں کی منگنی ہوگئی تھی۔

دونوں کس قدر خوش تھے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆......☆

سجاد بی اے کا طالب علم تھا اور امر ایف ایس سی کر رہی تھی۔ وہ اچھے نمبر حاصل کر کے ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، وہ کالج خود ہی آتی جاتی تھی۔ اس کے ابا کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ بہت روشن خیال آدمی تھے۔ ایک دن زور سے بارش ہو رہی تھی اور وہ کالج سے واپس آ رہی تھی، راستے میں کچی سڑک ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ کیچڑ تھا۔ وہ گلی سے گزر رہی تھی کہ ایک بائیک سے ٹکرا گئی اور گرتے گرتے بچی۔ اگر موٹر سائیکل سوار بروقت بریک نہ لگاتا تو حادثہ یقینی تھا۔ سامنے دیکھا تو ایک خوب صورت نوجوان اُس سے پوچھ رہا تھا کہ چوٹ تو نہیں آئی۔ ایک تو خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دوسرا اسے اُس پر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے اجنبی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”دیکھ کر نہیں چل سکتے، اندھے کہیں کے۔“

اس اجنبی نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ”میں نے تو تمہیں بچانے کی پوری کوشش کی، لیکن کیا کروں موٹر سائیکل کیچڑ کی وجہ سے پھسل گئی اور تم سے ٹکرا گئی۔ اگر تکلیف پہنچی ہے تو سوری۔“

سوری کا لفظ سنتے ہی اس کے کانوں میں جیسے اس کی آواز کا رس گھل گیا۔ اتنی پیاری صورت اور اتنی پیاری آواز...... پھر وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چل پڑی۔

☆......☆

شام کو امر پڑھنے کے لیے بیٹھی تو بائیولوجی کی کتاب نہ پا کر بہت پریشان ہوئی۔ یا اللہ میری کتاب کہاں چلی گئی، پھر اسے اچانک خیال آیا کہ شاید وہ وہاں گر گئی ہوگی، جہاں اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اُس واقعے کا یاد آنا تھا کہ اُسے وہ اجنبی یاد آ گیا۔ وہ کافی دیر بیٹھی اس کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ بار بار اس کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ کتنا حسین چہرہ تھا، کتنا دھیما اور پیارا انداز تھا بات کرنے کا۔

”چوٹ تو نہیں آئی“ یہ فقرہ اس کے دماغ میں گونجنے لگا، کافی دیر بعد جب کچھ سمجھ نہ آیا تو سونے کے لیے بستر میں جا گھسی، لیکن نیند کہاں...... وہ اُس اجنبی کے سحر میں مکمل طور پر گرفتار ہو چکی تھی۔

وہ بار بار سجاد اور اُس اجنبی کا موازنہ کر رہی تھی۔ سجاد میں اپنائیت غالب آتی تو اُس اجنبی کا چہرہ اور دھیما انداز اُس پر حاوی ہو جاتا۔ کافی دیر تک وہ اسی کشمکش و پیچ میں رہی کہ سجاد بہتر ہے کہ اجنبی۔

آخر کار اجنبی سجاد پر سبقت لے گیا اور وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کاش کبھی دوبارہ کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر اس سے ملاقات ہو جائے، تو وہ اس کا نام اور پتا تو کم از کم پوچھ لے۔ انہی خیالوں میں گم نہ جانے اسے کب نیند آ گئی۔

☆......☆

ادھر نبیل بھی سوچ رہا تھا کہ کتاب واپس کرنی چاہیے یا نہیں۔ نبیل کو کتاب سے پتا چلا تھا کہ اس لڑکی کا نام امر ہے اور وہ FSC کی طالب علم ہے، جب اُسے کتاب واپس کرنے کا خیال آتا تو امر کی کھا جانے والی نظریں اور غصہ اُس کا حوصلہ پست کر دیتا کہ پتا نہیں وہ کیا سمجھے اور اس کے والدین بُرا نہ مانیں، آخر کار اس نے کتاب واپس کرنے کا فیصلہ کیا اور کتاب پر لکھے ہوئے پتے پر پہنچا۔

دروازے پر دستک دی تو ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس نے پوچھا کہ

”باجی امر گھر پر ہیں؟ انہیں یہ کتاب دینی ہے۔“

”جی ہاں! وہ گھر پر ہیں۔“ ملازم انہیں باہر چھوڑ کر

امر کو اطلاع دینے چلا گیا۔

ملازم کی بات سن کر امر کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ باہر آئی، دیکھا تو وہ اجنبی چہرہ سامنے کھڑا تھا، جو اس سے یوں مخاطب ہوا۔

"میرا نام نبیل ہے اس دن تمہاری کتاب وہاں گر گئی تھی تو میں نے سوچا کہ واپس کر دوں۔ آپ پریشان ہوں گی۔" وہ کتاب دے کر واپس جانے ہی والا تھا کہ امر نے آواز دی کہ سنیں...... چائے، پانی تو پیتے جائیں۔"

اس پیشکش کو نبیل نے رد کر دیا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔ وہ اس کی آواز کے جادو میں گم سم کھڑی تھی، نبیل کتنا پیارا نام ہے، وہ انہی خیالوں میں گم تھی، جب ملازم نے اس کی یادوں کا تسلسل توڑا کہ باجی سکندر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔

"امر کے ابو سکندر کھانے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"کون تھا وہ لڑکا؟ کیا کرنے آیا تھا؟"

سکندر نے پوچھا۔

"پتا نہیں کون تھا۔ میری کتاب راستے میں کہیں گر گئی تھی تو اس پر گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ وہی واپس کرنے آیا تھا۔" امر نے جواب دیا، اس کے بعد سب نے کھانا کھانا شروع کر دیا، مگر امر کا دل کھانے میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تو نبیل کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا کھانا کھا کے کھانے کی میز سے اُٹھ گئی۔

☆......☆

لگتا تھا کہ وقت کا پہیا جام ہو گیا ہے۔ امر کا نبیل کے بغیر وقت ہی مشکل سے گزر رہا تھا، یہاں تک کہ سجاد...... جسے وہ اپنی محبت کا محور سمجھتی تھی، اسے بھی بھول چکی تھی اور ہر وقت نبیل کی یاد میں گم صم رہنے لگی تھی، حتیٰ کہ اس کا رویہ اپنی کلاس کی سہیلیوں سے بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کلاس میں بات چیت کرنا بھی بند کر دی تھی۔

ایک دن وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کالج سے واپس آ رہی تھی۔ گاڑی نہیں مل رہی تھی اور نہ ہی کوئی رکشا آس پاس نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک سنہری کار قریب آ کر رُکی، اس سے نبیل مسکراتا ہوا باہر آیا اور بہت ہی ادب سے سلام کیا۔ نبیل کو دیکھتے ہی امر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، پھر نبیل نے اسے گھر چھوڑنے کی دعوت دی جو امر اور اس کی سہیلیوں نے بخوشی قبول کر لی، کیوں کہ وہ چل چل کر تھک چکی تھیں۔ سب سے پہلے اس کی سہیلیوں کو ان کے گھر چھوڑا گیا اور سب سے آخر میں امر کو چھوڑنے کی باری تھی۔ اب امر ساتھ والی سیٹ پر آ گئی اور دونوں باتیں کر کے خاموشی کو ختم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

جب امر کے گھر کے سامنے گاڑی رُکی تو دروازے پر ابو اس کا انتظار کر رہے تھے کیوں کہ اسے آج کافی دیر ہو گئی تھی۔ اپنی لاڈلی بیٹی کو اجنبی کے ساتھ دیکھ کر ان کے تو جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ غصّے سے لال پیلے ہو گئے۔ نبیل کے سامنے تو کچھ نہ کہا لیکن گھر میں اس سے کافی باز پرس ہوئی، لیکن لاڈ پیار سے امر کافی بگڑ چکی تھی۔ اسے ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ سے کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ تو نبیل کے پیار میں بہت آگے نکل چکی تھی، جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

اب تو آئے روز اس کی نبیل سے ملاقاتیں ہوتیں۔ کالج کی بجائے نبیل کے ساتھ کبھی کسی ہوٹل میں اور کبھی کسی پارک میں وہ اس کی محبت کے مزے لوٹ رہی تھی اور اپنا دل و جان قربان کر رہی تھی۔ نبیل بھی ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ماں باپ وفات پا چکے تھے ایک بہن تھی، اس کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ سیاہ و سفید کا وہ اکیلا مالک تھا۔ وہ بھی امر پر دولت پانی کی طرح بہا رہا تھا۔

☆......☆

سجاد کی امی امر کی امی سے شادی کی تاریخ پکی کرنے آئی کہ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں کیوں نہ ان کی شادی کر دیں۔ امر کی امی بھی یہی چاہتی تھیں، انہوں نے بھی ہاں کر دی اور کہا کہ وہ امر اور سکندر سے شام کو بات کر کے بتائیں گی۔

جب شام کو انہوں نے سکندر سے بات کی تو انہوں نے بھی کہا کہ امر کو اجنبی کے ساتھ دیکھ کر میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ ان کی جلد سے جلد شادی کر دی جائے، بس امر سے بات کر لو۔ میری طرف سے ہاں ہے۔

"شام کو وہ امر کے کمرے میں گئیں اور کہا کہ آج سجاد کی امی آئی تھیں شادی کی تاریخ لینے۔ میرا ابھی یہی ارادہ ہے کہ اب تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔"

لیکن اب تو امر سجاد سے ہرگز شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے تو بس نبیل چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی سے وہ وہاں سے اُٹھ گئی اور جاتے ہوئے کہہ گئی کہ "اسے ابھی شادی نہیں کرنی، جب کرنی ہوگی وہ بتادے گی۔"

کچھ دن یونہی گزر گئے اور آخر کار سکندر نے امر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اور ایک ماہ کے اندر شادی کا فیصلہ سنایا۔ امر پر تو جیسے آسمان گر پڑا ہو اس نے صاف کہہ دیا کہ "مجھے سجاد سے شادی نہیں کرنی، مجھے نبیل سے شادی کرنی ہے۔"

نبیل کا نام سن کر سکندر کو یوں لگا جیسے اس کی موت اس کے سامنے کھڑی ہو۔ وہ امر پر چلایا اور اُسے مارنے کے لیے لپکا، مگر وقت پر ماں درمیان میں آ گئی۔

لیکن انہیں جب بات کا پتا چلا تو ان کا بھی دل چاہا کہ وہ ابھی زندہ زمین میں دفن ہو جائیں۔ وہ اپنی بیٹی سے ایسی توقع نہیں کر سکتی تھیں۔

☆......☆

امر کا گھر سے باہر آنا جانا بند تھا اور سب لوگ اسے سجاد کے ساتھ شادی کے لیے آمادہ کر رہے تھے، لیکن وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔

ایک رات سکندر کمرے میں سو رہا تھا۔ موبائل باپ کے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ امر نے چپکے سے موبائل اٹھایا اور نبیل کو میسج کیا کہ وہ چپکے سے آئے اور اسے لے جائے۔ اس نے بھی احتیاط سے اپنے تھوڑے سے کپڑے بیگ میں ڈالے اور سیڑھی سے دیوار پھلانگ کر روڈ پر آ گئی اور نبیل کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر میں نبیل آ گیا۔ وہ کار میں بیٹھی اور دوسرے دن کورٹ میں جا کر نکاح کر لیا۔ آج اسے بہت خوشی تھی۔ آج اس کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ اسے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے تو بس اپنا پیار چاہیے تھا جو اسے مل گیا۔

وقت بہت ہی اچھا گزر رہا تھا، یہاں تک کہ ایک ماہ گزر گیا اُدھر سکندر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لوگوں کی باتوں سے تنگ آ کر وہ دبئی چلا گیا۔ اس کی ماں کا بھی رو رو کے بُرا حال تھا اور وہ لوگوں کی باتیں سن سن کے روز جیتی اور روز مرتی تھی۔

☆......☆

امر کو گھر چھوڑے تین ماہ گزر چکے تھے۔ نبیل کا رویہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ نہ امر سے بات کرتا اور نہ کسی بات کا جواب دینا پسند کرتا۔ امر کو بعد میں پتا چلا کہ جسے وہ اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھتی تھی، وہ تو پتا نہیں کتنی اور لڑکیوں سے چکر چلا رہا تھا۔ شروع میں تو وہ امر سے کام کا کہہ کر جاتا اور شام گئے واپس آتا اور کھائے بغیر ہی سو جاتا۔ اگر امر اس سے کھانے کا پوچھتی تو وہ ٹال جاتا کہ وہ ہوٹل سے کھا کے آیا ہے۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ اس کے لیے ابھی جاگ رہی ہوگی۔

آہستہ آہستہ امر کو اُس پر شک ہوا اور پھر یہ شک یقین میں بدل گیا کہ نبیل شراب بھی پیتا ہے اور پتا نہیں وہ کتنی اور دوسری لڑکیوں کے چکر میں بھی پڑا ہوا ہے۔ وہ بار بار اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی کہ جس کی خاطر اُس نے ماں باپ اور سب کچھ چھوڑا، آج وہ اس کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔

ایک رات وہ اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نبیل کے نام سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اس چہرے پر تھوکنا بھی نہیں چاہتی تھی، جس کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آئی تھی، لیکن اب اس کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کہاں جاتی۔ روزانہ جیتی اور روزانہ مرتی۔ غم سے خوب صورت چہرہ مُرجھا گیا تھا اور وہ خود سوکھ کر لکڑی ہو گئی تھی، مگر نبیل کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی، اٹھ کر دروازہ کھولا سامنے نبیل کھڑا تھا، اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی بھی تھی۔ وہ زور سے چلائی۔

"نبیل یہ کون ہے؟"

"یہ میری بیوی ہے" نبیل نے اطمینان سے جواب دیا۔

"نہیں نبیل ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میرے ہو۔ تم ایسا

نہیں کر سکتے۔" اس نے چلاتے ہوئے نبیل کا گریبان پکڑلیا اور جھنجھوڑتے ہوئے دیوانہ وار چلا رہی تھی۔
"نہیں۔ایسا نہیں ہوسکتا...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

تڑاخ سے ایک تھپڑ امر کے منہ پر پڑا اور وہ ہڑبڑا کے لڑکھڑاتی ہوئی گرگئی اور اُٹھ کے دوبارہ اس سے لپٹ کر بولی۔

"نہیں نبیل! ایسا نہیں ہوسکتا، یا تو میں اس گھر میں رہوں گی یا یہ رہے گی۔ تمہیں اسے بھیجنا ہوگا واپس۔" مگر نبیل کے الفاظ سن کے اسے یوں لگا جیسے اس پر پہاڑ گر پڑا ہو، وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں میں بھی شکیلہ سے یہی وعدہ کرکے آیا ہوں کہ اس گھر میں اب امر نہیں رہے گی۔ آج سے یہ گھر شکیلہ کا ہے اور شکیلہ ہی میری بیوی ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ اگر رات یہاں گزارنا چاہو تو تمہاری مرضی ورنہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جانا۔ ورنہ مجھ سے بُرا اور کوئی نہیں ہوگا۔" یہ کہتے ہی نبیل اپنے کمرے میں شکیلہ کو لے کر چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کردیا۔

وہ ساری رات روتی رہی، صبح منہ اندھیرے ہی وہ گھر سے نکل گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی بیگ تھا جو وہ ماں باپ کے گھر سے لائی تھی۔

دن بھر شہر کی گلیوں میں بھٹکتی رہی، لیکن کہاں جاتی اور تھا کون اس کا یہاں۔

شام ہونے کو تھی۔ اس کی تمام امیدیں دم توڑ رہی تھیں، وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں جائے؟ آخر اس نے سوچا کہ واپس ماں باپ کے گھر جانا بہتر ہوگا۔ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر مرنے سے بہتر ہے وہ باپ کی گولی سے مرے، کیوں کہ اسے پتا تھا کہ اس کا باپ سامنے دیکھ کر اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

وہ گاڑی میں بیٹھی گھر کی جانب گامزن تھی، مگر ذہن میں عجیب عجیب قسم کے خیالات آرہے تھے، پتا نہیں کیا ہوگا؟

گاڑی اس کے گھر کے نزدیک رُک چکی تھی۔ وہ اب گھر کی جانب رواں دواں تھی، قدموں میں لڑکھڑاہٹ واضح تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھی۔ دروازے پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔ اور اسے دیکھ حیران رہ گیا، مگر وہ سیدھی ڈرتی ڈرتی ماں کے کمرے کی طرف جارہی تھی کہ کہیں باپ دیکھ نہ لے، مگر باپ تو وطن چھوڑ چکا تھا۔ ماں کے کمرے کے دروازے پر دستک کے لیے ہاتھ رکھا تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔

سامنے پلنگ پر ادھ موئی ماں پڑی تھی۔ وہ لپک کے ماں کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "ماں مجھ سے بھول ہوگئی" وہ رو بھی رہی تھی اور چلا بھی رہی تھی۔ ماں اُٹھی تو اس سے لپٹ گئی اور زاروقطار رونے لگی، بیٹی کو روتا دیکھ کر اسے اس پر رحم آنے لگا، مگر اُس نے اپنے آپ پر کنٹرول کیا اور اسے کہا کہ "دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ میری آنکھوں سے دور چلی جاؤ۔"

وہ یہ سن کر مفلوج ہوکر رہ گئی۔ وہ یہ بات سننے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کی ذرا سی بات پر تڑپ جایا کرتی تھی اور اس کی خاطر وہ اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار ہوتی تھی، لیکن آج وہ یہ کہہ رہی ہے اور اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اس کا باپ، اُس کا دکھ لیے ملک بدر ہوچکا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے رونے کی آواز چیخوں میں بدل گئی۔

رونے کی آواز سن کر بہن بھائی بھی دوڑے چلے آئے، مگر اسے دیکھتے ہی نفرت سے نگاہ پھیر کر چلے گئے، کسی نے حال تو بجا سلام کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ رویہ دیکھ کر اسے آسمان اپنے اوپر گرتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے روتا چلاتا دیکھ کر ماں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ وہ غصے اور نفرت کے ملے جلے رویے میں کانپ رہی تھی۔

جب امر سے کچھ نہ ہوسکا تو وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی، جو کبھی اُس کا ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب اُس گھر میں اُسے کوئی اہمیت نہیں مل رہی تھی۔

وہ ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ کوئی اُس کا پرسانِ حال نہ تھا۔ ماں کا تند و تیز رویہ، بہن، بھائیوں کا اجنبیوں والا انداز، ہمسائیوں، رشتہ داروں اور قریبی لوگوں کے دل کو جلاتے اور جگر کو پھاڑتے ہوئے فقرے اور آوازیں...... وقت تو گزر رہا تھا، مگر امر اور اس کی امی مرغِ بسمل کی طرح کرب میں مبتلا تھیں کہ والد کی واپسی پر کیا ہوگا؟؟

☆......☆

آٹھویں سچ بیانی

سڑک چھاپ

الماس فاطمہ ارمان

کراچی سے ایک دوشیزہ کا سوال، جسے دکھوں

کی چادر نے پوری طرح ڈھانپ لیا تھا

ظلم ہوگا نہ کسی پر یہ کہا ہے اُس نے
یہ سچ ہے تو اس سچ کی ضمانت کیا ہے

ہر ظلم عورت سے شروع ہوکر عورت پر ہی کیوں ختم ہوتا ہے، بلکہ ختم تو کبھی نہیں ہوتا، کیوں کہ ظالم جتنا بھی ظلم کرلے، وہ یہی سمجھتا ہے میں یہ سب اچھا کررہا ہوں۔ کیا عورت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ کیا عورت انسان نہیں ہوتی۔ کیا اس کے سینے میں دل نہیں دھڑکتا۔ کیا وہ گوشت پوست سے بنی ہوئی حوا کی بیٹی نہیں ہے، پھر کیوں اُس کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ آخر کب تک یہ درندے صفت حیوان عورت پر ظلم کرتے رہیں گے۔

آج جو کہانی میں لکھنے جارہی ہوں، وہ بھی ایک مظلوم عورت کی ہے، جس نے اپنی محبت کی خاطر اپنا مذہب، اپنا گھر بار، بہن بھائی سب کو چھوڑ دیا۔ اُس محبت کے بدلے اُسے سڑک چھاپ بننا پڑا، اس کا اوڑھنا بچھونا سڑک پر مٹر گشت کرکے کچرے میں سے کچرا اُٹھانا اور اُسے فروخت کرکے اپنا پیٹ پالنا تھا۔

میری ملاقات بھی اماں زیتون سے راہ چلتے ہوئے ہی ہوئی تھی۔ وہ کچرے سے کھانے کی چیزیں اُٹھا کر تھیلی میں ڈال رہی تھی، میں صبر نہ کرسکی۔ میں ان کے پاس گئی اور ان سے بے ساختہ کہا۔ ”اماں! یہ گندی چیزیں کھاؤ گی۔“

”ہاں! تجھے کیا تکلیف ہے۔“ بڑی بی بڑے غضب میں بولی!

”مائی! غصے مت ہو، یہ کھا کر تو بیمار ہوجائے گی۔“ میں نے بڑے نرم لہجے میں ان سے کہا۔

”ہونے دو، پھر کیا کروں، کھانا کیسے کھاؤں، لا تو مجھے کھانے کے پیسے دے۔“ بڑی بی نے بڑے ترش لہجے میں کہا۔

میں نے انہیں پچاس روپے نکال کردیے تو وہ مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔ ”تیری اور تیرے بچوں کی خیر ہو۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔“

میرا ایک ہفتے بعد پھر اسی راستے سے گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ اماں کو افغانی کچرا اُٹھانے والے بچے پتھر مار کر کچرے کے ڈھیر سے بھگا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں زمین پر تھوڑی سی بریانی پڑی تھی، جس کو اماں بھی حاصل کرنا چاہتی تھی، مگر بچے اُس کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ اماں حسرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ میرے قریب آئی۔ ”بیٹی کیسی ہے؟“ انہوں نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتایئے، کیسی ہیں؟''
''بس دیکھ لے بچی۔ ایک وقت کھانے کے لیے ان بچوں سے پتھر کھا رہی ہوں۔ یہ بھی اپنی بھوک مٹانے کے لیے یہ سب کرتے ہیں۔'' اُن کے اُس جملے میں بہت درد تھا۔ ''لتاں کسی سے کھانا اللہ کے نام پر مانگ کر کیوں نہیں کھاتی ہو۔'' میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔
''بچی کوئی نہیں دیتا، جس سے مانگو اُن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ جمعرات کو آنا، ہم روز روز نہیں دیتے۔'' بنگلے والے تو ماسیوں کو دیتے ہیں جو اُن کا کھانا کچرے میں پھینک دیتی ہیں۔
''اچھا اماں، اگر میں تم کو روز کھانا دوں تو پھر تم کچرے میں سے نہیں اُٹھاؤ گی۔'' میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
''بیٹا کیوں اٹھاؤں گی، جب میرا پیٹ بھرا ہوگا۔'' بڑی بی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔''

میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ میں نے گھر آ کر اُن کو کھانا دیا۔ جب وہ کھانا کھا چکیں تو میں نے اُن کے لیے چائے بنائی۔ میرے اس رویے سے وہ اس قدر خوش تھیں کہ انہوں نے خوشی میں اپنی جھولی پھیلا کر مجھے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُن کو کریدا۔ ''لتاں! کیا آپ بالکل اکیلی ہیں؟ کوئی آپ کا نہیں ہے۔''
''تھا۔ کوئی......'' یہ کہہ کر وہ سوچوں میں گم ہوگئیں، پھر وہ مجھ سے گویا ہوئیں۔
ارمان بیٹا میں تم کو اپنی کہانی بتاتی ہوں۔ میں خیر پور کی رہنے والی ہوں۔ میں ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی...... میں نویں کلاس میں پڑھتی تھی کہ ایک مسلمان لڑکے حامد سے مجھے پیار ہوگیا۔ کس طرح؟ اس کے لیے تو میں یہی کہوں گی کہ ''محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔'' میں اسکول ٹائم میں حامد کے ساتھ پارک میں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ حامد نے مجھ سے محبت کے عہد و پیمان کیے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ ''اگر تم مجھے



نہ ملیں تو میں اپنی جان ختم کرلوں گا۔'' میں نے اُس کو بہت سمجھایا کہ حامد تم مسلم مذہب سے تعلق رکھتے ہو اور میں ہندو، مگر اس کا کہنا یہ تھا کہ ''محبت میں ان سب باتوں کو تسلیم کرتا ہی نہیں ہوں، ویسے بھی میرا مذہب پیار و محبت سکھاتا ہے۔''

ایک دن میرے تاؤ نے مجھے پارک میں حامد کے ساتھ بیٹھے ہوئے پیار و محبت کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ ابا سے کہا تو پہلی دفعہ ابا نے میرے اوپر ہاتھ اُٹھایا۔ بھائی نے بھی اُن کا ساتھ دیا، کیوں کہ میری نسبت ماموں کے بیٹے کے ساتھ طے تھی۔ ابا نے اماں سے کہا کہ شادی کی تیاری کرو اور تم اپنے بھائی سے کہہ دو کہ ہمیں ''شادی جلد ہی کرنا ہے۔'' شادی کی تیاریاں دونوں طرف شروع تھیں کہ مجھے حامد کی طرف سے سندیسہ ملا کہ ''گھر سے بھاگ چلو۔'' میں سہیلی کی مدد سے گھر چھوڑ کر حامد کے ساتھ کراچی آ گئی۔ رات کے اندھیرے بہت گہرے تھے۔ ہم نے ایک کچی بستی کی مسجد میں پناہ لی۔ صبح مولوی صاحب نے اس شرط پر نکاح پڑھایا کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔ ان کے کہنے پر میں مسلمان ہو گئی۔ مولوی صاحب نے میرا اسلامی نام زیتون بی بی رکھا، اس طرح ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ مجھے مسلم مذہب پہلے ہی سے بہت پسند تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی سے میں نے نماز پڑھنا سیکھی، قرآن پاک پڑھا۔ حامد نے محنت مزدوری کر کے اتنا پیسا کمایا کہ اُس نے بستی میں ایک چائے اور کھانے کا ہوٹل کھول لیا۔ ہمیں ہنسی خوشی رہتے ہوئے آٹھ سال گزر گئے۔ مجھے اولاد نہیں ہوئی۔ حامد نے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا، سب کا یہی کہنا تھا کہ ''یہ اللہ کی مرضی ہے، کیوں کہ ویسے تو سب کچھ ٹھیک ہے۔'' حامد کے ساتھ ہوٹل میں ایک بنگالی کام کرتا تھا۔ حامد کا اُس کے گھر آنا جانا تھا۔ وہیں سے میری بربادی شروع ہوئی۔ بنگالی کی بہن شاہدہ نے حامد کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ جب مجھے پتا چلا تو میں بہت روئی۔ میں نے حامد سے کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے اپنے ماں باپ، اپنا مذہب، دین دھرم سب چھوڑ کر تمہیں اپنا بنایا تھا اور تم دوسری عورت کے چکر میں پڑ گئے۔''

حامد کا جواب سن کر سکتے میں آ گئی۔ اُس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم نے میرے لیے سب کچھ کیا، مگر تم آٹھ سالوں میں مجھے اولاد جیسی نعمت نہیں دے سکیں، اس لیے میں نے شاہدہ سے نکاح کر چکا ہوں اور وہ میرے بچے کی ماں بھی بننے والی ہے۔ وہ چار مہینے کی حاملہ ہے۔ میں تو خود تم سے اس بارے میں بات کرنے والا تھا۔ میں ایک دو دن میں شاہدہ کو اسی گھر میں لا رہا ہوں۔'' اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''ہرگز نہیں میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، مگر یہ ظلم نہیں۔ آخر جب میرے اندر کوئی خرابی نہیں اور یہ رب کی مرضی ہے تو یہ سزا مجھے کیوں دے رہے ہو۔ یہ گھر میرا ہے۔ تمہیں شاہدہ کو چھوڑنا پڑے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی طرح حامد کی اور میری تکرار بڑھ گئی، آخر شاہدہ کی جیت ہوئی۔ شاہدہ کی ماں بہنوں نے مجھے بہت مارا۔ یہ دیکھو ڈنڈا مار کر میرا سر بھی زخمی کیا، بیس ٹانکے آئے، مگر میں گھر سے نہیں نکلی۔ روز شاہدہ حامد کو بھڑکاتی۔ شاہدہ نے آتے ہی پورے گھر پہ قبضہ کر لیا تھا۔ کھانا بھی مجھے اس طرح دیا جاتا، جیسے کتوں کے آگے ڈالا جاتا ہے۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

ایک دن حامد نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی، مگر حامد کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ میں اس شہر انجان سے شہر میں کافی دن بھوکی پیاسی سڑکوں پر مٹرگشت کرتی رہی، پھر ایک روز میں ندی کے کنارے بنگالیوں کی آبادی میں پہنچ گئی۔ سخت گرمی، بھوک اور پیاس سے میں ایک جھونپڑی کے قریب بے ہوش ہو گئی۔ جھونپڑی میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔ انہوں نے میری داستان سننے کے بعد اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ چورن چٹنی وغیرہ بیچ کر اپنا پیٹ پالتے تھے، ان کو دمے کی بیماری بھی تھی، چند دن سکون کے گزرے کہ وہ بھی دنیا سے چل بسے۔ ایک بار پھر میں اکیلی رہ گئی۔ میں اُسی جھونپڑی میں رہنے لگی۔ چوں کہ میں جوان تھی، شکل و صورت کی اچھی تھی۔ اس لیے

بہت سے لوگوں نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا، مگر میں نے اپنا حلیہ ہی بدل لیا، یعنی میں نے اپنے آپ کو پاگل بنالیا۔ گو کہ میں پاگل نہیں تھی، پھر وہ جھونپڑی بھی مجھ سے چھن گئی۔ بنگالی پاڑہ ٹوٹ گیا، کیوں کہ وہاں اب فلیٹ اور لیاری کا پل بن گیا ہے، جب سے میں اسی طرح مٹر گشت کرتی رہتی ہوں۔ رات کو پل کے نیچے ہی سو جاتی ہوں۔ وہاں میں نے پرانے کپڑوں اور پلاسٹک کے ٹکڑوں کے پیوند سے ایک جگہ بنائی ہے۔ اب آندھی طوفان، سردی گرمی میں یہی میری پناہ گاہ ہے۔

یہ داستان سنا کر وہ بڑی بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں نے اُن کو بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ ''اماں آج سے میں تمہاری بیٹی ہوں۔ میرے گھر کے دروازے ہر وقت آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔'' اس طرح وہ جب بھی اُن کا دل چاہتا، میرے پاس آجاتیں۔ میں نے اُن کو چند جوڑے کپڑے دیے اور کہا۔ ''آپ نہا دھو کر صاف ستھری ہو جایئے۔ یقین مانیے وہ صاف ستھری ہو کر ایک الگ ہی چیز نظر آئیں۔ وہ ہر جمعہ کو صبح سے میرے گھر آجاتیں۔ نہا دھو کر نماز پڑھتیں اور رمضان میں پورے روزے رکھتیں۔ اُن کا یہ رُوپ دیکھ کر میں نے اُن کو اپنے گھر رہنے کا کہا۔ تو وہ بولیں۔ ''نہیں بیٹا بیس سال سے فٹ پاتھ پر سونے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

وقت گزرتا گیا وہ میرے گھر دوپہر میں آجاتیں، کام میں میرا ہاتھ بٹا دیتیں۔ اگر میں بیمار ہو جاتی تو میرا ہر طرح ساتھ دیتیں۔ میں بھی اُن کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ اگر کسی دن نہ آتیں تو مجھے عجیب سا محسوس ہوتا۔ وہ ہر غم خوشی میرے ساتھ شیئر کرتیں۔ میں بھی اُن کو اپنی ماں کی طرح سمجھتی۔ جب میری بیٹی اُن کو نانی امی کہتی تو وہ پیار سے اُس کو ماتھا چوم لیتیں۔

ایک سال بہت سخت سردی پڑی۔ رمضان کا مہینہ تھا، وہ سحری میں آجاتیں، میں نے بہت کہا۔ ''اتنی سردی ہے، آپ اپنی سحری کا سامان لے جایا کریں، صرف چائے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' مگر وہ نہ مانیں۔ بولیں نہیں بھئی تیرے، ساتھ سحری کرنے کا مزہ ہی الگ ہے۔

بارہویں روزے سے وہ نہیں آئیں، پانچ دن گزر گئے تو مجھے تشویش ہوئی، پھر جہاں اُن کی پناہ گاہ تھی، میں وہاں گئی تو دیکھا کہ وہ تو سخت بخار میں بے ہوش پڑی ہیں۔ میں نے لوگوں کی مدد سے اُن کو رکشے میں ڈالا اور سیدھا عباسی اسپتال لے گئی۔ تمام چیک اپ اور ٹیسٹوں سے پتا چلا کہ اُن کو تو سخت نمونیا ہو گیا ہے۔ کچھ دن وہ وہاں اسپتال میں داخل رہیں۔ اس تمام وقت میں اُن کے پاس جاتی رہی اور اُن کی جو خدمت کر سکتی تھی وہ میں نے کی۔

مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے یہ وصیت کی کہ ''ارمان بیٹی! مجھے پتا ہے میں اب جی نہ پاؤں گی، مگر تم مجھے کفن دینا، میں اپنی بیٹی کے ہاتھوں سے کفن پہننا چاہتی ہوں۔''

اُن کی حسرت بھری نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اتنے عرصے میں انہوں نے مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ یہ درد وہی محسوس کر سکتا ہے، جس کی ماں بچپن میں اُسے چھوڑ کر مر گئی ہو۔ یہ درد میرا تھا۔ مجھے اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہ تھی۔

اس وصیت کے چوتھے دن اُن کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ایک بیٹی کا فرض نبھایا۔ کفن دفن میں نے ہی اُن کا کیا۔ آج بھی میں اپنے پیاروں کی فاتحہ کراتی ہوں، تو اُن کو بھی اُسے طرح یاد کر کے اشکبار ہو جاتی ہوں، خاص طور پر عید کے روز وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔

وہ میرا دیا ہوا سوٹ نہا دھو کر پہنتیں تو گلے لگا کر میرا ماتھا چوم لیتیں۔ کیا وہ سڑک چھاپ تھیں، نہیں...... اُن کو تو ایک مسلمان آدمی نے سڑک چھاپ بنا دیا تھا، جس آدمی کی خاطر انہوں نے اپنے ماں باپ، بہن بھائی کو چھوڑا تھا۔ خدا ہم مسلمانوں کو نیکی کی ہدایت دے، تا کہ کسی کے اعتبار ہم کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔

کیا یہ کہانی پڑھ کر کوئی غیر مسلم کسی مسلم پر بھروسا کرے گا۔ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے بھروسے اور اپنی انا کو قائم رکھیے۔ ہمیں کسی کا بھروسا اس طرح کھونا زیب نہیں دیتا۔

☆......☆

نویں سچ بیانی

پھر بہار آئی ہے



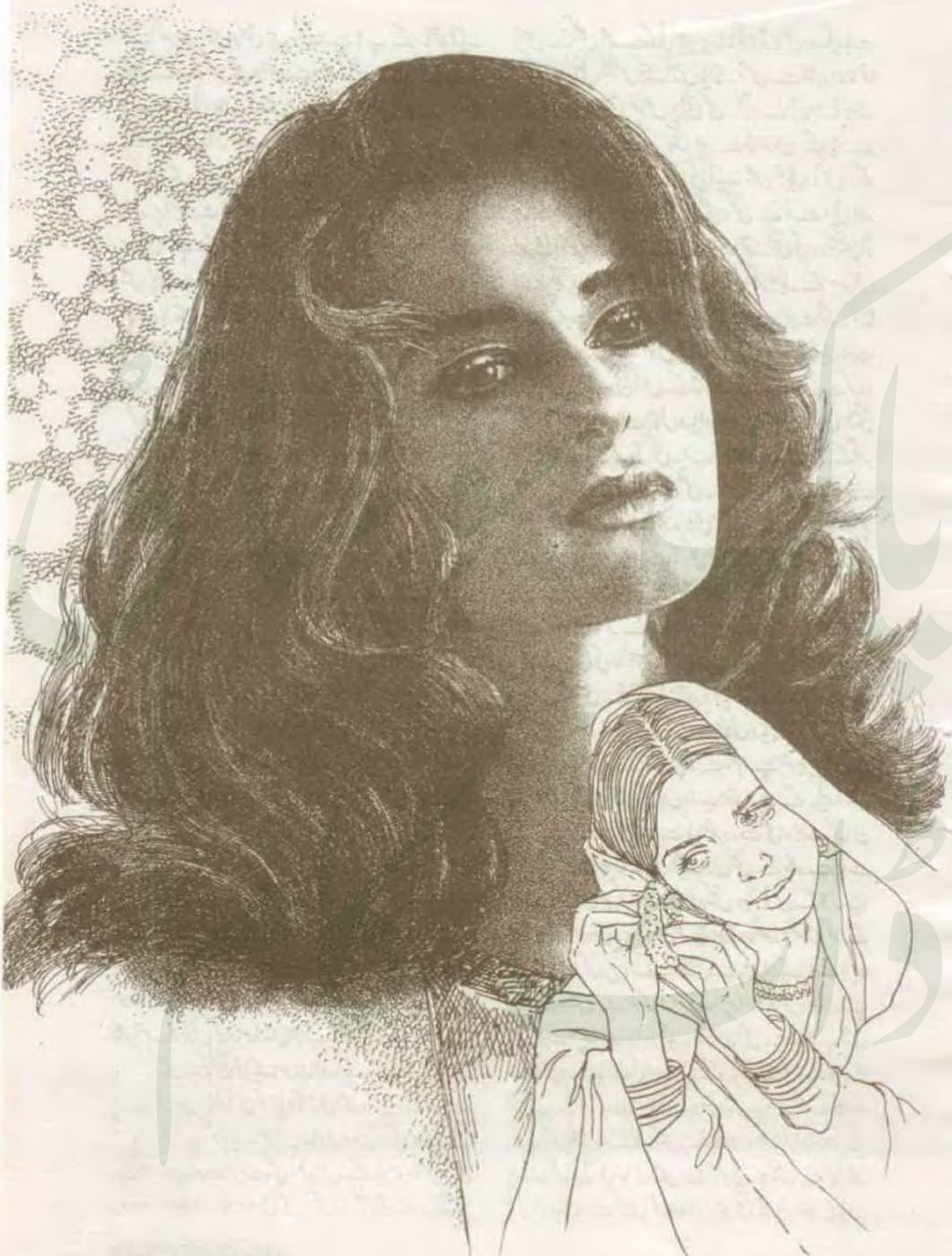
ممتاز احمد

سرگودھا سے سوکنوں کی دوستی کی ایک دل رُبا سچ بیانی

یہ اُس وقت کی بات ہے، جب میری عمر 38 یا 40 سال تھی۔ بہت اچھی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ زندگی بہت آرام سے اور مزے سے گزر رہی تھی۔ میری بہت اچھی جاب ہے، اپنا ذاتی گھر اور ایک گاڑی بھی ہے۔ کہانی کی شروعات اُس وقت ہوئی جب میں اپنے دفتر کے ایک کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے دوسرے شہر میں تھا اور ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔

شام کا وقت تھا، میں اپنے کمرے میں فارغ بیٹھا بور ہو رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل فون پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی تو میں نے فون اٹینڈ کر لیا۔ میرے ہیلو کہنے پر ایک لڑکی کی کھنکتی اور شوخ آواز آئی۔ جس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے وعلیکم السلام کہا تو لڑکی نے میرا حال پوچھا، تو میں نے جواب دیا کہ ”ٹھیک ہوں، مگر آپ کون بول رہی ہیں اور کس سے بات کرنی ہے؟“ تو اس پر لڑکی نے اپنا نام لبنٰی بتایا اور کہنے لگی کہ ”نمبر تو میں نے اپنی ایک دوست کا ملایا تھا اور اکثر اُس کا بھائی فون اٹینڈ کرتا ہے، تو میں نے آپ کو اپنی دوست کا بھائی سمجھ کر حال پوچھ لیا۔ اصل میں، میں بور ہو رہی تھی۔ مجھے 100 فری منٹس ملے تھے تو سوچا اپنی سہیلی سے گپ شپ لگاتی ہوں۔“ تو اس پر بے ساختہ میں نے کہا کہ ”لبنٰی صاحبہ میں بھی بور ہو رہا تھا اور فارغ بیٹھا تھا۔“ لبنٰی نے مجھ سے پوچھا کہ ”میں کیوں بور ہو رہا تھا؟“ تو میں نے مختصراً اُسے بتایا کہ ”دوسرے شہر میں ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہوں۔“ لبنٰی نے پوچھا کہ ”آپ کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے؟“ تو میں نے بتایا کہ ”میں شادی شدہ دو بچوں کا باپ ایک میچور مرد ہوں، کوئی کھلنڈرا لڑکا نہیں ہوں تو بھلا مجھ سے کون لڑکی دوستی کرے گی؟“ اس پر لبنٰی کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی کہ ”دوستی میں عمر، اسٹیٹس اور شادی شدہ ہونا نہیں دیکھا جاتا، دوستی تو بس دوستی ہوتی ہے۔“ جس پر میں نے کہا کہ ”کیا آپ مجھ سے دوستی کرنا پسند کریں گی......؟“ لبنٰی نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا کہ ”نام کیا ہے، کیا کرتا ہوں اور کس شہر میں رہتا ہوں“ اور ساتھ یہ شرط بھی رکھی کہ جھوٹ نہیں بولنا تب میں نے اُسے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

قصہ مختصر ہماری دوستی ہو گئی۔ لبنٰی بھی اُسی شہر میں رہتی تھی جس میں، میں رہتا تھا۔ لبنٰی نے اپنے اور اپنے گھر کے حالات یوں بتائے کہ وہ میٹرک پاس ہے، اُس کی ماں فوت ہو چکی ہے، بھائی کوئی نہیں ہے، وہ کُل چار بہنیں ہیں۔ وہ سب سے چھوٹی ہے، باقی تین بہنیں اُس سے بڑی ہیں، جن کی شادیاں ہو چکی ہیں اور سب اپنے



اپنے گھروں میں رہتی ہیں، لبنیٰ اپنے باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی ہے، جو کہ شہر سے بالکل قریب ایک مضافاتی علاقے میں ہے، لبنیٰ کا باپ ایک سرکاری محکمے سے ریٹائرمنٹ کے بعد شہر کے ایک پرائیویٹ اسکول میں چپڑاسی ہے۔ تین ہزار پنشن ملتی ہے اور چار ہزار پرائیویٹ اسکول سے تنخواہ، تو اس طرح گزر بسر ہو رہی ہے۔ لبنیٰ کی ابھی منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی تھی۔

میں پورے چھ دن دوسرے شہر میں رہا اور ہماری کال پر خوب باتیں ہوتیں! پھر میں واپس اپنے شہر آ گیا۔ ہماری روزانہ فون پر بات ہوتی، مجھے لبنیٰ کے ساتھ اپنائیت سی ہو گئی۔ تین چار ماہ بعد لبنیٰ نے ملاقات پر زور دینا شروع کر دیا۔ پہلے تو میں ٹالتا رہا، پھر اُس کے بے حد اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور مقررہ دن اور ٹائم پر ہماری ملاقات ہو گئی۔ ایک ریسٹورنٹ میں ہم نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ لبنیٰ کی عمر 20 یا 21 سال تھی۔ بہت خوب صورت، گورا رنگ اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت شرم محسوس ہوئی کہ کہاں بیس سال کی لڑکی اور کہاں میں چالیس سال کا مرد۔ اس عمر میں مجھے زیب نہیں دیتا کہ بیوی کے ہوتے ہوئے جوان لڑکی سے دوستی رکھوں۔ لبنیٰ نے میری خاموشی کو محسوس کیا اور زور دے کر پوچھا کہ کیا وہ مجھے اچھی نہیں لگی؟ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ تو میں نے جواب دیا کہ لبنیٰ تم بہت اچھی خوب صورت اور پیاری ہو۔ ہم دونوں کی عمر میں بہت فرق ہے۔ میں تم سے بیس سال بڑا ہوں اور مجھے اچھا نہیں لگ رہا، تو لبنیٰ نے کہا کہ ناصر صاحب ہمارے درمیان صرف پاکیزہ دوستی ہے، ہمارا تعلق غلط نہیں ہے۔ میں آپ سے اپنے دکھ درد شیئر کرتی ہوں۔ آپ سلجھے ہوئے مہذب انسان ہیں، آپ ایسا کچھ محسوس نہ کریں۔ الغرض اُس کی حوصلہ افزائی پر میں نے عمر والی بات کو دل سے نکال دیا، پھر ہم نے خوش گوار موڈ میں خوب باتیں کیں۔

میں نے لبنیٰ کو ایک سوٹ اور ایک شال تحفہ کے طور پر لے کر دی، پھر اُس کو اپنی گاڑی میں اُس کے گھر کے قریب ڈراپ کر دیا۔ الغرض ہماری دوستی چلتی رہی۔ لبنیٰ کے گھر میں بہت غربت تھی، مگر اس کے باوجود اُس میں رکھ رکھاؤ، انا اور خودداری تھی، جس کا عملی ثبوت یہ تھا کہ اُس نے کبھی مجھ سے کوئی چیز پیسا مانگنا تو بڑی دور کی بات کبھی موبائل بیلنس تک نہیں مانگا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کی دوستی خلوص پر مبنی تھی۔ لبنیٰ نے آہستہ آہستہ مجھے نہ صرف اپنے گھر بلکہ پورے خاندان کے بارے میں تفصیل بتا دی تھی۔ لبنیٰ کی ایک بہن نبیلہ، جس کے ساتھ اُس کی بہت فرینکنس تھی، لبنیٰ نے اُسے اپنی اور میری دوستی کے بارے میں بتایا ہوا تھا۔ لبنیٰ کی دو بہنیں تو اپنے گھروں میں خوش اور سکھی تھیں، مگر نبیلہ کے سسرال والے بہت ظالم تھے۔ اُس کا شوہر اُسے بہت تنگ کرتا مار پیٹ روزانہ کا معمول تھا، جس کی وجہ سے نبیلہ بہت دکھی تھی۔ ایک دن اُس کے خاوند نے نبیلہ کو مار پیٹ کر دو بچوں سمیت گھر سے نکال دیا اور وہ بے چاری روتی پیٹتی اپنے باپ کے گھر آ گئی۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ لبنیٰ کے گھر میں پہلے ہی بہت غربت تھی۔ اُس کا والد ایک ضعیف العمر شخص تھا۔ گھر کا گزارہ بڑی مشکل سے ہو رہا تھا، اوپر سے نبیلہ دو بچوں سمیت آ گئی تو اخراجات بڑھ گئے اور ان کے گھر پریشانی رہنے لگی۔ نبیلہ نے اپنے خاوند کو بہت فون کیے کہ آ کر لے جاؤ، مگر اُس نے سختی سے انکار کر دیا کہ اب اُس کی واپسی ناممکن ہے۔ اسی طرح تین چار ماہ گزر گئے کسی نے نبیلہ کو مشورہ دیا کہ تمہارے شوہر نے تمہیں بلاوجہ مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے، مگر وہ تمہارا اور بچوں کا خرچہ دینے کا پابند ہے، تم اپنے شوہر پر خرچے کا مقدمہ کیوں نہیں کرتیں، اب مقدمے کے لیے وکیل کی فیس اور دیگر اخراجات کی ضرورت تھی، جب کہ ان کے پاس کوئی پیسا نہ تھا۔ ایک دن لبنیٰ نے مجھ سے بات کی کہ اگر کوئی میرا جاننے والا وکیل ہو تو اُس کے ذریعے کیس کروا دوں، جتنا بھی خرچ ہو گا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے بعد میں ادا کر دیں گے۔ اتفاق سے میرا ایک بہت اچھا دوست وکیل ہے جو کہ نہ صرف اچھا اور قابل وکیل ہے بلکہ بہت اچھا ہمدرد اور نیک انسان بھی ہے۔ جب میں نے اُس سے بات کی اور نبیلہ کے سارے حالات بتائے تو اُس نے کہا کہ وہ انسانی ہمدردی میں یہ کیس لڑے گا اور کوئی فیس نہیں لے گا۔ فیس کے علاوہ دیگر اخراجات کے پورے کرنے کی حامی میں نے بھر لی۔ وکیل نے کہا کہ اُس عورت سے کہیں کہ وہ اپنا شناختی کارڈ، نکاح نامہ

وغیرہ لے کر میرے چیمبر میں آ جائے، میں نے لبنیٰ کو فون کر کے بتا دیا۔ لبنیٰ نے مجھے اپنی سہیلی کا بڑا بھائی ظاہر کر کے اپنے باپ کو ساری بات بتائی اگلے دن نبیلہ اُس کا باپ اور لبنیٰ شہر آ گئے، جن کو میں لے کر وکیل کے چیمبر میں آ گیا۔ اُس دن میں پہلی مرتبہ لبنیٰ کے والد سے ملا اور نبیلہ کو دیکھا، جو کہ ایک 35 سال کی خوب صورت عورت تھی۔ جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور شرمیلا پن تھا۔ وہ ایک نہایت سلجھی ہوئی، تمیز دار نیک اور شریف مگر مظلوم عورت تھی۔ اُس نے تمام حالات وکیل کو بتائے، جس کے مطابق اُس کی ساس بہت ظالم عورت ہے اور چینی، پتی، نمک، مرچ تک تالے میں رکھتی ہے اور وہ ساس کی اجازت اور مرضی کے بغیر ایک کپ چائے کا بھی بنا کر نہیں پی سکتی۔ ساس طعنے دیتی ہے کہ تم جہیز میں کچھ نہیں لے کر آئی ہو۔ اُس کا شوہر نکما کوئی کام نہیں کرتا اور بات بات پر نبیلہ کو مارتا ہے۔ اب اُس نے چار ماہ پہلے ایک کپ اور پلیٹ ٹوٹنے کی وجہ سے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے اور وہ اپنے باپ کے گھر آ گئی ہے، جہاں پہلے ہی غربت ہے۔ اس کے بچے دودھ اور خوراک سے محروم ہیں۔ اُس کے تمام حالات جاننے کے بعد وکیل نے وکالت نامے پر دستخط کروا کر کیس تیار کیا اور عدالت میں خرچے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد نبیلہ، لبنیٰ اور ان کے والد کو میں اپنی گاڑی میں چھوڑنے ان کے گھر گیا تو اس طرح میں نے لبنیٰ کا گھر اندر سے دیکھا۔ کیس کی تیاری میں جتنے بھی اخراجات ہوئے وہ سب میں نے ادا کیے۔ مہینے میں کیس کی دو تاریخیں پڑتیں اور ہر تاریخ پر نبیلہ اور اُس کا والد عدالت میں وکیل کے ہمراہ پیش ہوتے، جب کہ عدالت کے بار بار طلب کرنے پر نبیلہ کا شوہر غیاث عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ جب اخباری اشتہار کے بعد بھی غیاث عدالت میں حاضر نہ ہوا تو بالآخر عدالت نے نبیلہ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور نبیلہ کے شوہر غیاث کو حکم دیا کہ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے نبیلہ اور اس کے بچوں کو آٹھ ہزار روپے ماہوار خرچہ ادا کرے گا، بلکہ پچھلے آٹھ ماہ کا خرچہ تقریباً پچاس ہزار روپے بھی ادا کرنے کا پابند ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اُسے جیل جانا ہوگا۔

پہلے تو غیاث جان بوجھ کر عدالت میں حاضر نہیں ہو رہا تھا، مگر جب اُس کو عدالت کے فیصلے اور حکم کا علم ہوا تو وہ فوراً نبیلہ کو راضی کرنے اور واپس گھر لے جانے کے لیے آ گیا، مگر اب نبیلہ واپس اپنے سسرال نہیں جانا چاہتی تھی۔

غیاث نے اپنی بیوی اور سسر کی بہت منت سماجت کی، مگر نبیلہ نے اپنے سسرال جانے سے انکار کر دیا۔ غیاث نے کافی چکر لگائے، مگر نبیلہ واپس سسرال جانے پر رضامند نہ ہوئی اور پیسوں کا مطالبہ کرتی رہی۔

کچھ دن کے بعد نبیلہ کا شوہر اپنی ماں، بہنوں، بھائیوں، بھابیوں اور خاندان کے دیگر بزرگ معززین کو لے کر نبیلہ کے گھر آیا۔ وہ اپنے سابقہ رویّہ پر معافی مانگنے اور نبیلہ کو واپس لینے آئے تھے۔ اس ساری بات کی اطلاع نبیلہ اور اُس کے والد نے مجھے فون پر دی اور مجھ سے مشورہ طلب کیا تو میں نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ اب غیاث قابو میں آ چکا ہے اب وہ عدالت کے فیصلے سے بھاگ نہیں سکتا۔ اب بہتر ہے اپنا گھر خراب نہ کرو، وہ طلاق بھی دے سکتا ہے تو اس موقع پر اپنی شرطیں منوا کر جیب خرچ طے کر کے واپس اپنے خاوند کے گھر چلی جاؤ۔ چناں چہ وہ سب وکیل کے پاس گئے جہاں پر نبیلہ اور اُس کے خاوند کا راضی نامہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ غیاث نبیلہ کو الگ گھر لے کر دے گا۔ مار پیٹ گالی گلوچ نہیں کرے گا اور گھر کے خرچ کے علاوہ ہر ماہ نبیلہ کو جیب خرچ بھی دے گا، لہٰذا ان تمام شرائط کو ماننے اور صلح نامہ پر دستخط کرنے کے بعد نبیلہ اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی، جہاں شرائط کے مطابق نبیلہ کو الگ گھر مل گیا اور وہ سکون سے رہنے لگی۔

اس واقعے کے بعد لبنیٰ اور اُس کا والد غلام حسین میرے بہت ممنون تھے۔ کبھی کبھی نبیلہ بھی مجھے فون کر کے بتاتی کہ وہ اب بہت سکھی ہے۔ وہ بھی میری شکر گزار تھی اور مجھے بہت دعائیں دیتی۔ میں اُن سے یہی کہتا کہ یہ سب اللہ کا کرم ہے، میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ وقت گزرتا رہا اور ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ لبنیٰ سے میری فون پر بات بھی ہوتی اور مہینے میں ایک آدھ بار میرا اس کے گھر چکر بھی لگ جاتا۔ میرا ضمیر مجھے اکثر ملامت کرتا کہ یہ

اچھی بات نہیں ہے کہ ایک لڑکی سے دوستی کی ہوئی ہے اور میں اپنی بیوی سے بھی بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہوں، مگر جب یہ خیال آتا کہ لبنیٰ سے پاکیزہ دوستی ہے، ہمارے تعلق میں پاکیزگی ہے اور آج تک کبھی لبنیٰ کو چھوا بھی نہیں تو میں تھوڑا سا مطمئن ہو جاتا۔

وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ پر لگا کر اُڑتا رہا۔ ایک دن لبنیٰ نے بتایا کہ اُس کا رشتہ آیا ہے، معقول فیملی ہے اور لڑکا باہر کے ملک ہوتا ہے۔ شادی کے بعد لبنیٰ اپنے خاوند کے ساتھ باہر چلی جائے گی۔ الغرض چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا اور لبنیٰ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ میری حیثیت اب لبنیٰ کے گھر کی فیملی ممبر جیسی تھی۔ میں نے شادی میں بھرپور شرکت کی۔ اپنی بساط کے مطابق مجھ سے جو ہو سکا کیا اور لبنیٰ کے باپ کی مالی مدد بھی کی۔ لبنیٰ بیاہ کر اپنے سسرال اور پھر اپنے خاوند کے ساتھ بیرون ملک چلی گئی۔ لبنیٰ کی شادی کے بعد مجھے اُس کی بہت کمی محسوس ہوتی اور ایک خالی پن کا احساس ہوتا۔ میری پروموشن ہونے والی تھی، مگر دفتر کے کچھ حاسد اور میرے مخالف کولیگز جو مجھ سے بہت خار رکھتے تھے، کیوں کہ میں رشوت لینے اور دینے کے سخت خلاف ہوں، انہوں نے میرے خلاف جھوٹی درخواستیں اور شکایتیں کرنی شروع کر دیں اور ملی بھگت سے نہ صرف میری پروموشن رکوا دی، بلکہ میرے خلاف ایک جھوٹا کیس بنا دیا اور اپنے اثر رسوخ سے جھوٹی گواہیاں دے کر مجھے انکوائری کمیٹی کے آگے گنہگار ثابت کر دیا۔ سزا کے طور پر بجائے ترقی کے میری نچلی پوسٹ پر (Reverse) تنزلی کر دی گئی۔ میرے مخالف جونیئر نے پروموشن لے لی اور سرخ و سیاہ کا مالک بن گیا۔ مجھے ہر معاملے میں تنگ کیا جانے لگا۔ میں نے محکمہ میں اپنی سزا کے خلاف اپیلیں کیں، مگر میری کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر میں نے عدالت میں کیس دائر کر دیا۔ میں بہت پریشان رہنے لگا، جس کی وجہ سے میری صحت گرنے لگ گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال میرا کیس چلتا رہا۔ کیس لٹکتا جا رہا تھا، کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

کچھ عرصہ گزرا تو میری زندگی میں ایک بہت بڑا سانحہ رونما ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ اپنے سسرال جھنگ سے اپنی کار پر واپس اپنے شہر آ رہے تھے کہ ہماری گاڑی کا شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ گاڑی تباہ ہو گئی، ہم سب بُری طرح زخمی ہو گئے، جب ہوش آیا تو اسپتال میں تھے۔ میرا ایک بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا اور چار پسلیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ ہمیں بہت زیادہ چوٹیں آئیں، دونوں بچے بھی بُری طرح زخمی ہوئے۔ میری بیوی کو شدید چوٹیں آئیں، اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا۔ وہ بہت کڑا وقت تھا جو ہم سب نے شدید اذیت میں گزارا۔ ہم تقریباً ایک ماہ اسپتال میں رہے۔ میں اور دونوں بچے تو چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے، مگر میری بیوی کا ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر کی وجہ سے نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی تو اُسے وہیل چیئر پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ ڈاکٹر نے مجھے چار ماہ کا مکمل ریسٹ علاج کے ساتھ تجویز کیا۔ گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ بچوں کا اسکول جانا بند ہو گیا، بیوی معذور ہو گئی۔ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے معافیاں مانگتا، دعائیں کرتا کہ پتا نہیں کس گناہ کی مجھے سزا ملی تھی۔

ایک دن مجھے نبیلہ اور لبنیٰ کے والد کا فون آیا اور انہوں نے شکوہ کیا کہ اتنا عرصہ ہو گیا ہے میں نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ میں نے اُن کو اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتا دیا۔ وہ بہت دُکھی ہوئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اگلے ہفتے لبنیٰ ایک ماہ کی چھٹی پر اپنے خاوند کے ساتھ پاکستان آ رہی ہے، اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ نبیلہ کے سسرال میں اُس کے دیور اور نند کی شادی ہے۔ اگلے روز لبنیٰ کے والد ہمارے گھر آئے اور ہم سب کی خیریت پوچھی، بہت ہمدردی کی اور ہم سب کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا کی۔ تقریباً ایک ہفتے بعد لبنیٰ پاکستان آئی اور اپنے والد اور خاوند کے ساتھ نبیلہ کے سسرال شادی میں شرکت کے لیے چلی گئی۔ کوئی چار یا پانچ دن کے بعد مجھے لبنیٰ کے والد کا فون آیا انہوں نے روتے ہوئے بتایا کہ شادی کی تقریب میں ہوائی فائرنگ کی زد میں آ کر نبیلہ کا خاوند غیاث فوت ہو گیا ہے۔ شادی والے گھر میں کہرام مچ گیا۔ یہ خبر سن کر مجھے بہت دُکھ ہوا کہ نبیلہ بے چاری بیوہ ہو گئی تھی۔ غیاث کے دسویں کے بعد نبیلہ اپنے والد کے

ساتھ آ گئی، کیوں کہ اُس کے سسرال والے پہلے ہی بہت ظالم تھے، جب نبیلہ کا خاوند ہی نہ رہا تو اُس نے وہاں کیا کرنا تھا، کون تھا جو اُس کا سہارا بنتا۔ لُبنیٰ اپنے والد کے ساتھ ہمارے گھر ہماری خیریت پوچھنے آئی۔ جب وہ چلی گئی تو میری بیوی نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے، تو میں نے اُس دن اپنی بیوی کو شروع سے آخر تک لُبنیٰ سے دوستی وغیرہ کا سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور اپنی بیوی سے معافی بھی مانگی کہ اس عمر میں، میں نے ایک لڑکی سے دوستی کی تھی۔ میری بیوی بہت سمجھ دار، صابر اور حوصلے والی ہے۔ ساری بات سننے کے بعد اُس نے کو ہلکا سا شکوہ ضرور کیا، مگر جب اُس کو بتایا کہ ہماری دوستی پاکیزہ تھی، کبھی لُبنیٰ کو چھوا تک نہیں، بلکہ ہر موڑ پر نیک نیتی اور خلوص سے مدد کی۔ نبیلہ کا بتایا کہ کس طرح اُس کا کیس دائر کروایا وغیرہ وغیرہ، تو اُس نے مجھے کھلے دل سے معاف کر دیا کہ آپ کی نیت بُری نہیں تھی۔ بہر حال اُس نے یہ ضرور کہا کہ مرد عورت کی دوستی اگر چہ پاکیزہ ہی ہو، مگر شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ نامحرم مرد عورت کا آپس میں بلا ضرورت بات کرنا غیر ضروری باتیں کرنا بھی ناجائز ہے۔

اب آہستہ آہستہ میری صحت بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ دونوں بچے بھی مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تھے اور انہوں نے دوبارہ اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ میری بیوی کی ٹانگ کا پلستر بھی اُتر گیا تھا اور ہڈی بھی جڑ گئی تھی، مگر ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ اُس کا علاج جاری تھا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ محکمے کی طرف سے مجھے میڈیکل کی سہولت تھی، جس کی وجہ سے مہنگے سے مہنگا علاج ہو رہا تھا۔ جب میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا اور چھٹی بھی ختم ہو گئی تو میں نے آفس جانا شروع کر دیا، مگر مسئلہ بیوی کی دیکھ بھال کا تھا۔ وہ بے چاری تو ہر وقت وہیل چیئر پر رہتی۔ زندگی بہت کٹھن ہو گئی تھی۔ دس دن کے بعد میری عدالت میں تاریخ تھی۔ وکیلوں کی بحث وغیرہ تمام کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ چناں چہ عدالت نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا اور حکم دیا کہ جس تاریخ سے مجھے نچلی پوسٹ پر لگایا گیا تھا، اُسی تاریخ سے مجھے میری پہلے والی پوسٹ پر لگا دیا جائے۔ عدالت نے مجھے بے گناہ قرار دیا تھا، چناں چہ نہ صرف مجھے اپنی پوسٹ پر بحال کیا گیا، بلکہ اُسی تاریخ سے پرموشن بھی دے دی گئی اور تمام واجبات بھی مجھے ادا کر دیے گئے۔

ہم سب بہت خوش تھے۔ شکرانے کے نوافل ادا کیے، ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے۔ میری گاڑی جو حادثے میں تباہ ہوئی تھی، اس کی انشورنس کروائی ہوئی تھی تو انشورنس کمپنی کی طرف سے مجھے کافی رقم مل گئی اور جو بقایا جات کی رقم محکمے کی طرف سے ملی سب پیسے ملا کر نئی گاڑی خرید لی۔ لُبنیٰ کے والد کا اکثر مجھے فون آتا رہتا۔ نبیلہ کی عدت پوری ہو چکی تھی۔ ایک دن وہ بھی اپنے باپ کے ہمراہ ہمارے گھر آئی۔ میں نے اب تقریباً اُن کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا، بس صرف نبیلہ کے والد سے فون پر بات ہوتی۔ ہمارے گھر میں بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے تھے، گو کہ ایک ملازمہ کل وقتی گھر میں تھی جو کہ تمام کام کاج اور کھانا پکانے کے علاوہ میری بیوی کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی، مگر اس کے باوجود گھر کی حالت بہت ڈسٹرب تھی۔ مجھ سے بیوی کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ علاج جاری تھا، ہر نماز کے بعد اُس کی صحت یابی کے لیے دعا بھی کرتا تھا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ انہی حالات میں وقت گزر رہا تھا۔ ایک دن نبیلہ کا فون آیا کہ اُس کے والد فوت ہو گئے ہیں، مجھے کافی شاک لگا، فوراً ان کے گھر گیا اور تجہیز و تدفین میں شرکت کی۔ کھانا وغیرہ بنوا کر دیا، کچھ مالی مدد بھی کی۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد نبیلہ بے چاری بالکل تنہا اور بے سہارا ہو گئی، کوئی آسرا نہ تھا۔ بیوگی کا دکھ، چھوٹے چھوٹے دو بچے اور کوئی ذریعۂ آمدنی نہ رہا تو میں نے ہر ماہ اُس کی مالی معاونت شروع کر دی، مگر وہ بڑی مشکل سے پیسے لیتی۔

ایک دن وہ بچوں کے ہمراہ ہمارے گھر آئی او رکہنے لگی کہ دو تین کوٹھیوں میں مجھے گھر کا کام دلوا دیں، ملازمہ رکھوا دیں، تا کہ وہ خود محنت کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔ میں نے وعدہ کیا کہ جلد ہی جیسے ہی کسی مناسب اور شریف لوگوں کو کسی ملازمہ کی ضرورت ہوئی تو میں کام دلوا دوں گا۔ دراصل نبیلہ بہت خوب صورت، جوان اور شریف عورت تھی، اس لیے یہ بہت

ضروری تھا کہ کسی اچھے گھر میں اس کو کام دلواؤں، جہاں اُس کی عزت بھی محفوظ رہ سکے۔ ایک دن ہم میاں بیوی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ میں نبیلہ سے نکاح کرلوں، کیوں کہ بقول اُس کے اب وہ شاید ہی کبھی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے گی، ساری زندگی کی معذوری اب اس کا مقدر ہے۔ اس طرح نبیلہ کو سہارا بھی مل جائے گا اور ہمارے گھر کا نظام بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بیوی کو اس بات کا بہت دُکھ تھا کہ وہ اب میری خدمت کرنے کے قابل نہیں رہی، اُلٹا میں اُس کی دیکھ بھال اور خدمت کرتا ہوں، مگر میں نے اپنی بیوی کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ دی کہ اگر خدانخواستہ میں اس طرح معذور ہو جاتا تو کیا تم مجھے چھوڑ کر کسی اور سے نکاح کر لیتیں......؟

میں نے کہا کہ تم میری زندگی کی ساتھی ہو، میں تم پر کبھی سوکن نہیں لاؤں گا اور خدا کی ذات سے بہت پر امید ہوں کہ وہ تمہیں ضرور صحت اور تندرستی عطا فرمائے گا...... مگر میری بیوی اپنی بات پر اڑی رہی اور اسی موضوع پر ہماری روزانہ تکرار ہوتی۔ کوئی ایک ہفتہ گزرا تو نبیلہ کا فون آیا اور اُس نے روتے ہوئے بتایا کہ کچھ اوباش مردوں نے اُسے تنہا اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے اُس کے گھر میں داخل ہو کر اُس کی عزت برباد کرنے کی کوشش کی، مگر اُس کے شور مچانے پر وہ بھاگ گئے اور اڑوس پڑوس کے لوگوں نے اُس کی مدد کی، میں فوراً اُس کے گھر پہنچا اور سارے حالات جاننے کے بعد متعلقہ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ کی۔ تھانے دار میرا واقف تھا، اُس نے نبیلہ کی نشاندہی پر دو بندوں کو پکڑا اور تھانے لے جا کر اُن کی خوب چھترول کی، بعدازاں علاقے کے معززین نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ اُن بندوں سے معافی نامہ لکھوا کر اور ان کی ضمانت اور آئندہ ایسا نہ ہونے کی یقین دہانی پر ان بندوں کو سخت وارننگ دے کر چھوڑ دیا۔ اب نبیلہ بہت خوف زدہ رہنے لگی اور اصرار کرنے لگی کہ جلد کہیں کام پر لگوا دیں۔ اب میری بیوی کا بہت اصرار بڑھ گیا کہ میں نبیلہ سے نکاح کرلوں، کب تک اُس کی حفاظت کروں گا، کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرے اس طرح آنے جانے سے لوگ باتیں بنائیں گے کہ میرا اُس سے کیا رشتہ ہے؟ میں کس حیثیت سے اُس کے گھر جاتا ہوں۔ لوگوں کو کیا جواب دوں گا......؟ اس طرح تو نبیلہ کی عزت پر حرف آئے گا، لوگ اُس پر کیچڑ اُچھالیں گے۔ میں نے بھی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ بات تو میری بیوی کی درست تھی۔

میری بیوی نے مجھے اپنی قسم دے کر مجبور کر دیا۔ میں نے اگلے دن نبیلہ کو فون کیا۔ ساری بات اُس کو بتائی تو وہ خاموش ہو گئی اور فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ رات کو میری بیوی نے فون پر اُس کے ساتھ تفصیل سے بات کی اور اُسے سمجھایا تو اُس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔ بالآخر سوچ بچار اور اپنی تینوں بہنوں بہنوئیوں سے مشورہ کے بعد مجھ سے نکاح کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا اور ایک دن سادگی سے نکاح کے بعد نبیلہ میری بیوی بن کر آ گئی۔

نبیلہ نے آتے ہی پورا گھر سنبھال لیا۔ اُس کے دونوں بچوں کو میں نے اپنے بچوں کے ساتھ اسکول میں داخل کروا دیا اور باپ کی شفقت، محبت اور پیار دیا۔ نبیلہ نے میری پہلی بیوی کی جی جان سے خدمت شروع کر دی۔ ملازمہ کو فارغ کر دیا اور گھر کے تمام کام کھانا بنانا، صفائی ستھرائی، کپڑے دھونا، میری بیوی کی دیکھ بھال اور ہر طرح سے خیال رکھنا شروع کر دیا۔ نبیلہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی اور ہر نماز کے بعد رو رو کر میری پہلی بیوی کی صحت یابی کی دعائیں کرتی۔ میں نے ڈاکٹر کے مشورے پر لاہور کے ایک بہت بڑے قابل اور پروفیسر ڈاکٹر آرتھوپیڈک سرجن اور نیورو سرجن سے رابطہ کیا، جنہوں نے میری بیوی کے کافی سارے ٹیسٹ، MRI وغیرہ کروائے اور آپریشن تجویز کیا، جس کی کامیابی کے چالیس فیصد چانس تھے اور ساٹھ فیصد ناکامی کے امکانات تھے۔ بقول سرجن ڈاکٹر کے میری بیوی چلنے پھرنے سے تو پہلے ہی معذور ہے۔ آپریشن اگر کامیاب نہ بھی ہوا تو حالت اسی طرح رہے گی، لہٰذا رسک لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کافی سوچ بچار اور صلاح مشورہ کے بعد ہم نے آپریشن کروانے کا فیصلہ کر لیا۔

اپنی پہلی بیوی ریحانہ کو ایمبولینس میں لاہور

لے جا کر اسپتال میں داخل کروادیا۔ نبیلہ نے ریحانہ کی صحت یابی اور آپریشن کی کامیابی کے لیے ایک ماہ کے روزے رکھنے، پانچ ہزار نوافل ادا کرنے اور داتا علی ہجویریؒ کے دربار پر حاضری اور لنگر کی تقسیم کی منت مانی۔ نبیلہ اور بچے ریحانہ کے ساتھ ہی لاہور آ گئے۔ اسپتال میں داخلے کے بعد دوبارہ تمام ٹیسٹ اور چیک اپ ہوا اور ڈاکٹر نے دو دن بعد آپریشن کی تاریخ دے دی۔ جس وقت ریحانہ کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تو نبیلہ نے جائے نماز پر بیٹھ کر نوافل پڑھنے اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کردی اور رو رو کر ریحانہ کی صحت یابی اور آپریشن کی کامیابی کی دعائیں مانگنی شروع کردیں۔ سب بچوں سمیت ریحانہ کے لیے دعا گو تھے۔ چار گھنٹے کا طویل آپریشن ہوا۔ ہم سب بہت سخت پریشان تھے کہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ خدا خدا کرکے آپریشن ختم ہوا۔ ریحانہ کو ICU میں شفٹ کردیا گیا۔ دو گھنٹے کے بعد ریحانہ کو ہوش آیا۔ ڈاکٹر مسلسل چیک کررہا تھا۔ رات کو ریحانہ کے پیروں اور ٹانگوں میں جب ہلکی ہلکی حرکت شروع ہوئی تو ڈاکٹر نے آپریشن کی کامیابی کی خبر سنادی۔ ہم سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ پورا ایک ہفتہ ریحانہ کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا، پھر کمرے میں شفٹ کردیا۔ مسلسل فزیوتھراپی دوائیوں سے ریحانہ کی ٹانگیں حرکت کرنے لگ گئیں۔ میں نے اور نبیلہ نے داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دی، سلام کیا اور لنگر کی دیگیں تقسیم کیں۔ صدقہ خیرات دیا اور بیس دن کے بعد ریحانہ کو اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ ہم اُسے لے کر گھر آ گئے۔ مہینے میں دو مرتبہ چیک اپ ہوتا۔

ریحانہ کو مکمل طور پر ٹھیک ہونے میں چھ ماہ لگ گئے اور اس عرصے میں نبیلہ نے اپنے اوپر ہر طرح کا آرام حرام کرلیا۔ دن رات ریحانہ کی خدمت اس طرح کی کہ اُس کی سگی بہن بھی شاید نہ کرتی۔ چھ ماہ بعد ریحانہ نے پہلے بیساکھیوں پھر اسٹینڈ اور پھر کسی سہارے کے بغیر چلنا پھرنا شروع کردیا۔ اللہ پاک نے اپنے لطف و کرم اور خاص فضل سے نوازا تھا۔ اب

دنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم

21 جولائی 1960ء کو دنیا میں پہلی مرتبہ ایک خاتون نے کسی ملک کی وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا تھا۔ ان کا نام مسز سری ماؤ بندرانائیکے تھا جو سری لنکا کی وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئی تھیں۔

مرسلہ: روزینہ محمد۔ گوادر

ریحانہ مکمل طور پر ٹھیک ہوگئی تھی اور اپنی نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ ہمارے گھر کی خوشیاں ہمیں دوبارہ مل گئیں۔ اب ریحانہ اور نبیلہ کی دوستی اور پیار مثالی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان دیتی ہیں۔ اُن کا آپس میں پیار دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سوکنیں ہیں۔ دونوں نے مل کر گھر کو جنت بنادیا ہے۔ ہم ہر ماہ باقاعدگی سے لاہور جاتے ہیں اور داتا صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ زندگی بہت سکون سے گزر رہی ہے، بس اب دعا ہے کہ ہماری خوشیوں اور گھر کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ یہ پیار محبت سدا قائم رہے۔

نبیلہ سے اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے نوازتے ہوئے ایک اور بیٹا عطا کیا ہے۔ ہمارے پانچوں بچے بالکل سگے بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں اور اک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ سب پڑھائی میں بہت لائق اور محنتی ہیں۔ اکثر لبنیٰ کا فون آتا رہتا ہے اور وہ مجھ سے کہتی ہے۔ ”جیجا جی دیکھیں، میری دوستی نے آپ کو کیسا خوب صورت تحفہ دیا ہے۔“ تو میں بہت ہنستا ہوں۔ لبنیٰ سال میں ایک بار پاکستان آتی ہے تو ہمارے ہی گھر اُس کا قیام ہوتا ہے، جس کو دیکھ کر میری پہلی بیوی ریحانہ زیر لب بہت مسکراتی ہے اور چھیڑتی ہے کہ ناصر صاحب دیکھیں آپ کی موبائل دوستی نے کیا رنگ دکھایا ہے تو میں یہی کہتا ہوں کہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔

☆......☆

دسویں سچ بیانی

مرے آنگن کا تحفہ

شیخ معظم الٰہی

حیدرآباد سے باپ بیٹی کے رشتے سے جڑی ایک معصوم کہانی

"**بھائی** پلیز مجھے بازار لے چلیں مجھے کچھ نوٹس لینا ہیں۔" میری بہن نوشین نے آ کر فرمائشی انداز میں مجھ سے کہا۔

"نہیں بالکل نہیں! بہانہ نوٹس کا ہے ہمیشہ کی طرح تم شاپنگ مال میں گھس جاؤ گی اور ساتھ مجھے بھی گھسیٹو گی۔ سوری مائی ڈیئر سسٹر!" میں نے کہا۔

"بھائی پلیز! آج ایسا نہیں ہوگا۔" نوشین نے کہا۔

"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں، لیکن اگر ایسا ہوا تو پھر آئندہ کے لیے بالکل آنا جانا ختم، اوکے؟"

"اوکے بھائی!" نوشین خوش ہوگئی۔

میں نے نوشین کو موٹر سائیکل پر بٹھایا اور بازار کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

"بھائی آئس کریم بھی کھلائیں گے ناں؟" گھر سے کچھ دور آنے کے بعد نوشین کی فرمائشیں اسٹارٹ ہوگئیں۔ "کوئی فرمائش نہیں ورنہ میں موٹر سائیکل گھر کی طرف موڑلوں گا۔"

"اللہ بھائی، ایک ہی بہن ہے آپ کی اور آپ ہیں کہ کوئی لاڈ ہی نہیں کرتے۔" نوشین نے منہ بنا کر کہا۔

"تو میں بھی تمہارا اکلوتا بھائی ہوں۔ تم کون سا رحم کھاتی ہو مجھ پر؟" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا! ابھی یہ نوک جھونک جاری تھی کہ موڑ کاٹتے ہوئے اچانک ایک برقع پوش لڑکی میری موٹر سائیکل کے آگے آ گئی۔ میں نے فوراً بریک لگائے لیکن لڑکی گھبراہٹ میں سڑک پر گر چکی تھی۔

نوشین نے فوراً موٹر سائیکل پر سے اُتر کر اسے اٹھنے میں مدد دی اور بولی۔ "زیادہ چوٹ تو نہیں لگی آپ کو؟" نوشین نے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے پوچھا، پھر مجھ سے بولی۔ "بھائی! کوئی رکشا یا ٹیکسی کروادیں ہم انہیں لے کر اسپتال چلتے ہیں۔"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، غلطی میری تھی۔" نقاب پوش لڑکی نے کہا۔

"کہاں جائیں گی آپ؟ ہم آپ کو گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

"اُف! یہ نوشین کی بچی بھی ہمدرد دواخانہ بنی رہتی ہے، وہ کہہ رہی ہے کہ میں ٹھیک ہوں، لیکن ہماری بہن کو بھی خدائی خدمت گاری کا شوق ہے۔" میں نے جھنجلاتے ہوئے دل میں سوچا اور آخر ان دونوں کو ٹیکسی میں بٹھا دیا اور خود پیچھے پیچھے موٹر سائیکل پر چل دیا۔

وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر اس وبال جان کا گھر تھا۔ جہاں پہنچ کر اس نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی اور



اس کے بے انتہا مجبور کرنے پر ہم اس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ نوشین کو دوسرے کمرے میں لے گئی، چند منٹ بعد ہی ایک خاتون چائے اور دیگر لوازمات ٹرے میں سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

''بہت شکریہ آپ کا، یہ فوزیہ بھی بس پریشانی میں دائیں بائیں کچھ دیکھتی نہیں۔'' وہ خاتون ٹرے میرے سامنے سجاتے ہوئے بولیں۔

''اچھا تو اس وبالِ جان کا نام فوزیہ ہے۔'' میں نے سوچا۔

اس کے بعد وہ خاتون میرے متعلق معلوماتی سوالات میں مصروف ہو گئیں اور میں بے دلی سے انہیں جواب دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد نوشین ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''چلیں بھائی۔ آنٹی ہم دوبارہ آئیں گے، کیوں کہ اب فوزیہ سے میری بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' خاتون نے خوش دلی سے جواب دیا۔

باہر نکلنے پر میں نے تقریباً اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح بھی اجنبی لوگوں سے یکدم بے تکلف ہوا جاتا ہے کیا؟''

''اوہو بھائی! وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور اب وہ اجنبی نہیں رہی، وہ میری دوست بن چکی ہے۔''

نوٹس لینے کے بعد جب ہم بازار سے گھر پہنچے تو نوشین نے سارا قصہ امی کو اسی طرح سنایا اور امی بھی مزے لے کر سارا ماجرا سنتی رہیں۔

مجھ پر یہ انکشاف اس وقت ہوا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی بھابھی بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے، جب امی اور نوشین نے باہر سے آ کر یہ دھماکے دار خبر سنائی کہ وہ فوزیہ کے گھر سے آ رہی ہیں اور امی کو بھی لڑکی پسند آ گئی ہے اور میں سنتا

رہ گیا۔

”نہیں ذیشان، سائرہ سے تمہاری شادی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ تمہیں نہیں پتا یہ جاب کرنے والی لڑکیاں مجھے بالکل پسند نہیں۔ بیٹے پر قبضہ کرلیتی ہیں اور ساس سسر کو راستے کا پتھر سمجھنے لگتی ہیں۔ وہ بھول جاتی ہیں کہ اس پودے کو تناور درخت بنانے میں ان بوڑھے ہاتھوں نے کتنی محنت کی ہوگی۔ بس مجھ سے اور مزید نہ کچھ کہنا۔“ اور میں نے اپنی پیاری ماں کے آگے اپنی محبت ہار دی۔

فوزیہ کو پسند کرنے کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ وہ ایک خالص گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ اور میرے نہ چاہتے ہوئے بھی آخرکار فوزیہ کو وہ دلہن بنا کر گھر لے ہی آئیں۔

چند دن ناز نخرے اٹھانے کے بعد انہوں نے بہو بیگم کو گھر کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ کچھ عرصہ تو فوزیہ نے بلا چوں و چرا امی کی ہر بات مانی لیکن بعض اوقات توقع سے زیادہ ملنے والی شے کی قدر نہیں ہوتی۔ کچھ ایسا ہی فوزیہ کے ساتھ ہوا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنا کچھ اسے بن مانگے مل جائے گا۔ آہستہ آہستہ اسے شکوہ ہونے لگا کہ نوشین گھر کے کاموں میں ہاتھ نہیں بٹاتی اور وہ سارا دن گویا مشقت کے پہاڑ توڑتی ہے، جبکہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے کام والی تھی، صرف کھانا بنانا نوشین کے سپرد تھا۔

”سنیں آج کھانا باہر سے لے آئیں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ فوزیہ نے مجھے فون کرتے ہوئے کہا۔

”ارے! تو گھر میں امی ہیں، نوشین ہے، کھانا باہر سے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم انہیں کہہ دو کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔“

”کہا تھا، لیکن نوشین کو اپنی دوست کے گھر جانا ہے اور امی کہہ رہی ہیں کہ رات سے ان کی بھی کمر میں درد ہے، ان سے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اوہو! تو گویا امی نے روایتی ساس کا کردار ادا کرنا شروع کردیا، جبکہ صبح ناشتے پر انہوں نے کسی درد کی شکایت نہیں کی تھی۔“

میں نے سوچا۔ ”خیر تم فکر نہ کرو میں آتے ہوئے لے آؤں گا۔“

”ہاں بھئی نوشین، آج دوست کے گھر دعوت کیسی رہی۔“ میں نے گویا طنزاً پوچھا۔

”دعوت؟ بھائی ارم کے ابو کی طبیعت خراب تھی میں تو آدھے گھنٹے کے لیے گئی تھی، بس۔ آپ سے کس نے کہا کہ وہاں دعوت تھی۔“

”ارے نہیں، کسی نے بھی نہیں۔ تم ساری دوستیں مل کر اس طرح کی دعوتیں کرتی رہتی ہو اس لیے میں نے سوچا۔ سوری۔“ میں نے فوزیہ کا نام نہ لیتے ہوئے اس سے کہا۔

”امی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ میں نے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے امی سے سوال کیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا اور آج تمہیں کیا ہوا ہے جو دل باہر کا کھانا کھانے کو چاہ رہا ہے۔ بہو نے مجھے بتایا کہ تم نے اسے کھانے بنانے کو منع کردیا ہے۔“ اور میں گویا سن ہوگیا۔

”کیا اس گھر میں روایتی ساس بہو نے رنگ دکھانا شروع کردیا ہے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔ آہستہ آہستہ فوزیہ کی یہ حرکتیں امی کی نظر میں آنے لگی تھیں اور گھر میں رنجشوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

”مجھے الگ گھر لے کے دیں ذیشان، میں اس طرح نہیں رہ سکتی۔“ امی کی پسند کی ہوئی بہو کی فرمائش پر مجھے سائرہ یاد آ گئی یہی تو وہ خوف تھا جو امی نے مجھے سائرہ سے دور کردیا تھا اور آج...... وبالِ جان، واقعی وبالِ جان بن گئی تھی۔ جب امی تک یہ بات پہنچی تو وہ تڑپ اٹھیں۔

”ایسا نہیں ہوگا فوزیہ...... میرا بیٹا مجھ سے دور ہو جائے گا، ایسا سوچنا بھی مت تم۔ جب تمہاری اپنی اولاد ہوگی تو میں پوچھوں گی کہ ماں کیا ہوتی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، رہے آپ کا بیٹا آپ کے پاس۔ میں امی کے پاس جارہی ہوں۔“ فوزیہ جو عنقریب صاحب اولاد ہونے جارہی تھی، نے کہا اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور میرے لاکھ روکنے کے باوجود بھی وہ میکے چلی گئی۔ جہاں اسے سمجھانے بجھانے کے بجائے اس کے بے جا مطالبے کی حمایت کی گئی۔ آخرکار ایک روز اس نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ بھی کردیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"دے دو طلاق اُسے، لیکن اس شرط پر کہ پیدائش کے بعد بچہ ہمیں دیا جائے گا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ اولاد کو ماں سے دور کریں گی؟ آپ تو خود ماں ہیں۔"

"ہاں، اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ شاید اسی محبت میں فوزیہ واپس لوٹ آئے کہ میں کب چاہتی ہوں کہ میرے بیٹے کا گھر برباد ہو، بس میں تمہیں خود سے دور نہیں کر سکتی۔" ان کی آنکھوں میں سیلاب اُتر آیا، لیکن میری حیرانگی کی اس وقت انتہا نہ رہی جب میں نے یہ مطالبہ فوزیہ کے سامنے رکھا تو اس نے بہ خوشی قبول کر لیا۔ میں نے سوچا کہ حیرانگی کیسی؟ اس دنیا میں ایسی بھی تو مائیں ہیں جو اپنے جگر گوشوں کو جانوروں کی خوراک بننے کے لیے کچرے کے ڈھیر پر چھوڑ جاتی ہیں۔ اور فوزیہ تو اپنی اولاد اس کے باپ کے سپرد کر رہی تھی۔ یوں پیدائش کے بعد اس ننھی سی جان کو ماں کے ہوتے ہوئے بن ماں کی کر دیا گیا، شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ اس لمحے میں نے اللہ سے اس ننھی گڑیا کی خوشیوں کے لیے گڑگڑا کر دعا کی اور اس کا نام بھی خوشی تجویز کیا۔ اب اس کی دیکھ بھال امی اور نوشین کی ذمے داری تھی۔ میری پریشانی اور اُداسی دیکھ کر امی خاصی بیمار رہنے لگی تھیں۔ شاید وہ خود کو اس تباہی کا ذمے دار سمجھنے لگی تھیں۔

ایک دن مجھے آفس میں نوشین کا فون آیا کہ امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور وہ انہیں لے کر اسپتال جا رہی ہے۔ میں بھی بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد بتایا کہ بلڈ پریشر بہت زیادہ ہائی ہو گیا تھا۔ ہم امی کو لے کر اسپتال سے باہر جانے کے لیے کوریڈور میں پہنچے تو اچانک کسی عورت کی سسکیوں نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ سائرہ تھی۔ چار پانچ عورتوں میں گھری بے تحاشہ سسکتی ہوئی، تب ہمیشہ کی طرح میری رحمدل بہن نوشین آگے بڑھی۔

"کیا ہوا ہے؟ یہ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟" اس نے فوراً سوالات کرنے شروع کر دیے۔

میں نے امی کی وہیل چیئر کو وہیں روک دیا۔ "امی یہ سائرہ ہے۔ میں نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

دوسری طرف وہ خاتون نوشین سے کہہ رہی تھیں۔ "کچھ نہیں بیٹی اللہ اولاد کی نعمت سے کسی کو محروم نہ کرے۔"

یہ کہہ کر وہ خود بھی رونے لگیں۔ دوسری خاتون نے بتایا کہ سائرہ کا ابارشن ہو گیا ہے اور وہ دوبارہ کبھی ماں نہیں بن سکتی اور تب مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسوں یا روؤں؟ "آپ کون ہیں ان کی؟" نوشین نے خاتون سے سوال کیا۔

"جی یہ بھابھی ہیں میری، اور وہ امی۔ دراصل سائرہ بھابھی اتنی پرخلوص اور محبت کرنے والی ہیں کہ امی انہیں بہو سمجھتی ہی نہیں اور ہمیں بھی یہ بہنوں کی طرح عزیز ہیں۔" خاتون نے نوشین کی آنکھوں میں حیرانگی گویا پڑھ لی تھی۔

وہ خاتون سائرہ کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں اور امی میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں، جو سائرہ کو اس حال میں دیکھ کر بے رنگ ہو گیا تھا۔

"نوشین خوشی کو مجھے دو۔"

جی امی! یہ لیں۔ نوشین نے ننھی خوشی کو امی کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرف بڑھایا۔

امی نے خوشی کا ماتھا چوما اور اسے سائرہ کی گود میں ڈال دیا۔ مجھ سمیت وہاں موجود سب لوگ یکلخت ہکا بکا رہ گئے، امی کہہ رہی تھیں۔ "ہماری خوشی اب تمہاری ہے بیٹی۔ اللہ تمہاری خوشی کو نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے آج میری محبت کے سامنے مجھے سرخرو کر دیا تھا یا میرے ساتھ کی گئی ناانصافی کی تلافی کی تھی۔ خوشی میری بیٹی جو اس وقت ماشاء اللہ گیارہ برس کی ہو چکی ہے، مجھ سے بہت دور ایک دوسرے ملک میں رہتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے حفظ و امان میں رکھے۔ میری اکثر فون اور انٹرنیٹ پر اس سے بات ہوتی ہے۔ وہ اپنے بابا اور ماما کے ساتھ بہت خوش ہے۔ خوش تو میں بھی ہوں کہ سائرہ سے خوشیاں دینے کے وعدے جو میں نے کیے تھے وہ پورے ہو گئے تھے۔ خوشی کی جدائی کی کسک دل کو محسوس تو ہوتی ہے، لیکن میں دل کو تسلی دیتا ہوں کہ بیٹی کو بالآخر تو رخصت کرنا ہی ہوتا ہے، میں نے یہ کام ذرا پہلے کر لیا۔

☆☆......☆☆

آتشِ جنوں

سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

انتقام کے جوالا مکھی میں سب کچھ بھسم کر دے گا

حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، 23ویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے...... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے، جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اُس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے...... عمران اور ارسلان اپنی

بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں۔۔۔۔

راستے میں تیمور اور عمران شیر خان پر قابو پالیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آجاتا ہے' اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور' مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دو بیٹیوں کو اغواء کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اُس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مُر.. تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران' تیمور اور نادیہ اپنے دشمن



بابر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

غلام رسول مچھلی والے سے ملاقات کے دوران میں وہ انہیں کسی خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اپنے خاص آدمی کے ذریعے روانہ کرتا ہے جہاں اُن کا ایک گینگ سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ لوگ انہیں مار بھگاتے ہیں' راستے میں اُن کا ایک جعلی پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہوتا ہے اور پھر کہانی میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہوتا ہے۔

عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست وردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں وردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی لڑکی کا فون آیا تھا' فون نمبر کی انکوائری پر معلوم ہوتا ہے' وہ نمبر اسٹیشن کے قریب کسی پی سی او کا ہے۔ عمران اور نادیہ کینٹ اسٹیشن پہنچتے ہیں جہاں نادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغوا کاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

جان محمد جو کہ مشہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے' ان کی تعداد پانچ ہے' جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے' ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔

آنے والا پولیس آفیسر عمران کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ ایک خطرناک دہشت گرد کا پیچھا کر رہے تھے۔ انہیں شک ہے کہ وہ اردگرد کے کسی بنگلے میں نہ گھس گیا ہو۔ عمران اسے بتاتا ہے کہ ان کے بنگلے پر موجود سیکورٹی کی موجودگی میں ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔

تیمور آ کر بتاتا ہے کہ انہوں نے آرنلڈ کی لاش کے سینے پر ''تحفے'' والا ٹیگ لگا دیا ہے۔ لاش کچھ دیر میں پولیس کو مل جائے گی۔ بلوچ کہتا ہے کہ اس نے شبو کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے۔ اسٹیمر پر اس کے ساتھ پانچ چھ آدمی ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں انفارمیشن جمع کرو، میں آپریشن کی تیاری کرتا ہوں۔

ٹی وی چینلز آرنلڈ کے بارے میں خبر نشر کرتے ہیں کہ مشہدی مقتول کو نہیں جانتے اور ان کا نام لے کر ان کے کسی دشمن نے ان کے خلاف کارروائی کی ہے۔ آپریشن پر روانگی سے قبل ہاشم نادیہ کو کہتا ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی، وہ خود اس وقت کے پی ٹی کے سیکورٹی افسر کے یونیفارم میں تھا۔ کے پی ٹی کے مین گیٹ پر سیکورٹی اہل کار نے جب ہاشم کو آفیسر کی یونیفارم میں دیکھا تو فوراً بیریئر ہٹا دیے۔ جیٹی پر آگے بڑھتے ہوئے وہ اس علاقے میں پہنچے ہیں جہاں اسٹیمر، لانچز اور بوٹس کھڑی تھیں۔ ہاشم بتاتا ہے کہ سامنے جو بڑا اسٹیمر ہے، وہ مشہدی کا ہے، جبکہ دوسرا اسٹیمر سیٹھ عبدالمنان کا ہے۔ عمران کہتا ہے کہ پہلے سیٹھ عبدالمنان کے اسٹیمر پر جایا جائے وہاں سے مشہدی کے اسٹیمر میں جانے میں آسانی ہوگی۔

اسٹیمر پر پہنچ کر بلوچ ایک کیبن کا دروازہ کھولتا ہے تو اندر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی موجود ہوتے ہیں۔ وہ لڑکا بتاتا ہے کہ وہ سیٹھ عبدالمنان کا بیٹا ہے اور اسٹیمر پر اس کے علاوہ دو مزید آدمی موجود ہیں، جنہیں بلوچ پہلے ہی بے ہوش کر چکا تھا۔ ہاشم ان دونوں کو بھی ریوالور کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیتا ہے اور بلوچ سے کہتا ہے کہ میں اسٹیمر کو مشہدی کے اسٹیمر کے ساتھ لگا دوں گا، پھر وہاں سے ہم مشہدی کے اسٹیمر میں چلے جائیں گے۔ مشہدی کے اسٹیمر کے نزدیک پہنچ کر وہ ڈیک پر موجود مسلح افراد سے کہتے ہیں کہ ان کا فرسٹ ایڈ باکس خالی ہے اور ان کا ایک آدمی زخمی ہے۔ یہ کہہ کر عمران ان کے اسٹیمر پر کود جاتا ہے اس کے پیچھے ہاشم بھی تھا، جو کہ کے پی ٹی کے سیکورٹی افسر کے

یونیفارم میں تھا، جسے دیکھ کر ان لوگوں نے اسلحہ نہیں نکالا تھا۔ عمران اور ہاشم مل کر ان لوگوں کو قابو کر لیتے ہیں۔ وہاں سے وہ شہاب عرف شبو کے کیبن میں پہنچتے ہیں جہاں شہاب اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ عمران ریوالور کی مدد سے انہیں قابو کرتا ہے، بلوچ ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے۔ بلوچ اور ہاشم ان دونوں کو بوٹ میں چھوڑ آتے ہیں۔ بلوچ کہتا ہے کہ تیمور اور نادیہ ان کا انتظار کر رہے ہوں گے، ہاشم کو واپس بھیج دیا جائے، شبو سے ہم نمٹ لیں گے۔ ہاشم وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ عمران بلوچ کو کہتا ہے کہ بوٹ کھلے سمندر میں لے چلو۔ بلوچ شبو سے پوچھ گچھ شروع کر دیتا ہے۔

شبو بتاتا ہے کہ ارسلان مشہدی کی قید سے فرار ہو گیا تھا جاتے جاتے مشہدی کی خفیہ فائل لے گیا ہے۔ انڈیا میں وہ "را" والوں کے ہتھے چڑھ گیا اور اب تہاڑ جیل دہلی میں ہے۔ اچانک سامنے سے کوسٹ گارڈ والوں کی تیز رفتار بوٹ آتی ہے جسے دیکھ کر بلوچ اپنی بوٹ کی اسپیڈ بھی بڑھا دیتا ہے۔ کوسٹ گارڈز کی بوٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے، حملے میں شہاب مارا جاتا ہے۔

بلوچ بوٹ کو ایک تنگ کھاڑی میں لے جاتا ہے اور اس کا انجن بند کر دیتا ہے۔ کھاڑی میں بلوچ کو بوٹس کے انجن کی آواز سنائی دیتی ہے وہ کہتا ہے کہ "لگتا ہے کہ کوسٹ گارڈز والوں نے اب تک ہم لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ عمران بلوچ کو دیکھتا ہے جس کے چہرے پر فکر مندی



کے آثار تھے، پھر پانی میں ایک چھپاکا ہوا اور کوئی تیرتا ہوا اس کھاڑی میں داخل ہو گیا۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

''اب تم نے آواز نکالی تو میں واقعی گولی مار دوں گا، تم تو صرف دھمکیاں ہی دے رہے تھے۔'' اس نے غرا کر کہا۔ ''اب تم اپنے دونوں ہاتھ سر پہ رکھو اور کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں تمہاری طرح رعایت دینے کا قائل نہیں ہوں۔''

اس نے بہت ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی اور میرے بغلی ہولسٹر سے دوسرا ریوالور بھی برآمد کر لیا۔ پھر وہ میری پشت کی طرف آیا اور اچانک میری کمر پر اتنی زور سے لات ماری کہ میں اچھل کے اس کے بیڈ پر جا گرا۔ ''اب بول تو کون ہے اور تیرا تعلق کس ایجنسی سے ہے۔ یوں کھلے عام دو دو ریوالور تو ایجنسی والے ہی لے کر گھومتے ہیں، وہ بھی بغل ہولسٹر میں۔''

''تم یہ معلوم کر کے کیا کرو گے کہ میرا تعلق کس ایجنسی سے ہے۔ بس اتنا بتا دوں کہ میرا تعلق جس ایجنسی سے بھی ہے، اس کے لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''بہت پرانا ڈائیلاگ ہے۔'' اس نے خباثت سے مڑ کر کہا۔ ''میں گزشتہ کئی برس سے یہ ڈائیلاگ سن رہا ہوں اور ابھی تک زندہ ہوں۔ تمہارے ملک کے لوگ عمل کم کرتے ہیں، دھمکیاں زیادہ دیتے ہیں۔''

اس کے جملے پر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ تمہارے ملک کے کے الفاظ استعمال کر رہا تھا گویا اس کا تعلق کسی اور ملک سے تھا۔ کس ملک سے؟'' میں نے دل ہی دل میں سوچا، پھر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ''ہم جیسے رنگ روپ، نقوش اور زبان ہونے والا اگر پاکستانی نہیں تھا تو یقیناً بھارتی تھا۔ وہ مجھے کسی پاکستانی ایجنسی کا آدمی سمجھ رہا تھا اس لیے روانی میں بولے جا رہا تھا۔

اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ ''اب گن دیکھ کر تیرا خون کیوں خشک ہو گیا۔ بتا تو میرے پیچھے کس چکر میں ہے اور تو ہے کون؟''

میں اس کے باوجود خاموش رہا تو وہ بولا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میں تجھے گولی ماروں گا تو اس کے لیے ہوٹل کا سیکورٹی اسٹاف اور اردگرد کے لوگ چوکنا ہو جائیں گے۔ میں تجھے اس کمرے میں ذبح کر کے تیری لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا۔'' اس نے جھک کر پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکالا تو مجھے اچانک یاد آیا کہ میری پنڈلی پر بھی تو ایک خنجر موجود ہے۔

''جلدی بتا تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے ورنہ میں انسانوں کی کھال کھینچنے میں ماہر ہوں۔'' وہ مکروہ انداز میں مسکرایا۔ ''لوگ مجھے اس فن کا استاد کہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو تیرے جسم پر اتنے چرکے لگاؤں کہ تو اپنی ایجنسی تو کیا، اپنا نام بھی بھول جائے گا۔''

''لگتا ہے، تم کام کم کرتے ہو اور ہندی فلمیں زیادہ دیکھتے ہو۔ اس قسم کے ڈائیلاگ ان ہی فلموں میں ہوتے ہیں۔''

''میں انگلش کی ایکشن اور تھرل فلمیں بھی دیکھتا ہوں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''تو اس کی فکر مت کر اور شروع ہو جا۔''

''پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟'' میں نے کہا۔

اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ''اب بھی یہ پوچھ رہا ہے کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''

میں نے بیڈ پر لیٹے ہی لیٹے اپنی داہنی ٹانگ غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف موڑی تھی۔ اس پنڈلی میں خنجر بندھا ہوا تھا۔

''تیرا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام یوسف ہے؟'' میں نے کہا۔

''شکل سے لگتا بھی یوسف ثانی ہے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اک بات بتاؤ۔'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے اتنی اچھی اردو کہاں سے سیکھی؟''

''مجھے باتوں میں مت الجھا۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''میں گزشتہ بیس سال سے تم لوگوں کے سینے پر منڈلا رہا ہوں تو کیا میں ابھی اردو بھی نہیں بول سکوں گا۔'' اس نے آگے بڑھ کر میرے بازو پہ ہلکا سا ایک چرکا لگا دیا۔ اس کا خنجر انتہائی دھار والا تھا وہ دھاری باریک سٹیل کا تھا۔

میرے بازو میں جیسے مرچیں بھر گئیں۔ اس نے پھر تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”تجھ جیسے نہ جانے کتنے میں نے صرف کراچی ہی میں ذبح کردیے ہیں۔ تم لوگ اپنے آپ کو بہت بڑا سورما سمجھتے ہو۔ سورما ہم ہیں ہم! میں ذات کا راجپوت ہوں اور اس خطے میں راجپوتوں سے زیادہ بھلا کون جنگ جو اور جی دار ہوگا۔“ اس نے پھر مجھے چرکا لگانا چاہا لیکن میں نے اچانک اس کے منہ پر اس ہاتھ سے بھرپور پنچ رسید کردیا جسے اس نے زخمی کیا تھا۔

میرا یہ اسٹیٹ پنچ اتنا خوف ناک تھا کہ اگر میں زخمی نہ ہوتا تو اس کے سامنے کے کئی دانت اور جبڑا ٹوٹ گیا ہوتا۔ دانت تو اس کے اب بھی ٹوٹے تھے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ خود بھی زمین پر گر گیا اور اس نے اچانک اپنا ہی پھینکا ہوا ریوالور اٹھالیا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میں نے بجلی کی سی سرعت سے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کی طرف اُچھال دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ خنجر نشانے پر بیٹھے گا۔ تیمور اس فن کا ماہر تھا۔ میں نے ابھی حال ہی میں اس سے یہ سیکھا تھا اور کچھ دن پریکٹس کی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خنجر عین اس کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست ہوگیا۔ اس نے اچانک ہچکی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اسے مارنے کے بعد مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا۔ اس کا تعلق یقیناً ”را“ سے تھا۔ میں اس کے ذریعے اس کے دوسرے ساتھیوں تک بھی پہنچ سکتا تھا اور جیک کا پتا بھی اس سے اگلوا سکتا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے اپنے دونوں ریوالور اٹھائے، اپنی موجودگی کا ہر ممکن سراغ مٹایا اور اسے گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، کوریڈور میں بالکل سناٹا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور تیزی سے زینے کی طرف بڑھا۔

زینے کے نزدیک ہی نادیہ اور تیمور بھی کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی میرے پیچھے لپکے۔

میں نے ان سے کہا کہ تم لوگ فوراً زینے کے ذریعے نیچے جاؤ اور نیچے والے فلور سے لفٹ میں سوار ہوجانا۔ میں اوپر والے فلور سے لفٹ میں آتا ہوں۔“

میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ مجھے یہ ہی خدشہ تھا کہ کہیں میرے لباس پر خون کا کوئی داغ نہ ہو۔

میں لفٹ کے دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اس وقت لفٹ آکر رُکی، اس میں سے ایک جوڑا باہر نکلا اور میری طرف توجہ دیے بغیر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئے۔

میں لفٹ میں داخل ہوا اور گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ میں لگے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے بال بکھرے ہوئے ہیں اور لباس پر بھی شکنیں ہیں۔ میں نے ہاتھوں سے بال سنوار لیے تو مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر خون کی ایک لکیر سی دکھائی دی۔ را کے اس ایجنٹ نے میرے بازو پر خنجر سے جو چرکا لگایا تھا، اس میں سے خون رس رہا تھا، میں نے بایاں ہاتھ ڈال کر جیب سے رومال نکالا اور اس سے پہلے کہ خون کا کوئی قطرہ فرش پر گرتا، میں نے اسے رومال سے خشک کرلیا اور رومال کو اسی ہاتھ پہ لپیٹ لیا۔ خنجر کے چرکے سے میرا کوٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ اگر اس وقت ہوٹل سیکورٹی کا کوئی آدمی غور سے مجھے دیکھ لیتا تو مشکوک سمجھ کر پوچھ گچھ کرتا، پھر ممکن ہے کہ تھانے کی نوبت آجاتی۔

میں لفٹ سے نکل کر باوقار طریقے سے لاؤنج کی طرف بڑھا۔ لاؤنج میں نادیہ اور تیمور میرے منتظر تھے۔ میں انہیں باہر آنے کا اشارہ کرتا ہوا بغیر کسی کی طرف دیکھے باہر نکل گیا۔ ری سپشن پر اس وقت دو تین افراد کھڑے تھے اس لیے ری سپشنسٹ کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں دروازے کے نزدیک پہنچا تو باوردی دربان نے انتہائی مؤدب انداز میں میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آیا اور ٹہلنے والے انداز میں ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے اس دوران ہی جیب سے سیل فون نکال کر ہاشم کو کال کی اور اس سے ہوٹل کے مین گیٹ پر پہنچنے کو کہا۔

ہاشم شاید کہیں نزدیک ہی تھا۔ وہ میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی لینڈ کروزر کو گیٹ تک لاچکا تھا۔ میں فوراً گاڑی میں سوار ہوگیا۔

ہاشم خان نے مجھے خاموش دیکھ کر گاڑی آگے بڑھائی تو میں نے کہا۔ ”ذرا ٹھہرو، ابھی نادیہ اور تیمور بھی آرہے ہیں۔“

اس وقت نادیہ اور تیمور مین گیٹ پر نمودار ہوئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔
''خیریت تو ہے عمران؟'' ہاشم نے پوچھا۔ ''تم اتنے خاموش کیوں ہو؟''
''خیریت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فوراً گھر پہنچو میں زخمی ہوں اور میرے زخم سے ابھی تک خون رس رہا ہے۔''
تیمور نے آگے بڑھ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی، نادیہ بھی پشت سے اچک کر آگے کی طرف جھانکنے لگی، لیکن گاڑی میں اندھیرا تھا اس لیے انہیں میرا زخم نظر نہیں آیا۔
ہاشم نے زیادہ سوالات نہیں کیے، مجھے اس کی یہ ہی عادت پسند تھی۔ اس نے گاڑی کو تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔ ہم دس، بارہ منٹ کے اندر اندر گھر پہنچ گئے۔
''تیمور!'' میں نے کہا۔ ''تم نے یہ دھیان تو رکھا ہوتا کہ کسی بھی گاڑی نے ہمارا تعاقب تو نہیں کیا؟''
''میں پوری طرح چوکنا ہوں عمران بھائی!'' تیمور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''بیک ویو مرر میں مجھے کوئی مشتبہ گاڑی دکھائی نہیں دی۔'' ہاشم نے کہا۔
وہ تینوں جاننا چاہتے تھے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے، لیکن پہلے میرے زخم کی ڈریسنگ ضرور تھی۔
ڈرائنگ روم میں آ کر نادیہ نے پہلی دفعہ بازو کے پاس سے میرا کوٹ کٹا ہوا دیکھا، وہاں سے بھی خون رس رہا تھا اور کوٹ کی پوری آستین خون میں تر تھی۔ اگر میرے سوٹ کا کلر ڈارک نہ ہوتا تو شاید ہوٹل میں موجود سیکورٹی گارڈ یا دربان کی نظر بھی مجھ پر پڑ سکتی تھی۔
میں نے کوٹ اتارا تو مجھے اپنی شرٹ کی آستین سفید سے سرخ دکھائی دی، تیمور نے میری ٹائی کھول کر شرٹ بھی اتار دی۔ میرے بازو پر اچھا خاصا زخم تھا۔ تیمور نے فوراً ڈاکٹر ندیم کو بلا لیا۔ ڈاکٹر نے میرے زخم کا جائزہ لے کر کہا۔ ''زخم گہرا ہے اس لیے دو چار اسٹیچ کی ضرورت پڑے گی۔''
اس نے پہلے میرا زخم اچھی طرح صاف کیا، پھر اسے ہائیڈروجن پر آکسائیڈ سے صاف کیا تو میرے بازو میں ایک دفعہ پھر انگارے سے بھر گئے۔ وہ تکلیف زخم کی تکلیف سے بھی زیادہ تھی۔
''اس سے آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن یہ آپ کے زخم کی صفائی کے لیے بہت ضروری ہے۔'' پھر اس نے اپنے بیگ سے اسٹیچنگ نیڈل اور دھاگا نکالا اور میرے بازو کے زخم کو سینے لگا۔
میرے بازو میں چار کے بجائے چھ ٹانکے آئے، اس مردود کے خنجر کی کاٹ بہت شدید تھی۔ اگر میرے جسم پر کوٹ نہ ہوتا تو شاید خنجر کی نوک میرے بازو کی ہڈی تک اُتر جاتی۔ میرے زخم کی اچھی طرح صفائی کرنے اور ٹانکے لگانے کے بعد ڈاکٹر نعیم نے بازو پر پٹی باندھ دی اور فوری طور پر مجھے دو پین کلر کھانے کو دیں۔
اس دوران ہی تاج بخت ہمارے لیے کافی لے آئی تھی۔ مجھے بھی اس وقت کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔
میں نے کافی پیتے ہوئے ان لوگوں کو پورا واقعہ تفصیل سے بتا دیا۔
نادیہ کے حلق سے پُرسکون سانس برآمد ہوئی۔ تیمور بھی اب پرسکون نظر آ رہا تھا۔
''مجھے خوشی ہے کہ را کا ایک سینئر ایجنٹ جہنم رسید ہو گیا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''اور تم بھی بال بال بچ گئے لیکن اسے قتل کر کے ہمیں ایک بھاری نقصان یہ پہنچا کہ ہم مزید قیمتی معلومات سے محروم رہ گئے۔ وہ راجپوت بچہ کم سے کم جیک کے بارے میں تو بتا ہی دیتا۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اچھی بات یہ ہے کہ کسی نے تمہیں اس کمرے میں جاتے یا وہاں سے نکلتے نہیں دیکھا۔''
ندیم نے شاید مجھے خواب آور دوا کا کوئی انجکشن بھی دیا تھا کہ کافی پینے کے باوجود میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔
''تم اب آرام کرو۔'' ہاشم نے کہا۔ ''صبح بات کریں گے۔ اس وقت یوں بھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''
میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو تیمور میرے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے مجھے میز پر لٹا کر میرے جوتے اتارے پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''عمران بھائی! آپ یہ فٹ جینز اتار کر ٹراؤزر پہن لیں۔'' اس نے مجھے باتھ روم تک پہنچا دیا۔

مجھے اس وقت نیند کے شدید جھونکے آرہے تھے، میں نے بہ مشکل تمام جینز اتار کر ٹراؤزر پہنا اور باتھ روم سے باہر آ گیا۔

نادیہ دودھ کا جگ اور گلاس لیے موجود تھی۔ تیمور شاید اس وقت جان بوجھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ میں دودھ کبھی بھی رغبت سے نہیں پیتا تھا لیکن نادیہ کے اصرار پر یکے بعد دیگرے مجھے دو گلاس پینا پڑے۔ یوں بھی میرا پیٹ خالی تھا۔ ہمارا ڈنر اس چکر میں رہ ہی گیا تھا۔

دودھ پینے کے بعد میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ نادیہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی، نادیہ میرے سرہانے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں اس وقت خود کو چاق چوبند محسوس کر رہا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' نادیہ نے تشویش سے پوچھا۔

''یار! میرے بازو پر معمولی سا زخم آیا ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم ناشتے کا بندوبست کرو، مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے، میں نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔''

''ہم سب تمہارے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔'' نادیہ نے کہا۔ ''تم جلدی سے فریش ہو کر آؤ، میں ناشتا لگواتی ہوں۔''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں نیم گرم پانی سے دیر تک نہاؤں لیکن ندیم نے مجھ سے کہا تھا کہ ابھی دو تین دن پانی کو زخم نہیں لگنا چاہیے۔

تیمور کو یہ ہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ خنجر زہریلا نہ ہو لیکن اگر خنجر کی نوک میں زہر ہوتا تو وہ اب تک اپنا اثر دکھا چکا ہوتا۔

میں فریش ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ناشتے کی میز پر تاج بخت سمیت سب ہی میرے منتظر تھے۔ کلثوم نے بھی اس دن ناشتے کا بلکہ کھانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ عموماً وہ اتنا بھاری ناشتا نہیں بناتی تھی۔ شاید اس نے نادیہ کے کہنے پر اتنا اہتمام کر ڈالا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ یہ تمام اہتمام کلثوم نے نہیں بلکہ تاج بخت نے کیا ہے۔

وہ اب پہلے سے بھی زیادہ نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کے ناشتے اور ذائقے کی تعریف کی تھی وہ سر جھکا کر مسکرانے لگی۔ نادیہ کی طرح مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں بھی ڈمپل پڑتے تھے۔ وہ اس وقت بھی نادیہ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ لیکن معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کپڑے اس کے نہیں ہیں۔

میں ناشتے سے فارغ ہو کر کافی پی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے دل ہی دل میں سوچا، پھر تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد میں نے کال ریسیو کر لی۔

دوسری طرف سے جان محمد کی آواز آئی۔ ''ہیلو، عمران صاحب!''

''ہاں جان محمد!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''یہ تم نے اچھا کیا کہ سم بدل لی۔'' پھر میں سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''کوئی خاص بات؟''

''کل شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں کسی نے مشہدی کے ایک اور مخبر ساتھی کو قتل کر دیا۔'' جان محمد نے بتایا۔ ''پولیس اب تک اس گتھی کو نہیں سلجھا سکی ہے کہ اسے قتل کس نے کیا؟'' ''لیکن حسب معمول مشہدی کا نام ہوگا کہ اس کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں۔'' جان محمد نے کہا۔ ''کل پہلی دفعہ میں نے اسے پریشان دیکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنو کو کسی ایجنسی نے ٹھکانے لگایا ہے اور یہ سب کچھ اسٹیبلشمنٹ کے اشارے پر ہو رہا ہے ورنہ وہ گزشتہ بائیس برس سے یہاں کا باشندہ بن کر رہا ہے لیکن اب تک اس پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مشہدی اسٹیبلشمنٹ سے خوف زدہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''شاید وہاں اس کی دال نہیں گلتی؟''

''وہ ایک حساس ادارہ ہے۔'' جان محمد نے کہا۔

''اگر وہ بھی پاکستان کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرے تو پھر باقی کیا رہ جائے گا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''اس کی تفصیلی خبر آج کے اخبارات اور ٹی وی کے نیوز بلیٹن میں مل جائے گی۔''

''مزید کوئی انفارمیشن؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک مجھے مشہدی کے ان امپورٹڈ قاتلوں کے ٹھکانوں کا علم نہیں ہو سکا۔'' جان محمد نے کہا۔ ''لیکن میں بہت جلد ان کا سراغ لگا لوں گا۔''

''تمہارے تعاون کا میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا جان محمد!'' میں نے کہا۔ ''میری طرف سے اپنی دونوں بیٹیوں کو دعائیں دینا مت بھولنا، خدا حافظ۔'' میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے حسب معمول جان محمد کا نام سنتے ہی ٹیلی فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ تیمور اس وقت اخبارات کا ایک بنڈل اٹھا لایا۔ نادیہ نے کئی اخبار لگا رکھے تھے۔ شاید وہ انہیں پڑھتی بھی ہو، لیکن مشہدی کے چکروں میں پھنس کر میں نے اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مرنے والے کا نام ونود تھا؟'' ہاشم نے کہا۔

اخبارات کی کہانی کچھ اور ہی تھی۔ ان خبروں کے مطابق معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو کراچی کے ایک ہوٹل میں پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے قاتل راجپوت صاحب کا کوئی شناسا تھا، پھر دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا جو اس حد تک بڑھا کہ راجپوت صاحب نے گن نکال لی۔ ان کا قاتل ان سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے خنجر سے ان کا خاتمہ کر دیا۔ فائر کی آواز تو دور تک سنی جاتی، اس کا خنجر بھی موقع واردات پر ملا ہے اور راجپوت کا پسٹل بھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے راجپوت صاحب فائر کرنے والے تھے کہ ان کے قاتل نے اس سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیا۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔

''پولیس تو زندگی بھر عبدالحمید کی حقیقت نہیں جان سکتی۔'' میں نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اخبارات تک اصل کہانی پہنچا دی جائے کہ وہ مردود عبدالحمید راجپوت نہیں بلکہ را کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ ونود تھا۔ جو گزشتہ بائیس برس سے ہمارے ہی ملک میں ہو کر ہمارے خلاف کارروائیاں کر رہا تھا۔''

''بغیر ثبوت کے کوئی بھی اخبار اس خبر پر یقین نہیں کرے گا اور اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گا۔''

''کیا ملک میں ایک بھی ایماندار اور بے باک صحافی نہیں ہے؟ جو ''را'' کی حقیقت سے پردہ اٹھا سکے۔'' پھر اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ ملک کے ایک معروف صحافی اور کالم نگار اپنے بہت سے کالموں میں را کے خلاف لکھ چکے ہیں۔ ان کی رپورٹ پر پولیس نے چھاپے مار کے را کے کئی ایجنٹوں کو گرفتار کرلیا ہے۔ کیا ونود ان کی نظروں میں نہیں ہو گا؟''

''میں نے ایک معروف صحافی وقارالحسن کا نام سنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ انتہائی بے باک اور نڈر صحافی ہیں اور ''را'' کے خلاف لکھتے ہیں۔''

''تو پھر ہمیں پہلی فرصت میں ان سے ملاقات کرنا چاہیے'' میں نے کہا۔ ''ہم خبر ان تک پہنچا دیں گے، اب وہ اسے چھاپتے ہیں یا ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہیں یہ ان پر منحصر ہے۔ اگر انہوں نے بھی ہماری رپورٹ کو جھوٹ کا پلندہ سمجھا تو پھر کوئی بھی ایسا صحافی نہیں ہے جو اس خبر کو اہمیت دے۔''

وقارالحسن صاحب اس وقت ایک معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر اور کالم نگار تھے۔ ان سے ملاقات کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ بہت معروف آدمی تھے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کس مزاج کے آدمی ہیں۔

میں نے انگلش کا وہ اخبار اٹھایا جس کے چیف ایڈیٹر وقارالحسن صاحب تھے، اس کا فون نمبر دیکھا اور سیل فون سے اخبار کے دفتر کال کر دی، لیکن ٹیلی فون انگیج تھا۔ میں نے دوسری لائن پر کوشش کی وہ بھی مصروف تھی۔ اخبار کی تین سے زیادہ ٹیلی فون لائنز تھیں۔ آخر پانچویں نمبر پر میرا ٹیلی فون آپریٹر نے ریسیو کیا اور امریکن انگلش میں بولی

"جی فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔"

"میڈم! اگر آپ مدد کرنا چاہتی ہیں تو چیف ایڈیٹر صاحب سے میری بات کرا دیں۔"

"وہ تو شام کو چار، پانچ بجے تک آفس آتے ہیں۔" آپریٹر نے کہا۔ "آپ میسج دے دیں۔ میں وقار صاحب کو پہنچا دوں گی۔" اس نے پیشہ ورانہ خوش اخلاقی سے کہا۔

"آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے میڈم!" میں نے کہا۔ "اگر ممکن ہو تو وقار صاحب کا سیل نمبر دے دیں۔"

"سوری سر!" آپریٹر نے معذرت کی۔ "وقار صاحب کی اجازت کے بغیر میں ان کا سیل نمبر کسی کو بھی نہیں دے سکتی۔"

"تو پھر آپ میرا سیل نمبر نوٹ کر لیں اور وقار صاحب کو پہنچا دیں کہ وہ آج مجھ سے ضرور رابطہ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"میرا نام عمران ہے" میں نے کہا۔ پھر اسے اپنا سیل نمبر لکھوا دیا۔

"کیا یہ آپریٹر وقار الحسن صاحب تک میرا پیغام پہنچا دے گی؟" میں نے ہاشم سے پوچھا۔

"مشکل ہے؟" ہاشم نے کہا۔ "تم نے کبھی کسی اخبار کا آفس دیکھا ہے؟"

"ہاں، ایک دفعہ میں اپنے اک دوست کے ساتھ ایک مشہور اخبار کے آفس گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر تم نے خود بھی دیکھا ہو گا کہ وہاں دن بھر میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں ٹیلی فون کالز تو آتی ہوں گی، ایسے میں آپریٹر کو کیا یاد رہے گا کہ تم نے وقار الحسن صاحب کے لیے کوئی پیغام بھی دیا ہے۔ یہ بھی ممکن بلکہ یقینی ہے کہ جب تک وقار صاحب آفس پہنچیں گے اس آپریٹر کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہو گی۔"

"پھر...... پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"ہمیں اخبار کے آفس جا کر وقار صاحب سے خود ملاقات کرنا چاہیے، انہوں نے اگر ہماری رپورٹ پر یقین نہ بھی کیا تو ان کے توسط سے قدوائی صاحب سے ملاقات کے آثار بھی نکل آئیں گے۔"

"اور اگر وقار صاحب نے ملنے سے انکار کر دیا تو؟" میں نے پوچھا۔

"تو پھر کچھ نہیں۔" ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

"ہم آئی ایس آئی کے کسی اہل کار سے بھی تو مل سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اب مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔" ہاشم مسکرا کر بولا۔

"آئی ایس آئی کا کوئی اہلکار ہمیں کہاں ملے گا اور کیوں ملے گا۔" بالغرض اگر کسی سے ملاقات ہو بھی گئی تو وہ پہلے تو شبے میں ہمیں ہی دھر لے گا۔ اور اگر اس نے نہ بھی پکڑا تو ہماری نگرانی شروع ہو جائے گی۔ یہ خوامخواہ اپنے لیے مصیبت کھڑی کرنے والی بات ہے۔"

ہاشم کی بات میں وزن تھا اس لیے میں خاموش ہو گیا، لیکن دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وقار صاحب سے تو ہر قیمت پر ملاقات کروں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے گھنٹوں انتظار کرنا پڑے۔

نادیہ اب تاج بخت پر اعتماد کرنے لگی تھی اس لیے وہ اسے شاپنگ کے لیے لے گئی تھی، ہم نے ناشتا خوب ڈٹ کر کیا تھا۔ اس لیے ہم میں کسی کو بھی بھوک نہیں تھی۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ تاج بخت نے جو کچھ بتایا ہے اس کی تصدیق تو کرنا چاہیے۔ میں نے تیمور سے کہا۔ "تیمور تم نے تاج بخت کے بتائے ہوئے تمام ایڈریس نوٹ کیے تھے۔ اس کے ماموں کے گھر کا ایڈریس، اس کے اسکول اور اُس گھر کا ایڈریس جہاں وہ کرائے پر رہتی تھی۔"

"جی ہاں! میرے پاس موجود ہیں۔" تیمور نے کہا۔

"تو پھر تم اک کام کرو، ان پتوں پر جا کر تصدیق کرو کہ تاج بخت نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ۔"

تیمور بے ساختہ مسکرانے لگا اور بولا۔ ”اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ دو سو فی صد سچ ہے۔“

”تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تاج بخت کی کہانی سن کر اس کی مظلومیت سے متاثر ہو گیا ہے۔ ”میں نے یہ کام نعیم سے کل ہی کرا لیا تھا۔“ تیمور نے کہا۔ ”نعیم اس کے بتائے ہوئے ایک ایک ایڈریس پر گیا اور تاج بخت نے جو کچھ بتایا تھا، اسے وہی وہاں سے بھی معلوم ہوا۔ اس نے تو اسکول جا کر ان ٹیچروں میں سے ایک ٹیچر سے ملاقات بھی کی ہے جو تاج بخت کے ساتھ کرائے کے اس مکان میں رہتی تھیں۔“

”اب میں سمجھا؟“ میں نے کہا۔ ”نادیہ نے تاج بخت پر اتنا اعتماد کیسے کر لیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر لے گئی۔“

ہم وقت گزاری کے لیے ٹی وی کی خبریں دیکھتے رہے یا پھر اخبارات پڑھتے رہے۔ ہاشم کو اپنے اُس دوست کے ٹیلی فون کا انتظار تھا جو لندن سے ہمیں اطلاعات دے رہا تھا۔

نادیہ اور تاج بخت شام کو مارکیٹ سے آئیں، نادیہ اس پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی، اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔

میں نے تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو!“ میں نے خالص امریکن لہجے میں کہا۔

”مسٹر عمران؟“ دوسری طرف سے ایک ترنم آواز سنائی دی۔

”جی بول رہا ہوں۔“ میں نے انگلش میں کہا لیکن میں الجھ کر رہ گیا تھا کہ یہ کال کس کی ہو سکتی ہے۔

”ہولڈ آن پلیز سر! باس آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ پھر میرے کانوں میں بہت دلکش موسیقی کی آواز سنائی دی۔ بڑے اداروں میں عموماً یہ اہتمام ہوتا ہے کہ ٹیلی فون پر انتظار کرنے والے کو کسی قسم کی کوفت محسوس نہ ہو۔

چند سیکنڈ بعد سیل فون پر کوئی نہایت ہی شائستہ اور مہذب لہجے میں بولا۔ ”مسٹر عمران! میں وقار الحسن بول رہا ہوں۔ آپ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے؟“

”سر...... آ...... آپ...... وقار الحسن بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں، ابھی تک تو میرا یہی نام ہے۔“ وقار صاحب کے لہجے میں مزاح کی آمیزش تھی اس سے مجھے خاصا حوصلہ ملا۔

”سر، میں آپ سے ایک انتہائی ضروری بات کرنے کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر تشریف لے آئیں۔“

”سر، آج ہی آجاؤں؟“ میں نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

”آپ آج بلکہ ابھی آجائیں۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن گیارہ بجے کے بعد نہ آیئے گا۔ اس وقت میں بہت مصروف ہوتا ہوں اور اپنے قریبی دوستوں سے بھی نہیں مل سکتا۔“

”بہت شکریہ سر!“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی آدھے گھنٹے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔“

”ضرور تشریف لائیں، لیکن میں آپ کو دس منٹ سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں اسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے ہاشم سے بولا۔ ”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”مجھے مت لے جاؤ۔“ ہاشم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرے بجائے تم نادیہ کو لے جاؤ۔“

”نہیں یار!“ میں نے کہا۔ ”تمہاری شخصیت اس حلیے میں ذرا بارعب لگتی ہے۔ اگر وقاص صاحب کو میری بات پر یقین نہ آیا تو وہ کم سے کم تمہارے سفید بالوں ہی کا کچھ لحاظ کر لیں گے۔“

میری بات سن کر ہاشم مسکرایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں دس منٹ میں تیار ہو کر باہر نکلا تو ہاشم پہلے سے تیار تھا۔ اس وقت واقعی وہ بہت بارعب اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں بہت نفیس سا ایک بریف کیس بھی اٹھا رکھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کسی بینک کا وی پی یا کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا ڈائریکٹر لگا، اس نے گاڑی بھی پہلے ہی نکلوا لی تھی جسے ڈرائیور چمکانے میں مصروف تھا۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب

میں نے نادیہ کو دیکھا۔ وہ بھی جانے کو تیار تھی۔
میں نے ہاشم سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''نادیہ تاج بخت کے ساتھ کہیں جا رہی ہے، میں نے کہہ دیا ہے کہ تیمور اور نعیم کو ساتھ لے جانا۔''

☆......☆......☆

ہم لوگ اخبار کے دفتر پہنچے تو سب سے پہلے ہمیں سیکورٹی کے سخت مراحل سے گزرنا پڑا، سیکورٹی گارڈز نے ہماری چیکنگ کی اور ہمیں ایکسنر سے گزرنا پڑا اس کے بعد ہی ہماری اخبار کے ری سپشن تک رسائی ہو پائی۔ استقبالیہ پر ایک شعلہ جوالہ بیٹھی تھی، جو سر سے پیر تک امریکن لگ رہی تھی۔ سوائے اپنی گندمی رنگت اور سیاہ بالوں کے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔
''ہیلو سر، ہاؤ مے آئی ہیلپ یو؟''(How may i help you)
''مجھے مسٹر وقار الحسن سے ملنا ہے۔'' میں نے بھی انگلش میں جواب دیا۔
''آپ کا نام سر!'' اس نے ادب سے پوچھا۔
میں نے نام بتا دیا۔ اس نے انٹر کام پر کوڈ نمبر ملایا اور بولی۔
''سر، مسٹر عمران آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' دوسری طرف کا جواب سن کر اس نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔
میں نہیں جانتا تھا کہ مسٹر وقار کہاں بیٹھتے ہوں گے لیکن کسی اخبار کے ایگزیکٹو ایڈیٹر کا آفس تلاش کرنا کون سا مشکل تھا۔
اندر داخل ہو کر میں نے پیون کی یونیفارم میں ملبوس ایک شخص سے پوچھا۔ ''مسٹر وقار کا آفس کس طرف ہے؟''
وقار احمد؟'' اس نے پوچھا۔
''ایگزیکٹو ایڈیٹر وقار الحسن!'' ہاشم نے بھاری آواز میں کہا۔
پیون ایک دم مہذب نظر آنے لگا اور بولا۔ ''آپ سامنے جائیں، پھر......'' کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ ''آیئے میرے ساتھ!''
اس نے بہتر یہی سمجھا کہ ایڈیٹر صاحب کے مہمانوں کو خود ہی ان کے آفس تک چھوڑ آئے۔
ایک کمرے پر ایگزیکٹو ایڈیٹر کی تختی لگی تھی، اس کے نیچے وقار الحسن کا نام لکھا تھا۔
ہم دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں ایک طرف گلاس ٹاپ ٹیبل تھی، اس کی سائڈ ٹیبل پر کمپیوٹر کا مانیٹر، ٹیلی فون سیٹ اور مختلف فائلیں رکھی تھیں۔ وقار صاحب اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھے۔
اچانک دروازہ کھلا اور کمرے میں باوقار ایک شخص داخل ہوا۔ اس نے بے داغ سفید شرٹ اور بہت خوب صورت ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کا کوٹ سائیڈ کے کوٹ اسٹینڈ پر لٹکا ہوا تھا۔
میں نے بے ساختہ اسے سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''وقار!''
''سر، میں عمران ہوں اور یہ میرے دوست ہاشم!'' میں نے ہاشم کا تعارف کروایا۔
اس نے ہاشم سے بھی ہاتھ ملایا اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔
''جی عمران صاحب!'' اس نے پوچھا۔ ''اب بتایئے، آپ کو مجھ سے کیا کام آپڑا۔ میں تو اپنے کاموں کے لیے خود دوسروں کی طرف دیکھتا ہوں۔''
''سر، اگر میں سچ بولوں تو کیا وہ اس کمرے تک محدود رہے گا؟''
''اگر آپ کو وہ سچ اس کمرے تک محدود کرنا تھا تو پھر یہاں آنے کی زحمت گوارہ کیوں کی؟'' وقار صاحب ہنس کر بولے۔ ان کے لہجے میں بھی ایک وقار تھا۔
''سر، میرا مطلب ہے کہ اس سچ کی کچھ باتیں؟''
''شیور!'' انہوں نے یقین دلایا۔ اخبار میں ہر خبر من وعن شائع نہیں ہونی چاہیے اس میں کتنا بھی سچ کیوں نہ ہو۔ اس کی ایڈیٹنگ ضرور ہوتی ہے۔

"کل ایک ہوٹل میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔" میں نے الفاظ کو تول کر بولنا شروع کیا۔
"یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں یا مجھے اطلاع دے رہے ہیں؟"
"میں صرف اس کی نشان دہی کر رہا ہوں، قتل ایک سماجی کارکن اور تاجر کا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ وقار صاحب خاموش رہے تا کہ میں مزید بولوں۔ "سر، وہ اصل میں نہ تو سماجی کارکن تھا، نہ تاجر!" میں نے کہا۔
"آپ غلط جگہ آ گئے ہیں مسٹر عمران!" وقار صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کو یہ اطلاع پولیس کو دینا چاہیے۔"
"یہ اطلاع میں صرف آپ ہی کو دے سکتا ہوں۔ پولیس تو اس کی تنخواہ دار تھی۔"
اب انہوں نے کچھ دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔ "وہ (را) کا ایک بدنام زمانہ ایجنٹ ونود تھا۔" میں نے اچانک کہا اور وقار صاحب کو بری طرح چونکتے دیکھا۔
"ونود؟" انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔" "مقتول ایک باشرع مسلمان تھا اور......"
"میں یہی تو آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس نے مرتے وقت خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ گزشتہ بائیس سال سے ہمارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔ وہ مجھے کسی ایجنسی کا آدمی سمجھ رہا تھا اس لیے روانی میں اتنا بول گیا۔"
"گویا وہ آپ کے ہاتھوں مارا گیا ہے؟" وقار صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"میں نے کچھ نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو اس کی اصلیت پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ کر بھی معلوم ہو جائے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ کو اصل رپورٹ مل جائے، ورنہ پولیس اس رپورٹ کو بھی غائب کر دے گی۔"
وقار صاحب کے چہرے پر اب مجھے گمبھیر سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی، وہ کچھ سوچ رہے تھے، پھر انہوں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور بولے۔ "ایس ایس پی علی سے بات کرائیں۔" انہوں نے ریسیور رکھ کر مجھے غور سے دیکھا، پھر بولے "آپ کا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟"
"میرا تعلق کسی ایجنسی سے نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔
اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے ریسیور اٹھا لیا، پھر بولے۔ "جی ہاں، بات کرائیے......"
"ہیلو بوائے...... کیسے ہو تم......؟"
"میں بالکل ٹھیک ہوں...... یار، تم سے ایک کام تھا، میں اس بارے میں ڈائریکٹ آئی جی یا ڈی آئی جی سے بھی بات کر سکتا تھا لیکن مجھے تم پر زیادہ اعتماد ہے۔ تم سچے اور کھرے پولیس آفیسر ہو......"
"کام......"
"مجھے کل رات ہوٹل میں قتل ہونے والے عبدالحمید راجپوت کی پوسٹ مارٹم رپورٹ چاہیے۔ ہاں اس سے پہلے کہ پولیس کا کوئی افسر اس میں ردوبدل کر دے، وہ رپورٹ مجھے چاہیے۔"
"ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور مجھ سے بولے۔ "عمران صاحب! آپ کرتے کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کی مصروفیات کیا ہیں آج کل؟"
"گلوبل گروپ آف انڈسٹریز کے نام سے میرا بزنس ہے اور......"
"تم احسان کے بیٹے ہو؟" وقار صاحب چونک کر بولے اور اچانک آپ سے تم پر آ گئے۔ "جی سر! میں احسان صاحب کا بیٹا ہوں۔"
وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پرجوش انداز میں میری طرف بڑھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے بہت گرم جوشی کے ساتھ مجھے گلے سے لگا لیا اور بولے۔ "احسان پرائمری سے لے کر کالج تک میرا کلاس فیلو تھا، پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا گیا، میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی بیٹا! میں تو خود تم

لوگوں کی تلاش میں تھا، سنا ہے کہ تمہارے خاندان کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہوئی ہے۔ میں ان دنوں ملک میں نہیں تھا ورنہ تم سے بہت پہلے ملاقات ہو چکی ہوتی۔ میں......"

ان کا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی، انہوں نے گھوم کر کھڑے ہی کھڑے ریسیور اٹھالیا اور بولے۔ "بات کرائیے......" پھر چند لمحے بعد بولے۔ "ہاں علی!"

"کب تک...... میں آفس میں ہی ہوں...... تم رپورٹ لے کر آجاؤ۔" انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور بولے۔ "ایس ایس پی علی عبدالحمید کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لے کر ابھی یہاں پہنچ رہا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "سنا ہے کہ احسان کا انتقال کسی حادثے میں ہوا تھا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے انکل!" میرے منہ سے خود بہ خود سر کی بجائے انکل نکل گیا۔ "آپ نے مجھے صرف دس منٹ کا وقت دیا ہے، آپ کے پاس کبھی ٹائم ہوگا تو میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ میری فیملی پر کیا بیتی!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میری تو پوری فیملی ختم ہوگئی انکل!" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، صرف ایک چھوٹا بھائی عدنان ہی میرے ساتھ ہے۔ اسے میں نے اس خون خرابے سے بچنے کے لیے امریکا بھجوا دیا ہے، میرے گھر کو بم سے اڑا دیا گیا تھا، میری ایک بہن شائستہ کو اغوا کر لیا گیا، اس کا آج تک سراغ نہیں ملا۔ ایک بھائی کے بارے میں مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہ مر چکا ہے لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی، وقار الحسن صاحب نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے ریسیور اٹھالیا۔ وہ ابھی تک اپنی کرسی پر بیٹھے نہیں تھے، انہوں نے کہا۔ "یس...... !کون...... تو...... مس شبانہ...... میں اس وقت بہت امپورٹنٹ میٹنگ میں ہوں۔ میرے سارے اپائنٹمنٹ کینسل کر دو بلکہ اب اگر کوئی ٹیلی فون یا ملاقاتی آئے تو کہہ دینا کہ میں آفس میں موجود ہی نہیں ہوں۔"

انہوں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ انٹر کام کی بیل بجی۔

انہوں نے جھنجلا کر ریسیور اٹھایا اور بولے۔ "اب کیا ہے؟" ......اچھا...... اچھا...... انہیں میرے پاس بھیج دو۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

مشکل سے ایک منٹ بعد ایک اسمارٹ اور وجیہہ نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کا قد درمیانہ لیکن جسم کسرتی تھا۔ رنگت سرخ و سفید اور بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں جو اس کے پروقار چہرے پر اچھی لگ رہی تھیں، اس کی پیشانی کشادہ تھی اور سب سے زیادہ متاثر کن اس کی آنکھیں تھیں۔ ذہانت سے بھرپور، چمک دار، سیاہ آنکھیں!

اس نے وقار صاحب کو سلام کیا تو وقار صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کر اس کا استقبال کیا اور بولے۔ "یار، تم تو اپنے باپ سے بھی زیادہ بے مروت ہو، کبھی بغیر کسی کام کے بھی چکر لگایا کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم دن میں کم سے کم تین چار بار یہاں سے گزرتے ہو گے؟"

"انکل! آپ کی بات درست ہے لیکن......"

"وقت نہیں ملتا۔" انہوں نے ہنس کر جملہ پورا کر دیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "یہ ایس ایس پی علی ہے، اس کی عمر پر مت جاؤ، اس نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے ورنہ ایس ایس پی عموماً اتنے ینگ نہیں ہوتے۔" پھر وہ علی سے بولے۔ "یہ عمران ہے، میرے اور تمہارے پاپا کے ایک دوست احسان کا بیٹا! اور یہ اس کے دوست ہیں۔" انہوں نے ہاشم کی طرف اشارہ کیا۔

علی نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر اس نے ہاشم سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ لائے ہو؟"

"انکل! میں خالی ہاتھ تو آنے سے رہا۔" علی نے ہنس کر کہا۔ "لیکن پہلے مجھے اچھی سی کافی پلوائیں۔ میں اپنی

کافی چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"یار علی! تم میں بھی آہستہ آہستہ پولیس والوں جیسی حرکتیں آتی جا رہی ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور انٹر کام اٹھا کر چار کپ کافی اور کچھ اسنیکس لانے کو کہا۔

علی نے رپورٹ نکالی اور بولا۔ "انکل، اس راجپوت کے پوسٹ مارٹم کے بعد ایک عجیب انکشاف ہوا ہے، وہ مسلمان نہیں تھا!"

"میں جانتا ہوں۔" وقار صاحب نے کہا۔ "اس لیے تم سے کنفرم کرنے کو پوسٹ مارٹم رپورٹ منگوائی تھی۔"

"آپ نے بروقت مجھے اطلاع دے دی۔ مجھے اگر چند منٹ کی تاخیر بھی ہو جاتی تو لیبارٹری کا عملہ رپورٹ غائب کر دیتا۔ میری جگہ کوئی اور افسر ہوتا تب بھی وہ اسے اصل رپورٹ نہ دیتے۔ لیبارٹری انچارج تو مجھ سے بھی بحث کر رہا تھا لیکن وہ مجھے جانتا ہے کہ اگر اس نے زیادہ بحث کی یا رپورٹ دینے سے انکار کیا تو میں اس کی چھٹی بھی کرا سکتا ہوں۔"

"اس لیے تو مجھے تمہارا انتخاب کرنا پڑا۔" وقار صاحب نے کہا۔ "ورنہ بہ ظاہر تو یہ معمولی کام تھا اور کوئی بھی پولیس افسر کر سکتا تھا، لیکن پھر میرے پاس اصل رپورٹ کبھی نہ پہنچتی!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "مرنے والے کا اصل نام کیا تھا؟"

"اس کا نام ونود تھا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ (را) کا بہت سینئر ایجنٹ تھا۔"

میری بات سن کر علی بُری طرح اُچھل پڑا۔ "اس کا نام ونود تھا؟ وہ "را" کا ایجنٹ تھا؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کے پاس اس بات کا کوئی پروف ہے؟" علی نے اب خالص پولیس والا بن کر کہا۔

"پروف تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ وہ مسلمان نہیں ہندو تھا۔ باقی کام آپ کا ہے؟ آپ تفتیش کریں گے تو خود ہی اس معاملے کے سرے پر پہنچ جائیں گے۔"

"میں آپ سے اس اطلاع کا ذریعہ پوچھ رہا ہوں۔"

"جرنلسٹوں کی طرح میں بھی سورس آف انفارمیشن نہیں بتاتا ہوں لیکن آپ کو بتا دوں گا۔ بات لمبی ہے اس لیے آپ کو اس کے لیے کچھ وقت نکالنا پڑے گا۔"

اس دوران میں کافی آ گئی، علی نے کافی پی، پوسٹ مارٹم رپورٹ وہ پہلے ہی وقار صاحب کے حوالے کر چکا تھا۔ وہ مجھ سے بولا۔ "مسٹر عمران! آپ مجھے اپنا ایڈریس یا سیل نمبر دے دیں، میں کسی بھی وقت آپ کو کال کر کے ملاقات کا وقت طے کر لوں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دیجیے، ابھی مجھے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا ہے۔" پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"انکل! کافی کا شکریہ، آئندہ ملاقات تفصیلی ہوگی۔"

"تم ہر ملاقات پر یہ ہی کہتے ہو!" وقار صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "اوکے وِش یُو بیسٹ آف لک......" (Wish you best of luck) اس کے جانے کے بعد ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ "کیا تمہیں بھی کسی اہم میٹنگ میں شرکت کرنا ہے؟" وقار صاحب نے پوچھا۔

"نہیں انکل، میں تو......"

"بیٹھو!" انہوں نے نہایت اپنائیت سے کہا۔ "میں نے تمہاری وجہ سے تو آج کی تمام میٹنگز کینسل کی ہیں۔ ہاں، تمہارے دوست کو کوئی ضروری کام ہو تو میں اسے نہیں روکوں گا۔"

"سر میں تو عمران کے ساتھ ہوں۔ مجھے کوئی ضروری کام نہیں ہے۔"

"تم کم سے کم مجھے یہ بتا دو کہ تم ونود کو کیسے جانتے ہو؟" پھر وہ جلدی سے بولے۔ "وقت کی فکر مت کرنا۔ اب رات کے گیارہ بجے تک میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔"

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے، گویا انکل کے دس منٹ اب تک ڈیڑھ گھنٹے میں تبدیل ہو چکے تھے اور وہ ساڑھے چار گھنٹے مزید دینے کو تیار تھے۔

''مجھے حیرت ہے انکل!'' میں نے کہا۔ ''ہمارے بنگلے کو بم سے اڑا دیا گیا اور جرنلسٹ ہوتے ہوئے بھی آپ کو خبر نہ ہوئی؟''

''میں تمہیں بتا تو چکا ہوں بیٹا کہ اس وقت میں ملک میں نہیں تھا۔''

''آپ ان دنوں کہاں تھے، یورپ میں یا امریکا میں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ان دنوں جیل میں تھا۔'' ان کی بات پر میں بری طرح اُچھل پڑا۔ ''جیل میں؟ آپ جیل میں ہوں گے تب بھی آپ کو باہر کی تو ایک ایک خبر ملتی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''نہیں ملتی تھی، انکل مسکرائے۔ ''مل ہی نہیں سکتی تھی کیوں کہ میں پاکستان کی نہیں بھارتی جیل میں تھا۔''

''آپ بھارتی جیل میں تھے لیکن کیوں؟''

''یار تم نے انٹرویو شروع کر دیا۔ میں تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری فیملی کے ساتھ اس قسم کے واقعات کیوں پیش آئے؟'' وہ اب کچھ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

میں نے ایک لمحہ موقف کیا، پھر انہیں سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا، پھر آہستہ آہستہ میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

انکل وقار میری باتیں پلک جھپکائے بغیر سن رہے تھے۔ اس دوران میں گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا، کبھی ان کا اسسٹنٹ کسی خبر کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ان کے پاس آیا، اخبار کے ایڈیٹر نے انہیں اداریہ بھجوایا کہ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

انہوں نے واقعی اس پر ایک ہی نظر ڈالی اور صرف اداریے کا ٹائٹل دیکھ کر واپس کر دیا کہ خورشید صاحب سے کہنا، اداریہ ٹھیک ہے، بس اس کا عنوان بدل دیں۔

میری باتیں سننے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے اور بولے۔ ''میں مشہدی اور اس کی ملک دشمنی سرگرمیوں کے بارے میں بھی جانتا ہوں، اس کے خلاف میں نے خبریں بھی لگوائی ہیں اور اداریے بھی لکھے ہیں لیکن نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوا، لگتا ہے کہ اس نے پولیس اور بیورو کریسی کے بہت بڑے بڑے افسران کو خرید رکھا ہے لیکن اب میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ دہشت گردی کی انتہا تو یہ ہے کہ اس نے کرائے کے قاتل امپورٹ کیے ہیں۔''

''انکل! ایک بات اور! میں چاہتا ہوں کہ آپ قدوائی صاحب کو بھی خطرے سے آگاہ کریں، چند دن بعد وہ حیدر آباد میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے ہیں وہ مشہدی کی ہٹ لسٹ میں ٹاپ پر ہیں، انہیں اور ان کی پارٹی کے جنرل سیکریٹری کو ختم کرنے کے لیے تو مشہدی نے ان بین الاقوامی دہشت گردوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

''اب تم اس کی فکر مت کرو۔ قدوائی صاحب کو خطرے سے آگاہ کرنا اور انہیں اس جلسے سے روکنا میری ذمے داری ہے۔ قدوائی سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں، لیکن وہ بہت ضدی اور اصولی آدمی ہے۔ مشکل ہی سے اپنا پروگرام کینسل کرے گا۔ میں علی کو بھی اس کے پاس بھیجوں گا۔ وہ پورے پولیس ڈپارٹمنٹ میں علی پر اعتماد کرتا ہے۔ علی بھی اسے سمجھائے گا کہ بات اس کی سمجھ میں آجائے گی۔ تم مجھے ان امپورٹڈ قاتلوں کے نام لکھوا دو۔ میں وہ بھی علی کے حوالے کر دوں گا۔''

''آپ وہ نام ضرور ان کے حوالے کر دیں، لیکن مشہدی پولیس کے قابو میں نہ پہلے کبھی آیا ہے، نہ اب آئے گا۔ اسے صرف اور صرف اسٹیبلشمنٹ لگام دے سکتی ہے۔''

انکل نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''تم تو پاکستانی سیاست کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔''

''ان حالات سے گزرنے کے بعد جان گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

انکل وقار نے اپنی رسٹ واچ پر نظر دوڑائی اور بولے۔ ''اوہو! دس بج گئے۔ آؤ کچھ کھائیں تو پھر میں اخبار کی کاپیاں چیک کرنے کے لیے چلا جاؤں گا۔''

''کھانے کا تکلف مت کریں انکل!'' میں نے کہا۔

''ارے یار تکلف کیسا؟'' انہوں نے کہا۔ ''کھانا لگ چکا ہوگا۔ میرا پیون بھی جانتا ہے کہ اگر کھانے کے وقت تک کوئی ملاقاتی میرے ساتھ ہے تو وہ کھانا بھی کھائے گا۔''

آفس کا ڈائننگ روم بھی بہت خوب صورت تھا۔ جہاں اخبار کے مختلف کارکن پہلے سے بیٹھے تھے اور خوش گپیاں جاری تھیں۔

وقار صاحب کو دیکھ کر ان سب نے باری باری معلوم کیا۔ وقار صاحب کو ان سب نے باری باری سلام کیا۔ وقار صاحب سب کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے ایک الگ کیبن کی طرف بڑھے، وہ کیبن کیا، اس ڈائننگ روم کا ایک پورشن تھا جسے چپ بورڈ کی دیوار کے ذریعے ڈائننگ روم سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

''ہم نے کھانا کھایا، پھر کافی پیتے ہوئے وقار صاحب نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم صبح گیارہ بجے سے لے کر چار بجے تک کسی بھی وقت میرے گھر آ سکتے ہو، میرا سیل نمبر بھی نوٹ کر لو۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور ان کا سیل نمبر محفوظ کر لیا۔

وہ ہاشم سے مخاطب ہوئے۔ ''یار، آپ واقعی اتنے کم گو ہیں یا آج ہی خاموشی کا دورہ پڑا ہے۔'' وہ اصل میں ہاشم پر یہ واضح کرنا چاہ رہے تھے کہ وہ اسے نظر انداز نہیں کر رہے ہیں۔

''میں اتنا کم گو نہیں ہوں سر!'' ہاشم نے کہا۔ ''لیکن اس وقت تو بولنے کی باری عمران کی تھی، میں تو یوں ہی اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔''

''مورل سپورٹ کے لیے؟'' وقار صاحب نے پوچھا۔

''عمران کی سیکورٹی کے لیے۔'' ہاشم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ان حالات میں اسے کسی باڈی گارڈ کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ میں عمران کا دوست بھی ہوں اور باڈی گارڈ بھی۔''

''لیکن معاف کیجیے گا آپ اپنے حلیے سے تو کسی ملٹی نیشنل ادارے کے ڈائریکٹر یا کسی اخبار کے ایڈیٹر لگتے ہیں۔'' وقار صاحب ہنس کر بولے۔

''یہی تو خوبی ہونا چاہیے باڈی گارڈ میں۔'' وقار صاحب ہنس کر بولے۔ ''جو دیکھنے والوں کو بے ضرر دکھائی دے۔''

''آپ بھی عمران کے ہمراہ جب چاہیں میرے غریب خانے پر آ سکتے ہیں۔''

''میں انشاء اللہ ضرور حاضر ہوؤں گا۔'' ہاشم نے کہا۔

''ڈنر کے بعد وقار صاحب اُٹھ گئے اور مجھ سے بولے۔ ''عمران بیٹا! اب مجھ سے رابطے میں رہنا۔''

''جی انکل!'' میں نے کہا۔

''اور ہاں تم نے ونود کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا ہے، وہ اعتبار کر کے کسی اور کو مت بتانا کہ ونود تمہارے ہاتھوں مارا گیا، علی کو بھی نہیں۔ میں ابھی اس کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرتا ہوں کہ مقتول سماجی کارکن عبدالحمید راجپوت، مسلمان نہیں بلکہ ہندو تھا۔ وہ مسلمان ہونے کا ڈھونگ رچا رہا تھا، کیوں کہ اس سلسلے میں پولیس تفتیش کر رہی ہے اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔''

ان کے آفس سے نکلتے نکلتے ہمیں گیارہ بج گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس مرتبہ بھی ہاشم تھا، ہم آئی آئی چندریگر روڈ سے میٹروپول کی طرف مڑے تو مجھے سیاہ رنگ کی ایک مرسڈیز دکھائی دی۔ وہ کلفٹن کی طرف سے آ رہی تھی اور ٹرن لے کر شاہراہ فیصل کی طرف مڑ گئی۔

ہاشم نے گاڑی ٹرن کی تو عین اس کے پیچھے آ گیا۔ اس کا نمبر دیکھ کر میں اسی طرح چونک اُٹھا، وہ جیک کی مرسڈیز کا

نمبر تھا جو میرے ذہن میں محفوظ تھا۔
میں نے دبے دبے جوش کے ساتھ ہاشم سے کہا۔ ''ہاشم! آگے وہی مرسڈیز ہے جس میں اس دن جیک سوار تھا۔
ہاشم بھی چونک اٹھا۔ جیک سوار تھا؟'' اس نے مجھ سے یہ سوال ضرور کیا تھا۔ ''تم نے تو اس کی شکل بھی دیکھی تھی۔ کیا تم اسے پہچان سکتے ہو؟'' ہاشم نے کہا۔ ''میں اسے ہزاروں کے مجمعے میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ اس کا چہرہ ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے۔''
''میں گاڑی اس کے برابر لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم اسے پہچان لو۔'' ہاشم نے کہا۔ ''جیک نہ بھی ہوا تو کم سے کم اس مرسڈیز کے ڈرائیور کے ذریعے ہم جیک تک پہنچ سکتے ہیں۔''
ہاشم نے کہا اور اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔ وہ گاڑیوں کے درمیان سے جگہ بناتا ہوا مرسڈیز کے بالکل برابر آ گیا، مہران ہوٹل کے سگنل پر ہمیں آنا پڑا۔ میں نے اپنی گاڑی کا شیشہ ہٹائے بغیر مرسڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا تو میرا دوران خون بڑھ گیا۔ وہ جیک ہی تھا۔
میں نے ہاشم کو بتایا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر جیک ہی ہے۔ ''گاڑی میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا فرد نہیں ہے۔''
''بس تو پھر آج اس کی باری ہے۔'' ہاشم نے کہا اور سگنل کی طرف دیکھا جو اب گرین ہو چکا تھا اور گاڑیاں رینگ رہی تھیں۔
ہاشم بہت مہارت سے اپنی گاڑی اس مرسڈیز کے عقب میں لے گیا۔
''اسے احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔
''اس کی تم فکر مت کرو۔'' ہاشم نے کہا۔ ''میں نے ایسے چوہے بلی کے کھیل بہت کھیلے ہیں۔ اس کے سلسلے میں کچھ زیادہ محتاط رہوں گا کیوں کہ یہ خود بھی بہت گھاگ ہوگا۔ مشہدی نے اسے یوں ہی تو نہیں بلایا ہوگا۔''
اب ہماری گاڑی ایف ٹی سی برج کے نیچے سے گزر رہی تھی، ہاشم نے جان بوجھ کر اپنی اور جیک کی گاڑیوں کے درمیان دو گاڑیوں کو حائل ہونے کا موقع دے دیا تھا کہ جیک کو ذرہ برابر بھی تعاقب کا پتا نہ چل سکے۔ شاہراہ فیصل پر ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ ہاں اگر وہ کسی سروس روڈ پر مڑ جاتا تو ہمارے لیے تعاقب میں مشکل ہو سکتی تھی۔
میں نے احتیاطاً اپنا ریوالور نکالا اور اس پر سائلنسر فٹ کر لیا۔ اگر جیک زندہ ہمارے ہاتھ نہ آتا تو میں آج کسی بھی صورت میں اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں اسے گولی مار کے جہنم میں پہنچا دیتا۔
''کیا ارادے ہیں عمران؟'' ہاشم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا جیک کو زندہ نہیں پکڑنا؟''
''کوشش تو میری یہی ہے کہ وہ زندہ ہمارے ہاتھ لگ جائے لیکن اگر وہ زندہ ہمارے ہاتھ نہ آیا تو آخری آپشن یہی ہے کہ اسے بھی ونود کی طرف پارسل کر دیا جائے۔''
''ایک ہفتے کے دوران میں یہ دوسرا امریکی شہری ہلاک ہوگا تو امریکی سفارت خانہ آسمان سر پہ اٹھا لے گا۔ حکومت بہت زیادہ پریشر میں آ جائے گی۔''
''تو آتی رہے۔'' میں نے کہا۔ ''امریکا سے ڈالرز بھی حکومت ہی کھاتی ہے، ہم لوگ نہیں، پھر حکومت جانے اور امریکا جانے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا اور سامنے چلتے ہوئے ٹریفک پر نظریں جما دیں۔
ہمیں ایک فائدہ یہ تھا کہ ہمارے پاس لینڈ کروزر تھی، لینڈ کروزر دوسری گاڑیوں کے مقابلے میں نسبتاً اونچی ہوتی ہے اس لیے ہماری اور جیک کی گاڑی کے درمیان دو گاڑیاں حائل ہونے کے باوجود مجھے مرسڈیز واضح طور پر نظر آ رہی تھی، جیک بہت برق رفتاری سے جا رہا تھا۔ اس رفتار سے ہاشم بھی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ جب گاڑی نرسری اور عوامی مرکز سے بھی آگے نکل گئی تو میرا خیال تھا کہ یہ کارساز والی روڈ سے غالباً کے ڈی اے اسکیم نمبروں کی طرف جائے گی لیکن کارساز بھی گزر گیا، پھر میں نے سوچا کہ شاید یہ ڈرگ روڈ سے راشد منہاس روڈ کی طرف مڑے گا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے جیک نے ناک کی سیدھ میں چلنے کا ارادہ کر لیا ہو اور شاہراہِ فیصل سے فری شاہراہ کی طرف

نکل جائے گا۔
اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ملیر میں بڑے بڑے فارم ہاؤسز ہیں، قومی شاہراہ پر بھی کئی بڑے فارم ہاؤس تھے، ممکن ہے جیک ان میں سے کسی فارم ہاؤس میں مقیم ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے فارم ہاؤس زیادہ بہتر رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بھی بہتر تھا، ہم وہاں جیک کو اچھی طرح گھیر سکتے تھے۔ وہاں دور دور تک کوئی اس کی چیخ پکار سننے والا نہ ہوتا۔
اچانک وہ اسٹار گیٹ سے ٹرمنل ون کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔
اس سڑک پر گاڑیاں کم تھیں، اب ہاشم بہت محتاط ہو گیا تھا۔
اب ہماری اور جیک کی گاڑی کے درمیان کسی ایئرلائن کی ویگن تھی۔
وہ ویگن دائیں طرف مڑی تو اس روڈ پر اب صرف ہماری اور جیک کی گاڑی رہ گئی۔
ایسا نہیں ہے کہ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ جیک کی گاڑی کے آگے بھی گاڑیاں تھیں اور ہماری گاڑی کے پیچھے بھی کئی گاڑیاں تھیں۔
پھر جیک کی گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی اور وہ بائیں طرف کے ایک ہوٹل کے پورچ میں داخل ہو گیا۔
ہوٹل کے ایک ملازم نے آگے بڑھ کر اس سے گاڑی کی چابی لی اور جیک اندر داخل ہو گیا۔
''گاڑی روکو ہاشم!'' میں نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ''وہ نہ جانے یہاں کس نام سے ٹھہرا ہے۔ وہ اگر روم میں چلا گیا تو بہت پریشانی ہوگی۔''
ہاشم نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اس ہوٹل میں مقیم ہے؟''
''میرا اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم گاڑی کو یہیں کہیں پارک کر کے انتظار کرو، میں تمہیں سیل فون پر کال کر کے پچویشن بتادوں گا۔'' یہ کہہ کر میں گاڑی سے اُترا اور انتہائی عجلت میں ہوٹل کی طرف بڑھا۔
وہ ہوٹل چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں پسند آیا۔ باوردی دربان نے میرے لیے دروازہ کھولا تو مجھے خوش گوار خنکی کا احساس ہوا۔ فضا میں ایئر فریشنر کی مہک تھی۔
جیک مجھے کاؤنٹر کے پاس کھڑا دکھائی دیا۔ اس وقت ریسپشنسٹ نے ایک چابی کی اسٹینڈ (Key Stand) سے اتار کے اس کی طرف بڑھا دی۔
ہوٹل میں اس وقت زیادہ آدمی نہیں تھے۔ یوں بھی اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ لاؤنج میں کچھ لوگ موجود تو تھے لیکن وہ مجھے پینجر لگ رہے تھے، کیوں کہ ان کے بیگ اور چھوٹے بریف کیس بھی ان کے ساتھ ہی رکھے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ غالباً وہ لوگ کسی فلائٹ کے انتظار میں وہاں آئے تھے یا پھر ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے کے بعد جانے کے منتظر تھے۔
جیک چابیاں لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جب کہ میں غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کوریڈور میں پہنچ کر اس نے چابی سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اندر داخل ہو گیا۔
میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا نمبر دیکھا۔ وہ کمرا نمبر ایک سو بارہ تھا۔
وہ کوریڈور میں ٹہلتا ہوا آگے نکل گیا کیوں کہ مجھے اپنے پیچھے ہی قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دوسرے جدید ہوٹلوں اور دفتروں کی طرح اس ہوٹل میں بھی بہت بہترین قسم کے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔
میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ہاشم کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ ''وہ کمرا نمبر ایک سو بارہ میں گیا ہے۔ میں بھی اندر جا رہا ہوں۔ اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر میری واپسی نہ ہو تو تم اپنے طور پر ایکشن لے سکتے ہو۔''
میں ہاشم سے بات کر کے پلٹا ہی تھا کہ مجھے اپنے عین پشت پر جیک دکھائی دیا۔ اس وقت کوریڈور میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے ریوالور نکال رکھا تھا۔ وہ غرا کر بولا۔ ''خاموشی سے میرے ساتھ چلو، کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

اس کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گا۔
میں نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ میں تمہاری بات کا مطلب سمجھا نہیں۔ کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟''
''کمرے میں چلو۔'' وہ غرا کر بولا۔ ''میں تمہیں اپنی بات کا مطلب بھی سمجھا دوں گا۔''
میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن اس نے مجھے جھڑک دیا۔
''بکواس بالکل نہیں، اگر تم نے میری بات پہ عمل نہ کیا تو میں فائر کر دوں گا۔''
میں جھنجلا کر اس کے آگے آگے چل دیا۔ وہ میرے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے میرا بہت پرانا شناسا ہو۔
اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔
میرے اندر داخل ہوتے ہی وہ بھی بہت پھرتی سے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔
''اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے ٹکا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے مجھے حکم دیا۔
میں نے دونوں ہاتھ دیوار سے لگا دیے۔
اس نے انتہائی مہارت سے میرے دونوں بغلی ہولسٹر، میرا والٹ اور سیل فون میری جیب سے نکال لیا۔ پھر اس نے میری تلاشی لی اور میری کمر پہ ایک زبردست لات ماری۔ میں سامنے والی دیوار سے ٹکرایا اور چھپکلی کی طرح چت سے فرش پر گر گیا۔ اس نے لات ہی اتنی قوت سے ماری تھی، اس نے بال پکڑ کے مجھے کھڑا کر دیا اور ریوالور کی نال میری کنپٹی پر رکھ دی، پھر اس نے کچھ سوچ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا والٹ نکال کر اس میں سے ایک تصویر نکالی اور اس تصویر سے میرا موازنہ کرنے لگا۔
وہ نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا، مجھے تصویر کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کے چہرے پر پشیمانی دیکھی۔ اس نے تصویر دوبارہ والٹ میں رکھ لی اور تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''
''میرا نام عبدالقدوس ہو یا جیک قدوس تمہیں اس سے کیا فرق پڑے گا۔''
''تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔
تمہارا پیچھا؟'' میں نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں بھلا تمہارا پیچھا کیوں کروں گا۔ تم کوئی خوب صورت لڑکی تو نہیں ہو کہ......''
میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس نے زناٹے کا ایک تھپڑ میرے گال پر رسید کر دیا۔ ''میں بکواس سننے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے سچ سچ بتا میرا پیچھا کیوں کر رہا تھا؟''
''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا ہوں، مجھے ایک دوست ہاشم کی تلاش ہے۔''
اس نے ریوالور کا رُخ میری طرف کیا اور اس کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ ''اگر تو نے اب بھی سچ نہ بولا تو میں تجھے گولی مار کے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تو شاہراہ فیصل سے میرے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے بہت پہلے اس لینڈ کروزر کو نوٹس کر لیا تھا جو میرے پیچھے آ رہی تھی۔ کیا تو اب بھی جھوٹ بولے گا؟''
میں نے ایک طویل سانس لیا۔ ''ہاں، میں تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔'' میں نے یوں کہا جیسے کوئی ڈھیٹ قسم کا شاگرد بالآخر ٹیچر کے سامنے سچ بولتا ہے۔
''مجھے اس کا باقاعدہ معاوضہ ملتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔''
''یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''شریف آدمی دو دو ریوالور لے کر نہیں چلتے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''تیرا تعلق کسی ایجنسی سے تو نہیں ہے؟''
''تم امریکن ہو کر ایسی بات کر رہے ہو؟'' میں نے اپنے طور پر طنز کیا۔ ''یہاں کی تمام ایجنسیاں تو تمہارے ملک کی جیب میں ہیں۔''

''زیادہ تقریر جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جھلا کر بولا لیکن اب اس کے لہجے میں پہلی سی سفاکی نہیں تھی۔
''مجھے صرف اتنا بتا کہ تو میرا پیچھا کیوں کر رہا تھا؟''
''میں نے کہا نا کہ میں معاوضے پر یہ کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایک شخص نے تمہارا پیچھا کرنے اور ٹھکانا معلوم کرنے کے ایک لاکھ روپے دیے تھے۔''
''کیوں؟'' اس نے پُر خیال انداز میں پوچھا۔
''میں اپنے کلائنٹ سے کسی بھی کام کی وجہ نہیں پوچھتا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے معقول معاوضہ دو تو میں تمہارے لیے بھی کام کر سکتا ہوں؟''
''تمہیں کس نے میرے پیچھے لگایا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''وہ ایک گینگسٹر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہ ظاہر وہ شریف اور نیک نام بزنس مین ہے لیکن اصل میں وہ انڈر ورلڈ کا بہت بڑا ڈان ہے۔''
''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔
''اس کا نام عمران ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بُری طرح چونکا۔
''عمران!'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر اس نے جیب سے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے کوئی چیز نکالنے لگا۔
اس لمحے وہ مجھ سے کچھ غافل ہو گیا تھا۔ میں نے اچانک اس کے سینے پر زوردار فلائنگ کک رسید کی، میری دوسری لات اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑی، وہ دیوار سے ٹکرا کر گرا، پھر فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور ایک راؤنڈ کک رسید کر دی۔ پھر اس سے بھی زیادہ قوت سے دوسری راؤنڈ کک ماری۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔
میں نے اسے گھسیٹ کر بیڈ پر ڈالا پھر کمرے میں موجود ایک چادر جھاڑ کر اس کے ٹکڑوں سے جیک کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔
اچانک دروازہ کھلا اور ہاشم اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔
''اسے یہاں سے لے کر جانا ہے۔'' میں نے ہاشم سے کہا۔
''یہاں سے اسے کیسے لے جائیں؟'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''لیکن تم اندر کیسے آئے؟''
''دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔''
''اب تو اسے لاک کر دو۔'' میں نے ہاشم سے کہا۔
''مجھے سوچنے دو کہ ہم اسے ہوٹل سے باہر کیسے نکالیں۔ اپنی مرضی سے تو یہ چل کر جانے سے رہا۔ ہم اسے بے ہوش کر کے بھی نہیں لے جا سکتے۔''
''تم ذرا جائزہ لے کر آؤ۔ اس ہوٹل کا کوئی دوسرا دروازہ ضرور ہو گا جو ایمرجنسی کی صورت میں استعمال ہو سکے۔''
''تم اپنے ریوالور پر سائلنسر فٹ کر لو اور دروازہ اندر سے لاک کر لو، میں واپسی پر اس انداز میں دستک دوں گا۔ کھٹ کھٹ......کھٹ!'' ہاشم نے کہا۔ کوئی اور دستک دے تو تم ہرگز دروازہ مت کھولنا۔''
ہاشم کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے لاک کیا۔ رات کے اس پہر میں عموماً روم سروس والے بھی کم ہی مہمانوں کے کمروں کی طرف جاتے ہیں۔
اچانک جیک کسمسایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ''غوں غوں'' کر کے اشارہ کیا کہ میرا منہ کھول دو۔''
''اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو میں اس مرتبہ تمہارا منہ بند نہیں کروں گا بلکہ گولی مار دوں گا۔'' میں نے اسے ریوالور دکھایا اور اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا ڈھیروں کپڑا نکال لیا۔

اس نے دو چار گہرے گہرے سانس لیے اور بولا۔ ”مجھے ذرا پانی پلا دو، میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔“ میں نے بیڈروم میں رکھا فریج کھول کر اس میں سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس بھر کے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے پانی پلانے کے ساتھ اس کا سر کچھ اونچا کر دیا تھا۔

اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ اس میں کچھ پانی اس کے کپڑوں پر بھی گرا۔

”تم یہاں کس بزنس ڈیل کے لیے آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”مشہدی کے ساتھ مل کر تم کون سا بزنس کرنا چاہتے ہو؟“

”آخر میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

”تمہارا تعلق کسی ایجنسی سے ہے لیکن تم میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔“

”میں تمہیں ابھی گولی مار دوں تو کیا تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا؟“

”لیکن تم ایسا کر نہیں سکتے۔“

”مجھے ایسا کرنے سے کوئی روک سکتا ہے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں ابھی تمہیں گولی مار دوں گا اور نکل جاؤں گا۔ ریوالور پر لگا ہوا سائلنسر تو تم بھی اچھی طرح پہچانتے ہو گے؟“

”لیکن تم مجھے کیوں مارو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے بتاؤ کہ مشہدی نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”میں نے کہا نا کہ اس سے ایک بزنس ڈیل......“ میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے اس کے منہ پر اس سے بھی زبردست زناٹے دار تھپڑ مارا جیسا اس نے مجھے مارا تھا۔ میں اس معاملے میں ادھار رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

”اب تو نے بکواس کی تو میں واقعی تجھے ذبح کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ اتنا بڑا دہشت گرد ہے، یہ صرف ایک ریوالور پر تو اکتفا نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اس کی پنڈلیوں کے ساتھ بھی کوئی ہتھیار بندھا ہوا ہو۔

میں نے اس کی پنڈلیاں ٹٹولیں تو مجھے اپنا اندازہ درست ثابت ہونے پر خوشی ہوئی۔ اس کی ایک پنڈلی کے ساتھ ایک دو دھاری خنجر اور دوسری پنڈلی کے ساتھ ریوالور بندھا ہوا ملا۔ اگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اب تک مجھے ختم کر چکا ہوتا۔

میں نے وہ دونوں چیزیں اپنے قبضے میں کر لیں، پھر میں نے بہت تیزی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک سیل فون اور والٹ برآمد ہوا۔ میں نے وہ دونوں چیزیں اپنی کوٹ کی جیب میں رکھ لیں، پھر میری نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے چمڑے کے ایک انتہائی بیش قیمت بریف کیس پر پڑی۔ میں نے اسے کھولا تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ گویا جیک نے بریف کیس کو لاک کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا یا پھر وہ بھول گیا تھا کیوں کہ بریف کیس میں اس کو فائلوں کے علاوہ ڈالرز کی کچھ گڈیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس کا ریوالور اور وہ خنجر بھی اس بریف کیس میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ”کھٹ...... کھٹ کھٹ...... کھٹ!“

میں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

ہاشم اندر داخل ہوا اور وہ مجھ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دو آدمی ہاشم کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خوف ناک اور جدید قسم کے جرمن ریوالور تھے۔

میں میں ہاشم سے ٹکرا کر پیچھے کی طرف گرا لیکن سائلنسر والا ریوالور اور جیک کا بریف کیس ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ ”تم دونوں نے ہلکی سی بھی جنبش کی تو وہ اپنی جان سے جائے گا۔“ ان میں سے ایک غرا کر بولا۔

☆......☆......☆

یہ پرتجسس، سنسنی خیز اور لرزہ خیز آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ”سچی کہانیاں“ میں ملاحظہ فرمائیں

سات سمندر پار سے، زندگی کی تصویریں

پہلی بدیسی کہانی

چاند

لیلا بعل بکی

لبنان کی مسموم فضاؤں سے دو پھولوں کی کہانی

وہ تیسرے پھول کی آمد سے لرزاں تھے

آنکھیں بند کرنے کے باوجود اپنے اردگرد کی ہر شے دیکھ سکتی ہوں، لمبا سوفا، جو دائیں دیوار کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے، بائیں جانب ایک چھوٹی میز، قالین اور گاؤ تکیے، سفید ٹائلوں کے فرش پر ایک کونے میں لیمپ، یہاں تک کہ کھڑکیاں بھی، جن پر پردے نہیں ہیں۔ دوسرے کمرے میں ایک چوڑا صوفہ، شیشے کی سطح والی میز، دیوار میں نصب بڑی الماری، مخملی کرسیاں، ہر شے میری نظر کے سامنے ہے۔ شادی کے بعد سے اب تک ہم نے اپنے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مجھے یہ ساری چیزیں یوں ہی اچھی لگتی ہیں۔ اچانک میں نے اپنے شوہر کو گنگناتے سنا اور مجھے محسوس ہوا جیسے صبح بیدار ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت پورے شہر میں صرف ہم دو جاگ رہے ہیں۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں نیم وا کیں تو اُسے کھڑکی کے پاس کھڑا پایا۔ جہاں صبح کی ملگجی روشنی اُس کے چہرے اور برہنہ چھاتی پر چاند بکھیر رہی تھی۔ مجھے اُس کی چھاتی سے پھیلتی ہوئی روشنی اچھی لگی۔ میں نے آنکھیں دوبارہ بند کرلیں، تاکہ یہ سارا منظر اپنی باطنی آنکھوں میں محفوظ کرسکوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میری آنکھیں کھلی ہوں یا بند، اُس کا پورا سراپا میری نظروں کے سامنے رہتا ہے۔

اُس کی چوڑی چھاتی، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، گلے پر اُبھری نسیں، ہر بار اُس کا سراپا ایک نئے وجود کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

میں نے اُسے آواز دی کہ وہ واپس آجائے، تاکہ میں اُس کی گہری آنکھیں چوم سکوں، مگر اُس نے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کی...... میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے دور اس لیے کھڑا ہے، تاکہ کوئی اہم بات کہنے کے لیے خود کو تیار کرسکے۔ ایسے موقع پر وہ بہت ضدی اور ظالم لگتا ہے۔ میں اُس وقت سپردگی کے عالم میں تھی۔ اُس سے بات کرنے، یا اُس کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اُس کا ہاتھ پکڑلوں اور اُسے ادھر کھینچ لاؤں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور تکیہ دور پھینک دیا، جو اَب تک میرے بازوؤں میں دبا ہوا تھا۔ میں نے قریب کی کرسی پر پڑی اُس کی قمیص اُٹھائی اور اپنی چھاتی پر پھیلادی، پھر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا، ”کیا تمہیں سمندر نظر آرہا ہے؟“

”ہاں...... ایک طرف گہرا نیلا اور دوسری طرف مٹیالا سفید......“ اُس نے باہر کے منظر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

”کیا سرو کے درخت اب بھی اپنی جگہ پر ہیں؟“

”ہاں، اب بھی وہیں ہیں...... اُن گھروں کے درمیان جو آپس میں ملے ہوئے ہیں...... جن کی چھتوں پر پانی کھڑا ہے۔“

”مجھے سرو کے اُن درختوں کی نسبت ناریل کا وہ درخت زیادہ اچھا لگتا ہے جو سمندر کے کنارے اکیلا کھڑا ہے۔ یہ سرو کے درخت تو مجھے قبروں کی طرح لگتے ہیں، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے...... بے معنی سے۔“

وہ کچھ نہیں بولا، بے حرکت کھڑا رہا، پھر کہنے لگا، ”مرغ بانگ دے رہے ہیں......“

”پرندوں میں مجھے مرغا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے جلدی سے کہا، ”کیوں کہ اِن میں پرواز کی قوت نہیں ہوتی۔ جب میں چھوٹی تھی تو مرغوں اور مرغیوں کو پکڑ کر چھت پر لے جاتی اور انہیں زور سے ہوا میں اُڑانے کی کوشش کرتی، مگر وہ بڑی بے چارگی سے پَر ہوا میں مارنے کی کوشش کرتے، اور پھر دھڑام سے زمین پر گر جاتے۔“

وہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا، ”سامنے والی کھڑکی سے روشنی آرہی ہے۔“



"ہاں...... مگر شاید پورے شہر میں صرف ہم ہی دو جاگ رہے ہیں۔"

"میں نے رات بہت زیادہ پی لی تھی...... میں......"

میں نے تیزی سے اُس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔ مجھے اُس کی شراب نوشی سے شدید نفرت تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اِس سے زیادہ سننا پسند نہیں کروں گی، چناں چہ اُس نے موضوع بدل دیا۔

"شہر مختلف رنگوں اور مختلف سائز کے پتھروں کا ڈھیر لگتا ہے۔"

"لیکن...... میرے تصور میں شہر پانی کے بلبلوں کی طرح ہے، جو محض ایک پھونک مارنے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمارا گھر...... اکیلا ہمارا گھر...... دونوں کمروں سمیت بادلوں میں لپٹا ہوا...... ہوا میں تیر رہا ہے۔"

"میری زبان خشک ہو رہی ہے۔ مجھے ایک نارنگی کی ضرورت ہے۔"

"حالاں کہ میں اس شہر کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں نہیں رہی۔" میں نے اُس کی بات سنی اَن سنی کر کے گفتگو جاری رکھی، "مجھے اس شہر سے نفرت ہے، اگر میں نے خواب نہ دیکھا ہوتا کہ جس شخص کو میں پسند کرتی ہوں وہ مجھے ضرور اِس شہر سے دور لے جائے گا، تو میں اُداسی اور مایوسی کا شکار ہو کر مر چکی ہوتی۔"

"میرا گلا خشک ہے...... مجھے نارنگی کی ضرورت ہے۔" اُس نے اپنا جملہ دہرایا۔

مجھے یوں لگا جیسے اُس نے میری بات سنی ہی نہ ہو...... میں نے بھی اُسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا، "تمہارے ساتھ رہتے ہوئے مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ زمین اپنے درختوں، پہاڑیوں، ندیوں، سمندروں اور انسانوں سمیت میری نظروں سے اوجھل ہے، اور تم ہر شے پر محیط ہو، مگر تمہیں تو انتظار کی تاب بھی نہیں۔"

"آخر تم بچہ پیدا کرنے سے انکاری کیوں ہو؟"

میں یک دم اُداس ہو گئی...... مجھے یوں لگا جیسے اُس نے پوری قوت سے میرا دل دبوچ لیا ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، لیکن میں نے انہیں گرنے نہیں دیا اور اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ایک وقفے کے بعد اُس کی آواز سنائی دی، "ہماری شادی کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

میں خاموش رہی، مگر خیالوں میں اُس کا پیچھا کرتی رہی۔

"ہماری شادی کو ایک مدت گزر چکی ہے...... لیکن تم ہو کہ تخلیق سے مسلسل انکار کر رہی ہو، حالاں کہ شادی سے قبل تمہیں جنون کی حد تک بچوں سے پیار تھا۔"

وہ لڑکھڑایا...... اور صوفے پر ہاتھ رکھ کر چیخا، "اے کرسی! کیا تجھے اِس کے وعدے یاد نہیں، اے لیمپ! کیا تو اِس کی سسکیاں بھول چکا ہے، اور اے تکیے! کیا تو بھی بھول گیا ہے کہ یہ تجھے بچہ بنا کر بانہوں کے جھولے میں لوریاں سنایا کرتی اور طویل تنہا راتیں گزار دیا کرتی تھی۔ تم بولتے کیوں نہیں...... اے بے جانو، بولو! اِسے اِس کی زبان لوٹا دو۔ جو تم بے جانوں میں گم ہو گئی ہے۔"

"بے جان چیزیں نہ بول سکتی ہیں اور نہ محسوس کر سکتی ہیں۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے کہ یہ بے جان ہیں، مردہ ہیں؟" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

"چیزیں اُس وقت تک بے جان، یا مردہ رہتی ہیں جب تک وہ زندہ لوگوں سے دھڑکنیں نہ حاصل کر لیں......"

اُس نے درمیان ہی سے میری بات کاٹ دی۔

"میں...... تمہیں اِن بحثوں میں الجھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ نہ ہو ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی تم اصل مسئلے سے فرار حاصل نہ کر لو۔"

میں نے خالی ذہن سے وضاحت کرنی چاہی۔

"میرے گھر میں پڑی ہوئی یہ چیزیں باہر کی دنیا کا عکس ہیں۔ گھر، درخت، آسمان، سورج، ستارے اور بادل، اِن میں میں اپنا ماضی دیکھتی ہوں۔ دکھ اور اُداسی کے لمحوں میں ملاقاتیں اور اُن ملاقاتوں سے حاصل خوشیوں کے وہ لمحات جن سے اب میں آنے والے دنوں کے سپنے جوڑتی ہوں۔"

وہ تلملا اُٹھا۔ ”پھر وہی لاحاصل بحث، میں ابھی اور اِسی وقت تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں کہ آخر تم اولاد سے انکاری کیوں ہو؟“

”سنو...... میں تمہارا یہ لہجہ برداشت نہیں کرسکتی۔“ میں نے بھی اُسی انداز میں جواب دیا، ”کیا تم نے بھی بچے سے انکار نہیں کیا تھا۔“ تھوڑی دیر وہ چپ رہا۔

”میں نے شادی سے پہلے انکار کیا تھا اور تب بچے کی پیدائش احمقانہ فعل تھا۔“

”ہاں......“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا، ”اصل میں تم بچوں اور شہر کے مسخروں سے ڈرتے تھے...... پھر تمہاری کوشش تھی کہ تم اور میں ملتے رہیں۔ اصل میں ہمارے اردگرد جتنے لوگ تھے وہ جسموں سے کھیلنے اور سگریٹ کو دھویں میں بدل دینے کے عمل کو ایک جیسا فعل سمجھتے تھے اور ہماری محبت اُن کے لیے نئی چیز تھی۔ اس لیے وہ ہمارا تمسخر اُڑاتے تھے۔“

”مجھے دوسروں کی پروا نہیں تھی۔“ وہ بڑبڑایا، ”دراصل میں ایک اور عورت کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔“

”میں یہ صورت حال کس طرح برداشت کرسکتی تھی، میرے دل میں تمہارے لیے بے انتہا محبت تھی اور میں اِس جھوٹے سچ کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھی کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہ میرا نہیں ہے۔“

”اصل میں اُس صورتِ حال سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ میں پتھر دل نہیں تھا کہ جس کے ساتھ میں نے زندگی کے نو سال گزارے تھے، اُس کے روبہ رو کہہ دیتا کہ اب قصہ ختم ہوا اور منہ موڑ کر چلا آتا......“

”دیکھو......“ میں نے اپنا داہنا ہاتھ اُس کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اب بھی میرا سرخ اور گرم لہو فرش کو سرخ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟“

”تم پاگل ہو......“ وہ بڑبڑایا۔

”ہاں میں پاگل تھی، جب مجھے احساس ہوا کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہ میرا نہیں...... تو......“

”مجھے اب بھی یاد ہے کہ جب میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا تو تمہیں اِسی صوفے پر لیٹے ہوئے دیکھا...... تمہارے داہنے ہاتھ کی نسیں کٹی ہوئی اور انگلیاں خون میں لت پت تھیں...... تم جنونی ہو...... میں تو تمہیں تقریباً کھو چکا تھا......“

میں اُداس اُداس مسکرادی اور اُس کی قمیص اپنے سینے کے ساتھ چمٹالی، جیسے اُس کا لمس جسم میں اُتار رہی ہوں۔

”دراصل اُس ڈرامے میں تمہیں میرے اُسی کردار کی ضرورت تھی، میں خود کو راستے سے ہٹا رہی تھی۔ ایک دم موت کو گلے لگانا چاہتی تھی۔ فلم ”مدور“ کے بچھوے کی طرح نہیں، جو ندی کے کنارے کی تلاش کرتا صحرا کی گرم ریت میں راستہ بھول کر رفتہ رفتہ مرتا رہا تھا۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرے معاملے میں اِس حد تک سنجیدہ ہو......“

”کیا اس یقین کے لیے کہ میں تم سے حقیقی محبت کرتی ہوں، تمہیں میری موت کا انتظار تھا۔ میں نے خود کو تمہاری محبت میں گم کردیا تھا۔ میں نے بے خبر لوگوں کی طرح انگلیاں اور چہرہ جلاتے ہوئے بھنورے کی طرح کلیاں پار کرلی تھیں۔ مجھے تو جسموں کے بوجھ، عمارتوں کی بلندی اور تمہارے ہاتھوں کے لمس کے علاوہ کسی دوسری بات کا احساس بھی نہیں تھا۔“

میں نے اُسے آواز دی کہ وہ میرے قریب آجائے، مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ یک دم چیخ پڑا...... اور جو کچھ کہتا رہا، اُس کا مقصد اِس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ میں اولاد اس لیے پیدا نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے اُس سے محبت نہیں۔

”تم مجھ پر یہ الزام عائد نہیں کرسکتے۔“ میں نے چیخ کر ہی جواب دیا، ”تم اپنے دل کی بات مجھ پر تھوپنا چاہتے ہو۔ ابھی کل رات کی بات ہے کہ میں تمہارے برابر لیٹی تھی۔ تم نے جلد ہی خود کو گہری نیند کے حوالے کردیا، لیکن میں تھکی تھکی آنکھوں کے ساتھ جاگ کر پل پل گزار رہی تھی۔ میں نے جب جگا کر تم سے کہا، میں اکیلی جاگ رہی ہوں تو تم نے نہایت اکھڑے لہجے میں جواب دیا تھا کہ تمہیں کوئی ایسی رات یاد نہیں جو میں نے جاگ کر گزاری ہو۔ تمہیں یقین تھا کہ تمہارے سوجانے کے بعد میں بھی سوجاتی ہوں۔“

میرے اندر جیسے نفرت کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ میں

نے اُسے گزشتہ رات کی تفصیل بتائی، میں نے کہا کہ یہ پہلی بار تھا کہ تم نے مجھے اس طرح اپنے برابر اکیلے اور ویران چھوڑ دیا۔

پھر میں نے جان بوجھ کر اُسے تمام تفصیل بتائی کہ کس طرح وہ تمام رات خراٹے لیتا رہا، جب کہ میں چپ چاپ اُس کے برابر لیٹی سگریٹ پھونکتی رہی تھی۔ کمرے کی پراسرار خاموشی میں دھویں کی ایک دیوار کھڑی تھی۔ رات کے کسی پہر میں نے ایک پاؤں سفید چادر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، میں نے اُسے حرکت دینی چاہی، لیکن میں اُسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکی۔ میرے اندر سردی اور خوف کی ایک لہر دوڑتی چلی گئی۔ میں نے پاؤں کو ہلانے کی پھر کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ میں نے چیخنا چاہا، میری آواز گلے ہی میں دب کر رہ گئی...... ”میں چپ چاپ روتی رہی، تمہاری بے حسی پر، پھر تمہارے وجود میں حرکت ہوئی اور تم نے پاؤں سمیٹ کر چادر میں کرلیا۔ میں تمہارا پاؤں اور اپنا پاؤں پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہا، پھر آہستگی سے بولا، ”اس دور میں محبت کی خاطر کوئی نہیں مرتا۔“

”اس دور میں لوگ بچے بھی نہیں جنتے......“ میں نے موقع پا کر براہِ راست حملہ کیا۔ ”شاید اس لیے کہ تمہارے بہ قول، لوگوں نے دوسروں کی خاطر مرنا چھوڑ دیا ہے......“ میں چند لمحے خاموش رہ کر پھر بولی، ”پہلے زمانے میں لوگ جانتے تھے کہ اُن کا بچہ کہاں پیدا ہوتا ہے، اُس کا ناک نقشہ کیسا اور کس پر ہوگا۔ بیٹی ہوگی یا بیٹا...... مائیں اور دادیاں بہت پہلے سے گرم سوئٹر، مفلر بنا شروع کردیتی تھیں۔ اُن پر پرندوں اور پھولوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ اُس کے گلے میں سونے کا تعویذ، یا صلیب ڈالنے کی پہلے سے تیاری کرلی جاتی، جس پر کندہ ہوتا کہ ”اللہ تمہارا نگہبان ہو“ اُس کمرے کا انتظام کیا جاتا جہاں بچے کو گھپ اندھیروں سے نکل کر تیز روشنی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اُس کے اسکول کا پہلے سے انتخاب کرلیا جاتا۔ اُس کے لیے مضامین منتخب کرلیے جاتے، اُس کی پیدائش ہی سے اُس کی دلہن، یا دولہا کی تلاش شروع کردی جاتی، تاکہ اُسے ایسا شریکِ حیات ملے جس کے ساتھ وہ آسودہ زندگی گزار سکے۔ ایسا بہت پہلے تمہارے اور میرے والدین تک ہوتا تھا۔ کیا تم اُن کی طرح اپنی اولاد کو وقت دے سکتے ہو؟“

”تمہارے خیال میں بیس برسوں میں ایک پورا دور، پوری تہذیب یا پورا تمدن بدل جاتا ہے۔ کیا ہم یہ سب کچھ نہیں کرسکتے؟“ اُس نے آخری جملہ طنزیہ لہجے میں کہا، لیکن میں نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ”شادی سے پہلے میری حالت اُس معصوم بچے کی مانند تھی جو چیت لیٹا کھڑکی سے باہر آسمان پر پھیلے ستاروں کو دیکھتا اور انہیں حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے اور بے تابانہ اُس کی طرف اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ بڑھاتا ہے...... میں بھی یہ سپنے...... حقیقت میں نہ بدلنے والے سپنے دیکھ کر خوش ہوئی تھی کہ ایک دن یہ ضرور تعبیر پالیں گے۔“

”تو کیا تم اُس وقت مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔“

مجھے یوں لگا جیسے اُس نے بازی جیتنے کے لیے بات کا رُخ بدل کر مجھ پر آخری حملہ کرنے کی تیاری کرلی ہے۔ میں نے اپنا دفاع کیا۔ ”وہ عورت...... فقط وہ عورت جو اپنے خاوند سے مطمئن نہ ہو، فوراً بچے کی پیدائش کی خواہش کرتی ہے، تاکہ وہ بچے کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر اپنے لیے ایک الگ دنیا آباد کرسکے۔“

”جب تم بچے کی خواہش کرتی تھیں تو کیا مجھ سے مطمئن نہیں تھیں۔“

”اُس وقت ہم دونوں گھبرائے ہوئے تھے۔ اُن جان اور دل چسپ راستوں پر ہم نے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ ایک خوف تھا، جو میرے چاروں طرف پھیلا تھا۔ ہم ہر لمحے اجنبی چیزوں سے ٹکراتے تھے۔ تمہارے لیے میں نے موت سے بھی مقابلہ کیا...... تاکہ تمہارے ساتھ جی سکوں...... تم غلطی پر ہو، جو میرے پیار پر شک کرتے ہو......“

”مجھے افسوس ہے...... میں نے تمہاری بات سمجھنے میں غلطی کی۔“

”ہاں...... تمہاری منفی سوچوں کی بنیاد اسی ناسمجھی پر ہے، اگر میں نے تمہیں حقائق بتا بھی دیے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بچہ پیدا کرنے پر آمادہ ہوں۔ میں

یہ غلطی نہیں کروں گی، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ تم میری یہ بات بھی نہیں سمجھ سکو گے۔"

"غلطی......!غلطی......!حرام......!" وہ پھر چیخا۔

میں نے اُس کی قمیص اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی، تا کہ توانائی حاصل کرسکوں، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی، "میں آگ اور بارود کے اِس عہد میں اپنے بچّے کے مقدر کے بارے میں خوف زدہ ہوں۔ جس دنیا میں ہم اُسے لانا چاہتے ہیں وہاں گولوں کی آوازیں، میزائلوں کے دھماکے اور سڑکوں پر بہتے ہوئے سرخ خون کے سوا اور کیا ہے......تم سوچ سکتے ہو، جس بچّے کو میں اپنی کوکھ سے جنم دوں، اپنے لہو سے سینچوں، اپنی خوراک میں حصّے دار بناؤں، اُسے اپنا ناک نقشہ عطا کروں اور جب وہ پاؤں چلنا سیکھے تو اُس کی ناک میں بارود کی بو اور اُس کے کانوں میں میزائلوں کا شور بھر جائے، یا پھر وہ ایک روز راکٹ میں سوار ہوکر چاند کے سفر پر چل نکلے۔ کون جانے وہ چاند پر جا کر بھی خوش رہ سکے گا، یا نہیں؟

"تم میری بات نہیں سمجھ سکتے۔ میں جب تصور کرتی ہوں کہ میرا بیٹا جوان ہوکر سفید وردی میں ملبوس راکٹ کے کاک پٹ میں بیٹھ کر، تین بار بٹن دبا کر ایک تیز آواز کے ساتھ فضا کی بلندیوں میں گم ہو رہا ہے تو میرے چاروں طرف بگولے پھیل جاتے ہیں...... نہیں...... نہیں......میں یہ دُکھ نہیں سہ سکتی......نہیں سہ سکتی۔"

کچھ دیر وہ خاموش رہا، فضا پر سکوت کا عالم تھا۔ صبح کا اُجالا آہستہ آہستہ اُس کی چھاتی سے تیرتا ہوا، سرک کر فرش پر پھسلنے لگا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبے سے خالی تھا اور خالی خالی نظروں سے فضا میں یوں گھور رہا تھا جیسے اُسے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی تلاش ہو۔ میں بھی خاموش تھی، پھر اچانک میں نے اُسے فضا میں راکٹ چھوڑنے والے مینار کی طرح اپنے قریب کھڑے پایا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، "مجھے تم سے پیار ہے۔ مجھے تمہاری اس برہنہ چوڑی چھاتی سے پیار ہے۔ جب تم کوٹ اور ٹائی پہنتے ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے تم کوئی اجنبی ہو۔ مجھے تم سے پیار ہے......"

میں دیوانگی کے عالم میں تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے۔ میں نے انہیں مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم صدف ہو......تم صدف ہو......"

اُس کے چہرے پر تازگی اور آنکھوں میں زندگی تھی۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھوں کو پوری قوت سے دباتے ہوئے کہا، "آؤ...... چاند پر چلیں...... ہم دونوں......تم اور میں......"

☆......☆

دوسری بدیسی کہانی

زیردست

عبدالغفار چوہدری

تحریر بنگال، بنگال سے ہمارے آقاؤں کی ایک داستان

ایک غلام، گل اندام سانولی کی کہانی

1942ء کی تحریک کا آخری دور تھا، اُسی زمانے میں فرگوسن ہمارے ضلع میں فرسٹ کلاس مجسٹریٹ بن کر آیا۔ وہ آئی سی ایس تھا اور ایک سخت گیر قسم کا انگریز افسر تھا، لیکن اُس کے ساتھ نہ کوئی نیم عریاں میم آئی تھی، نہ وہ کتے لایا تھا۔ اِس پر مجھے بہت حیرت تھی۔

ایک دن فرگوسن نے مجھ سے کہا کہ ''کیلف! اس جنگ میں فتح ہماری ہوگی لیکن اس فتح کو ہم فتح نہیں کہہ سکتے۔ جنگ کے بعد ہمیں اپنی 65 فیصد خواتین امریکنوں یا ہندوستانیوں کے حوالے کرنی پڑیں گی، فرانسیسیوں کے سپرد بھی کی جا سکتی ہیں، مگر جنگ نے فرانسیسیوں کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔''

نہ جانے فرگوسن کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا نام خلیفہ احمد ہے اور میں ایک خاندانی درزی ہوں۔ اُن دنوں میں اُس کے دفتر میں پیش کار تھا۔ پیش کار مجسٹریٹ کا ماتحت ہوتا ہے، لیکن وہ میرے ساتھ دوستانہ سلوک رکھتا تھا۔ ایک دن ہمت کر کے میں نے اُسے بتا دیا کہ ''سر! میرا نام کیلف نہیں، خلیفہ ہے۔''

اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''تم کس نام سے پکارے جانے پر خوش ہوتے ہو، کیلف یا خلیفہ؟''

''خلیفہ سر!'' میں نے مؤدبانہ جواب دیا۔

وہ چند لمحوں تک عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ''جانتے ہو، ہم لوگوں میں سب سے بڑا عیب کیا ہے؟ ہم لوگ غیر زبانوں کے نام بھی صحیح تلفظ سے ادا نہیں کر سکتے، خلیفہ کو کیلف اور کلکتے کو کیلکٹا کہتے ہیں، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ تم لوگ بھی یہ بگڑا ہوا روپ پسند کرتے ہو۔ خیر، اب میں تمہیں تمہارے اصل نام سے پکارا کروں گا۔''

دو ہی دن بعد ایک اور مشکل آ پڑی۔ فرگوسن کے خاص اردلی کا نام برکت تھا۔ اُس نے برکت کو کنگ بابر کہنا شروع کر دیا، اِس پر دفتر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ نظارت کے اوم بابو سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لے چکے تھے، انہوں نے ایک دن دفتر والوں کو اپنے پاس بلایا۔ ''تم لوگ اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہو؟ یہ بدمعاش فرگوسن اب ہمارے بادشاہوں کا مذاق اڑانے لگا ہے، معمولی اردلی کو کنگ بابر کہہ کے ہمیں ذلیل کرتا ہے۔''

''کیا کہا؟ ہمیں ذلیل کرتا ہے؟'' کئی آوازیں اُبھریں۔

''اور نہیں تو کیا؟ ہم میں کوئی ایسا ہے جو اُس کے

سامنے کسی نوکر کو کنگ جارج کہہ کر پکار سکے؟ کیا فرگوسن یہ بات برداشت کر سکتا ہے؟"

"تو ہم بھی برداشت نہیں کریں گے ادم بابو!" تقریباً سبھی بولے۔

"میں بتاتا ہوں، تم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے۔" ادم بابو نے کمر کرسی سے نکالی۔ "پہلے چائے پلواؤ۔"

چائے پی کر ادم بابو نے جیب سے ناس کی ڈبیا نکال کے ایک چٹکی ناس اپنے دونوں نتھنوں میں کھینچی، پھر اِدھر اُدھر دیکھ کے آہستہ سے بولے۔ "تم لوگوں کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو وہ آ ہی رہا ہے۔"

"کون آ رہا ہے؟" لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے وہی، ہٹلر اور کون آ سکتا ہے؟" ادم بابو دھیمے سے مسکرائے۔ "سنا ہے، ڈنکرک کے بعد اب اُس کی فوج لندن ہی میں اُترے گی۔" روس کے برف پوش میدانوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی، اس لیے ہم میں سے کسی نے ادم بابو کی بات پر توجہ نہیں دی۔

دوسرے دن میں نے فرگوسن سے بات کی۔ "سر! برکت کو کنگ بابر بولنا مناسب نہیں ہے، اس سے ہماری توہین ہوتی ہے۔"

فرگوسن نے فوراً گھنٹی بجا کر برکت کو بلایا، وہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ فرگوسن نے میز کی دراز سے تاریخ کی ایک کتاب نکالی اور کھول کر میرے سامنے کر دی۔ میرے سامنے شہنشاہ بابر کی تصویر کھلی ہوئی تھی۔ "خلیفہ! تم خود دیکھ لو، کیا ان دونوں کے لباس میں کوئی فرق ہے؟"

میں نے تصویر کی طرف دیکھا پھر برکت کے لباس پر نظر ڈالی۔ واقعی دونوں کے لباس ایک جیسے تھے، وہی ڈھیلا ڈھالا لمبا کوٹ، وہی جبہ، وہی دستار۔ گو فرگوسن نے



نہیں کہا مگر میں نے دیکھا کہ برکت کی داڑھی بھی شہنشاہ بابر کی داڑھی سے ملتی جلتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بابر تاریخ کے صفحات سے نکل کر فرگوسن کے سامنے کھڑا ہو گیا ہو۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“ فرگوسن نے پوچھا۔ میں جو کچھ سوچ رہا تھا، اگر وہ ظاہر کر دیتا تو ممکن ہے، میری ملازمت چلی جاتی اس لیے خاموش رہا۔ ”خلیفہ! کیا سوچ رہے ہو؟“ اُس نے پھر پوچھا۔ ”سچ سچ بتا دو۔ اِس وقت میں تمہارا افسر نہیں، دوست ہوں، سچا دوست۔“

”چپراسیوں پر یہ وردی بھی تو آپ ہی نے سجائی ہے۔“ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”ہاں، لیکن کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟“ اُس کی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک لہرائی، اُس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ ”یہ سب کچھ تمہیں ذلیل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔“ وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”یہ تمہارے شان دار ماضی اور تمہارے بہادر بادشاہوں کا مذاق اُڑانے کے لیے کیا گیا ہے۔ تمہیں دنیا بھر کے علاوہ خود تمہاری نظروں سے گرانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ وہ چند لمحے میری طرف گھورتا رہا۔ ”اگر ایسی حرکت ہمارے ملک میں کی جاتی تو خون کی ندیاں بہہ جاتیں مگر تم لوگ؟ بالکل پالتو کتوں کی طرح ہو۔ کتے کو بھی غصہ آ جاتا ہے، وہ بھی بعض دفعہ غرّاتا ہے اور دانت نکالتا ہے مگر تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ ڈیڑھ سو سال سے انگریز تمہارے چپراسیوں کو بادشاہوں کی وردی پہنا رہا ہے، مگر تمہاری توہین نہیں ہوئی۔ اب برکت کو بابر کہنے سے تمہاری توہین ہو گئی۔ خوب جواب نہیں ہے تم لوگوں کا۔“

میں چپکے سے اُٹھ کر آ گیا۔ فرگوسن سے پہلے اتنی باتیں کبھی نہیں ہوئی تھیں، میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو گیا ہو۔ نیا ہونے کی وجہ سے اُس نے اب تک اپنا اصلی چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن آج میں نے دوستی کے نقاب میں اُس کی مکروہ صورت دیکھ لی تھی۔ فرگوسن سے پہلے ڈنکن سینڈی مجسٹریٹ تھا، وہ بڑی بڑی خوف ناک مونچھوں والا خوں خوار انگریز تھا، پورا دفتر اُس سے کانپتا تھا، مگر فرگوسن نے اپنی نرمی سے سب کا خوف زائل کر دیا تھا، وہ افسری بھول کر سب کا دوست بن گیا تھا، اسی لیے میں بھی بے خوف ہو کر اُس سے اتنی باتیں کرنے لگا تھا، لیکن آج مجھے پتا چل گیا تھا کہ ڈر دور کرنے کے باوجود دوڑانا انگریز کی فطرت ہے، لیکن دوسری ہی شام نہ صرف میرا خوف دور ہو گیا بلکہ مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا۔ فرگوسن نے مجھے اپنے بنگلے بلوایا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ چائے کے برتن اور سگریٹ کے ڈبوں میں گھرا ہوا بید کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ”لو، چائے پیو۔“ اُس نے خود دودھ اور شکر ملا کے کپ میری طرف بڑھایا اور اُٹھ کر گراموفون بجا دیا۔ ”تم بیٹھ کر میوزک سنو، میں آتا ہوں۔“ وہ اندر چلا گیا۔

کھڑکی سے شام کا پہلا ستارہ جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔ دریائے برہم پترا کے پانی میں ٹھیراؤ تھا، موسیقی سے یوں لگا جیسے برہم پترا انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہو۔ ”میوزک کیسا ہے؟“ میں فرگوسن کی آواز سن کر خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔

”انگریزی میوزک ہے سر! اس لیے میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

اندھیرے میں فرگوسن کا پائپ چمکا۔ ”جانتے ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”صرف یہ جاننے کے لیے کہ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟“

”نہیں سر!“

”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اِس وقت ہم دونوں افسر اور ماتحت نہیں، صرف دوست ہیں۔ لو، سگریٹ پیو۔“ ریکارڈ ختم ہو گیا تو وہ میرے سامنے آ بیٹھا۔ ”ہاں، تم ایک بار کتوں اور میم صاحب کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟“

مجھے اپنی بات یاد آ گئی۔ ”میں یہ کہہ رہا تھا سر کہ آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے، اس لیے آپ کے ساتھ میم صاحبہ نہیں آئیں اور میم صاحبہ نہیں آئیں، اِس لیے کتے بھی نہیں آئے۔“

”انگریزوں کو پہلے اپنی جانیں تو بچا لینے دو خلیفہ!“ وہ ہنسا۔ ”اگر میں جنگ سے پہلے آتا تو میم بھی لاتا اور کتے بھی بلکہ اپنے ساتھ شراب کی پیٹیاں بھی لاتا

اور وہ تمام شراب تمہارے ہی پیسے سے خریدی ہوئی ہوتی۔ تمہاری عمر کے انگریز یہاں جج اور مجسٹریٹ بن کر آتے ہیں، مگر تم لوگ کلرکی سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اس کا سبب معلوم ہے؟"

"لٹیروں نے سب کچھ لوٹ لیا ہے سر!" میں نے حوصلے سے کام لیا۔ "اب ہمارے لیے بابوگیری کے سوا کیا چارہ ہے۔"

"لٹیرے؟ کیا مطلب؟ ہم لوگ لٹیرے ہیں؟" اُس کا پارا چڑھ گیا۔ وہ غصّے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں سہم گیا۔ "کلائیو کے زمانے میں مرشد آباد، لندن سے زیادہ بارونق اور مال دار شہر تھا۔" میں نے بات گھمائی۔ "لیکن صرف ڈیڑھ سو سال میں کیا حال ہو گیا ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں تو پورے ملک کی حالت آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

عجیب شخص تھا وہ، ناراض ہونے کے بجائے ہنس پڑا۔ تاریخ کی غلط توضیح مت کرو خلیفہ! تہذیب ہمیشہ جنگ و جدل اور لوٹ مار کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ تم ہمیں لٹیرا کہہ رہے ہو؟ یہ بھول گئے کہ خود تم نے سومنات کا مندر سترہ بار لوٹا تھا؟" وہ لاکھ میرا دوست سہی مگر تھا تو ایک انگریز افسر، افسر سے میں کیسے بحث کر سکتا تھا۔

فرگوسن نے پائپ بھر کر سلگایا اور کمرے میں دھواں اُگل دیا۔ "صرف کسی قوم کے لیے نہیں، ہر فرد کے لیے تہذیب کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے، خود کو زندہ رکھنا اور ترقی کرنا۔ تہذیب اسی طرح پھلتی پھولتی ہے، تمہاری حفاظت کے لیے دنیا میں کتنی جانیں ضائع ہو رہی ہیں، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟"

پھر وہ تاریخ سے ہٹ کر ذاتی بحث کرنے لگا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اجازت لے کر اُٹھ جاؤں۔ برہم پترا کے سینے پر اندھیرا پھیل چکا تھا، پانی میں کنارے کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ معاً فرگوسن اُٹھ کر میرے قریب آ گیا اور بے تکلفی سے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "تمہاری شادی ہو گئی خلیفہ؟"

"جی ہاں سر!"

"کتنے بچے ہیں؟"

"پانچ۔"

"اُف۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"تیس سال۔"

"مسز خلیفہ کیسی ہیں؟"

"اُس کی صحت اچھی نہیں رہتی سر! ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔"

"تم لوگ نہ خود زندہ رہنا چاہتے ہو، نہ کسی اور کو زندہ رکھنا چاہتے ہو۔ دراصل تم لوگ موت کے تمنائی ہو، زندگی تمہیں اپنی طرف بلا کر بھی کیا کرے؟ اچھا، سچ بتاؤ۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "شادی سے پہلے تم نے کسی لڑکی سے آنکھ لڑائی تھی؟"

"جی نہیں۔" میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔

"تمہارے ہاں زندگی کا رنگ کتنا انوکھا ہے۔ لطف اٹھانا تو دور کی بات ہے، تم نے تو زندگی کو قریب سے دیکھا تک نہیں۔ صرف عورتوں میں نہیں، زندگی میں ہر جگہ کتنے سارے رنگ، کتنی ساری رعنائیاں ہیں پھر بھی تم لوگ یہ سب کچھ چھوڑ کر نہ جانے کس چیز کی تلاش میں لگے رہتے ہو۔ آخر تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ کل دفتر میں ادم بابو سے کہوں گا، اِس نوجوان مجسٹریٹ کے دماغ کا کوئی پُرزہ ڈھیلا ہے۔ یہ دور دیس سے آیا ہے، یہاں نہ اِس کا ماحول ہے، نہ بیوی بچّے ہیں، دماغ خراب نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔

"رنگوں کی کتنی قسمیں ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ "جانتے ہو؟ کبھی دیکھا ہے؟ میرا رنگ سفید ہے، تمہارا گندمی۔ زرد، سرمئی اور کالے رنگ بھی ہوتے ہیں۔ بے شمار رنگ ہیں۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔ ممکن ہے، یہی بات ہو۔ میں دوسرے انگریزوں سے نہیں ملتا اور کلب بھی نہیں جاتا، لیکن اپنے پیش کار کو دوست بنا کر الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ یہ پاگل پن نہیں تو کیا ہے لیکن تمہی بتاؤ، جس کی آنکھوں میں اَن گنت رنگ لہرا رہے ہوں، وہ صرف ایک رنگ پر کیسے اکتفا کر سکتا ہے۔ اِس ملک میں کیسے کیسے رنگ بکھرے پڑے ہیں۔ جب سورج ڈوبتا ہے تو اُس کی سرخی کے گرد چھائی ہوئی سیاہی پھر سرخی میں گھلتی اور بدلتی دیکھی ہے تم نے؟"

کمرے میں ایک ساتھ تین بلب جل اُٹھے۔ روشنی نے اندھیرا ہڑپ کرلیا۔ میری نظریں ایک سیاہ وجود پر جا کے ٹھہر گئیں۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ جست کی کوئی مورتی ہے لیکن اُسے حرکت کرتے دیکھ کر میری غلط فہمی دور ہوگئی۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک کالی لڑکی تھی۔

''اُلفتی!'' فرگوسن نے اُسے آواز دی۔ وہ فرگوسن کی نوکرانی تھی۔

''جی حجور!'' نوکرانی نے جواب دیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے فرگوسن رنگوں کا کھیل کھیل رہا ہو۔ لڑکی کے گٹھے ہوئے سیاہ جسم پر روشنی کی لہریں پھسل رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں بجلی کی روشنی مجھے اتنی تیز کیوں نظر آئی تھی۔ اُلفتی سرخ ریشمی ساڑی پہنے ہوئے تھی، بے آستین بلاؤز میں اُس کے سڈول اور دل کش بازو جھول رہے تھے۔ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے جوڑے میں سرخ پھول گندھے تھے۔ میری نظریں اُس کے جسم کے مختلف حصوں پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے سینڈی صاحب کی کوٹھی پر اُنہی کی ہم وطن خادمہ کو بھی دیکھا تھا، مگر الفتی کی بات ہی دوسری معلوم ہو رہی تھی۔

''اچھا خلیفہ! اب تم جاؤ۔'' فرگوسن بولا۔ ''میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔'' وہ اُلفتی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں اُٹھ گیا۔

بنگلے سے نکل کر سڑک پر چلتے ہوئے میں نے سوچا، سورج ڈوبتے وقت سرخی اور سیاہی کے میل سے جو رنگ بنتا ہے، کیا وہ بھی اُلفتی کی طرح حسین اور رنگین ہوتا ہے؟

چند روز بعد اوم بابو نے ایک حیرت انگیز خبر سنائی۔

''کنگ بابر نے فقیری لے لی، دنیا تیاگ دی۔''

''پہیلی نہ بجھوایئے اوم بابو! اصل بات بتایئے۔'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''افریقہ کے محاذ پر رومیل کی فوج پیچھے ہٹ رہی ہے۔'' موہن نے چٹکی لی۔ ''اس لیے اِن دنوں ہٹلر بہت مصروف ہے، وہ اوم بابو کے پاس تازہ خبر نہیں بھیج سکا ہے۔''

''جنگ کی باتیں رہنے دو موہن!'' میں نے اُسے ٹوکا پھر اوم بابو سے کہا۔ ''کنگ بابر کی بات بتایئے آپ؟''

''بات اتنی سی ہے کہ برکت نے نوکری چھوڑ دی۔''

''کیوں؟ کیوں؟''

''اس لیے کہ اُس کی جورو نے اُسے چھوڑ دیا۔''

''چھوڑ دیا؟''

''ہاں، اور اصل بات جاننا چاہو تو یہ سمجھ لو کہ وہ فرگوسن کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔''

میرے تصور میں اُلفتی کا سڈول جسم اور بے داغ چہرہ ابھر آیا۔ ''تو گویا اُلفتی برکت کی بیوی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''حیرت ہے۔''

''ہاں، اُس کی بیوی ہے۔ فرگوسن نے برکت سے کہا تھا۔''

اوم بابو بتا رہے تھے۔ ''کہ وہ ایک نوکرانی تلاش کرلائے۔ برکت کے دل میں لالچ آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کی بیوی ہی نوکری کرلے تو کیا ہرج ہے، آمدنی بڑھ جائے گی۔ اسی لالچ کا پھل ہے یہ۔''

''تو......تو۔'' میں متذبذب سا بولا۔ ''کیا اتنی سی بات پر نوکری چھوڑ دینا کوئی عقل مندی ہے؟''

اوم بابو نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم نے محبت کی شادی کی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے پلکیں جھپکائیں۔

''تو پھر زیادہ سمجھنے کی کوشش مت کرو۔'' انہوں نے ڈانٹ دیا۔

فرگوسن تین چار روز تک عدالت نہیں آیا۔ معلوم ہوا، اُس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ چند ضروری کاغذات پر دستخط لینے کے لیے میں اُس کے بنگلے پہنچا۔ سنتری نے پھاٹک کھولا تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ الفتی ہری ہری گھاس پر جھولے میں بیٹھی گنگنا گنگنا کر پینگیں بڑھا رہی تھی۔ وہ ڈھاکے کی سفید جامدانی ساڑی پہنے ہوئے تھی، ساڑی پر سیاہ اور سرخ پھول بنے ہوئے تھے۔ اُس کے کھلے ہوئے کالے چمکیلے بال پیٹھ پر لہرا رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی وہ بے تحاشا بھاگی۔ میں بھی اندر پہنچا، یکا یک میں نے فرگوسن کی آواز سنی، وہ الفتی کو بڑے پیار سے مخاطب کر رہا تھا۔

''جانی!'' میں ہال کی طرف بڑھا، شیشے سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اُلفتی فرگوسن کے قریب پہنچ چکی تھی۔

فرگوسن نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اُلفتی سہمی ہوئی آواز میں چیخی۔ ''پیش کار۔'' فرگوسن نے فوراً اُسے چھوڑ دیا، وہ اندر بھاگ گئی۔

فرگوسن نے کھڑے کھڑے کچھ کہے بغیر کاغذات پر دستخط کر دیے، میں چپ چاپ واپس آ گیا۔

بعد میں کتنی ہی بار فرگوسن اور اُلفتی مجھے ساتھ ساتھ نظر آئے۔ کبھی کار میں، کبھی شام کے دھندلکے میں ایک ساتھ جھولا جھولتے ہوئے۔ سارے شہر میں اُن کے چرچے ہونے لگے تھے۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔

ایک دن اطلاع ملی کہ فرگوسن کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ دیناج پور جا رہا ہے۔ چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی، ہم لوگ بہت خوش تھے، کیوں کہ فرگوسن کی جگہ اب ایک بنگالی آئی سی ایس آ رہا تھا۔ فرگوسن کی الوداعی پارٹی کے انتظامات زور شور سے ہونے لگے۔

ایک شام اُس نے مجھے بلوا بھیجا۔ میں اُس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہ آرام کرسی پر دراز مغربی موسیقی سن رہا تھا۔ میں نے اُس کا اشارہ پا کے کرسی گھسیٹی اور اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ مسکرایا۔

''خلیفہ! تم تو بہت خوش ہو گے؟''

''کیوں سر؟''

''اس لیے کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''نہیں سر! آپ کا خیال غلط ہے۔''

''غلط نہیں، بالکل صحیح ہے۔ تم کچھ بھی کہو مگر میں جانتا ہوں کہ تم سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہو ورنہ اُلفتی میرے ساتھ جانے پر تیار کیوں نہیں ہوتی؟''

''اُلفتی؟ وہ کہاں جائے گی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جہاں میں جاؤں گا۔''

''شاید وہ آپ کی عزت کے خیال سے نہ جانا چاہتی ہو۔''

''لعنت ہو ایسی عزت پر۔'' فرگوسن کو غصہ آ گیا۔ ''اصل بات کچھ اور ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایک دن میرا نشہ اُتر جائے گا اور میں شادی کر کے میم لے آؤں گا، پھر اُس کی پوزیشن کیا ہو گی اسی لیے اب وہ اپنے شوہر کے پاس واپس جانا چاہتی ہے۔'' فرگوسن میری صورت تکنے لگا۔ ''جانتے ہو، اُس کا شوہر کون ہے؟ وہی میرا اردلی، برکت۔'' میں نے سوچا کہ آخر اس میں برائی کیا ہے، اُلفتی جاتی ہے تو جائے۔ فرگوسن نے جیسے میرے دل کی بات جان لی، کہنے لگا۔ ''لیکن میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ میرے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی رہی ہے اس لیے اب میں اُسے پستی میں نہیں اُترنے دوں گا، اُس کا پستی میں اُترنا میرے اُترنے کے برابر ہے، برطانوی گورنر یہاں سے جاتے وقت اپنے پالتو گھوڑے کو گولی کا نشانہ کیوں بنا دیتا ہے؟ معلوم ہے؟ خیر، چھوڑو۔ یہ بات تمہارے جاننے کی نہیں ہے۔'' وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ''بس ہو سکے تو اُلفتی کو سمجھا دو، میں نے تمہیں اسی لیے بلوایا ہے۔''

دوسرے دن خبر ملی کہ فرگوسن اپنے سنتری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ سنتری نے پولیس کے سامنے اقبالِ جرم بھی کر لیا۔ اُس نے کہا کہ ہاں، فرگوسن اُسی کی گولی سے ہلاک ہوا ہے مگر اُس نے اُسے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا۔ حادثے کی رات اچانک اس نے اُلفتی کی چیخیں سنیں، وہ دوڑتا ہوا اندر پہنچا، عجیب منظر تھا، فرگوسن کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی اور اُلفتی سامنے کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی، گھبراہٹ میں سنتری کی بندوق چل گئی اور فرگوسن گولی کا نشانہ بن گیا۔

مجھے فرگوسن کی بات یاد آ گئی۔ ''برطانوی گورنر یہاں سے جاتے وقت اپنے پالتو گھوڑے کو گولی کا نشانہ کیوں بنا دیتا ہے؟''

☆......☆

چین کے منگ خاندان کا آخری بادشاہ

25 اپریل 1644ء کو چین کے منگ خاندان کے آخری بادشاہ چنگ چانگ نے خودکشی کر لی، یہ خودکشی اُس شکست کا شاخسانہ تھی جو چنگ چانگ کو شمال سے آنے والے مانچو قبائل کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔ چنگ چانگ کے بعد چین پر مانچو قبیلے کی حکومت ہو گئی جو 1912ء تک رہی۔

مرسلہ: روزینہ محمد۔ گوادر

تیسری بدیسی کہانی

بروا

روبی مارٹن سن

امریکہ عظیم سے دو کھلاڑیوں کی داستان، ایک

میدان میں کھیلتا تھا، دوسرے کا کوئی میدان نہ تھا

میں نے جیسے ہی اُسے دیکھا، چہرے پر کم ظرفوں جیسی بے نیازی طاری کر لی اور پہلی نظر اس طرح ڈالی جیسے ایک بادشاہ اپنے محل کے جھروکے سے کسی بے وقوف فریادی کو دیکھتا ہے۔ اُس نے میرا رویہ نظر انداز کرتے ہوئے زبردستی مجھ سے مصافحہ کیا اور کہنے لگا۔

''بھئی کہاں ہو کارل! میں ایک ہفتے سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ سڑکوں پر ہر خوب صورت لڑکی کے ساتھی کو میں غور سے دیکھتا تھا کہ شاید یہ کارل ہو۔''

''مقصد کم لفظوں میں بیان کرو۔'' میں نے آواز درشت بناتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' میرا لہجہ باقاعدہ سخت تھا مگر جمی کے سامنے یہ اداکاری زیادہ دیر نہیں چل سکتی تھی۔ وہ بڑا گھاگ تھا، اُس نے صرف پچیس سال کی عمر میں پچیس درجن لڑکیوں کو بے وقوف بنایا ہوگا اور پچیس سو فراڈ کر چکا ہوگا اور پچیس لاکھ جھوٹ بول چکا ہوگا، اس کے باوجود اُس کی گفتگو میں وہ جادو تھا جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی، آدمی اُس کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ میری اداکاری پانچ منٹ میں دم توڑ گئی۔

''اس بار مسئلہ بڑا سیدھا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''مسئلہ کبھی سیدھا نہیں ہوتا، خصوصاً تمہارا مسئلہ۔'' میں نے بچنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔'' اُس نے اعتماد سے کہا۔ ''ڈراما بہت معمولی ہے اور تمہارا کردار اُس میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔''

میں نے اُٹھ کر کافی بنائی، پھر جمی نے اپنی کہانی شروع کی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہیلن سے میرے کیسے تعلقات ہیں۔'' اُس نے میز پر ٹانگیں پھیلا لیں اور چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک مہینے بعد اُس سے شادی کرنے والا ہوں۔ یہ دنیا کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے کہ میں، یعنی جمی ایک لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں۔ ویسے وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔ گزشتہ چھ ماہ میں، میں نے اُسے ہر زاویے سے پرکھا ہے۔ یقین کرو کارل! میرے دوست! یہ وہ لڑکی ہے جسے بے وقوف بنانے کا مطلب خود بے وقوف بننا ہوگا، لہٰذا میں نے شادی کا اٹل فیصلہ کر لیا ہے۔'' میں نے اپنا منہ بند کیا جو حیرت سے کھل گیا تھا۔ اُس نے داستان جاری رکھی۔

''دو روز قبل میری اور ہیلن کی اِس جذباتی فلم میں ایک ولن داخل ہو گیا ہے۔ اُس کا نام ٹونی ہے اور عمر پندرہ سال ہے، وہ ہیلن کا بھانجا ہے۔ کم بخت نا گہانی بلا کی



طرح شکاگو سے نازل ہوگیا۔ ہیلن مجھے اُس کے بارے میں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ٹونی اتنی سی عمر میں فٹ بال کا بہترین کھلاڑی ہے، اُس کی شہرت دور دور پہنچ چکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مستقبل کا پاؤلوراسی یا میراڈونا ہے۔ شکاگو کے سب سے بڑے فٹ بال کلب سے اُسے پچاس ہزار ڈالر سالانہ ملتے ہیں۔ وہ یہاں ایک ٹورنامنٹ میں شرکت کرنے آیا ہے۔ میں ایسے حیرت انگیز لڑکے سے ملنے کا بے حد مشتاق تھا۔ ہیلن نے اُس سے بہت اچھی طرح میرا تعارف کرایا۔ وہ ہیلن کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولا کہ اِس شخص کی شکل گھوڑے سے کیوں ملتی ہے؟ المیہ یہ ہے کہ سرگوشی خاصی بلند آواز میں کی گئی تھی تاکہ میں بھی سن سکوں۔ پھر بھی میں نے خیر سگالی کے طور پر یہ بات نظر انداز کر دی۔ ہیلن نے خوشی سے اُسے بتایا کہ ہم دونوں شادی کرنے والے ہیں، وہ اُچھل کر بولا کہ میں شادی ضرور شرکت کروں گا، کیوں کہ میں نے آج تک کسی خوب صورت لڑکی کو خودکشی کرتے نہیں دیکھا۔ ہیلن نے مداخلت کی۔ وہ چرب زبانی سے باز آ گیا۔ ہم اُسے گھمانے کے لیے لے گئے۔ ریسٹوران میں وہ پورے پانچ آدمیوں کا کھانا کھا گیا۔ چار بار اُس نے آئس کریم منگوائی، اس کے بعد منہ بنا کر بولا کہ یہاں کا کھانا لذیز نہیں ہے۔ رات گئے میں نے ہیلن کو اور اُسے گھر پہنچایا، وہ کہنے لگا کہ میرے منہ سے آپ کی شکل وصورت کے بارے میں جو بات نکل گئی تھی، اُس پر میں معذرت خواہ ہوں۔ اِس سے پہلے کہ میں اُس کی معذرت قبول کرتا، وہ بولا کہ مجھے خوا مخواہ سچ بولنے کی عادت نے ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے۔ آپ سے ایک درخواست ہے، کسی گھوڑے تک یہ بات نہ پہنچائیے گا۔ اُس رات مجھے ایک لمحے بھی نیند نہیں آئی۔ بار بار ٹونی کی شکل میری آنکھوں کے سامنے آجاتی اور میرا خون کھولنے لگتا۔"

"غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرو۔" میں نے کہا۔

"کل صبح کے اخبار سے مجھے معلوم ہوا۔" جمی نے میری نصیحت سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ "لوگ ٹونی کی شہرت سے بہت متاثر ہیں، وہ ایک ہر دل عزیز کھلاڑی ہے۔ اُس کی ٹیم کی جیت کے امکانات پر سیکڑوں ہزاروں ڈالر کا سٹہ کھیلا جا رہا ہے۔ میں نے اُسی وقت ہیلن کے گھر فون کیا اور اُس سے کہا کہ میں ٹونی کو فلم دکھانا چاہتا ہوں۔ ہیلن میری خوش اخلاقی پر بہت خوش ہوئی، کچھ دیر بعد اُس نے مجھے خوش خبری سنائی کہ ٹونی نے میری پیش کش قبول کر لی ہے۔ میں مقررہ وقت ہیلن کے گھر پہنچا، ٹونی تیار تھا۔ میں اُسے کار میں بٹھا کے فلم دکھانے لے گیا۔ واپسی میں ہم ایک ریسٹوران میں جا بیٹھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ "ٹونی! تمہاری ٹیم پر لوگ خاصی رقم لگا رہے ہیں۔ اُس نے کہا

کہ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے، لوگ مضبوط ٹیموں پر زیادہ رقم لگاتے ہی ہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم ہار جاؤ۔" میں نے کہا۔ "سُوئے اتفاق سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہ ہو یا قسمت تمہارے خلاف ہو۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔" اُس نے پہلی آئس کریم پر ہلّا بولتے ہوئے کہا۔ "میرا ریکارڈ اب تک بے حد اچھا رہا ہے اور آئندہ بھی میں ہارنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"لیکن اگر تم ہارنے کا ارادہ کرلو تو......" میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "دیکھو، ظاہر ہے، ایک ٹورنامنٹ ہارنے پر تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بڑے بڑے کھلاڑی بھی کبھی اچھی کارکردگی نہیں دکھا پاتے۔"

"لیکن میں ہمیشہ اچھی کارکردگی دکھاتا ہوں۔" اُس نے آئس کریم صاف کردی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہارنے کا خود فیصلہ کرلو۔" میں نے بیرے کو دوسری آئس کریم لانے کا اشارہ کیا۔ "تمہاری ہار پر رقم لگانے والے بہت کم ہوں گے، اس لیے اگر تم ہار جاؤ تو انہیں ایک ڈالر کے بدلے پچاس ڈالر تک مل سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہونا میری بات؟"

"نہیں۔" وہ دوسری آئس کریم کھانے لگا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں ٹونی کہ اگر تم جان بوجھ کر ہار جاؤ تو تمہاری ہار پر رقم لگانے والے ہزاروں ڈالر جیت سکتے ہیں اور تمہیں بھی ہزاروں ڈالر بیٹھے بٹھائے مل سکتے ہیں، تیس چالیس ہزار ڈالر۔"

"تیس چالیس ہزار ڈالر؟" آئس کریم اُس کے حلق میں پھنس گئی، وہ دیر تک کھانستا رہا حواس بحال ہوئے تو اُس نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ مجھے جان بوجھ کر ہار جانے کے تیس چالیس ہزار ڈالر مل سکتے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "سرمایہ میں لگاؤں گا۔ تمہارا کام صرف یہ ہوگا کہ میدان میں کوئی گول نہ کرنا، مخالفین کو گول کرنے کے مواقع فراہم کرنا اور میچ ہار جانا۔"

ٹونی دیر تک سوچتا رہا پھر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ "ٹھیک ہے پارٹنر!" اُس نے آئس کریم میں سَنا ہوا ہاتھ مجھ سے ملایا۔ "میچ ہارنے کے عوض تم مجھے تیس یا چالیس ہزار ڈالر دو گے۔"

"ہمارے تعلقات نہایت خوش گوار ہوگئے۔ گھر پہنچ کے اُس نے ہیلن کے سامنے میری شان میں کوئی گستاخی نہیں کی۔ میں رخصت ہونے لگا تو اُس نے شرفا کی طرح مجھ سے مصافحہ کیا۔"

"اُسی شام میں نے اُن تمام لوگوں سے ملاقات کی جو مجھے اُدھار دے سکتے تھے۔ میں نے ایک گھنٹے میں پانچ ہزار ڈالر جمع کرلیے۔ سٹے بازوں سے معلوم ہوا کہ ٹونی کی ٹیم کا بھاؤ ایک اور بیس چل رہا ہے، گویا پانچ ہزار ڈالر کے عوض ایک لاکھ ڈالر یقینی تھے۔ میں نے پوری رقم لگادی اور اطمینان سے گھر آ گیا۔ رات اچھی گزری۔ آج صبح میں ہیلن کے گھر پہنچا، ٹونی کے تیور بدلے بدلے نظر آئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ میچ کب ہے؟ اُس نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ صرف چھبیس گھنٹے رہ گئے ہیں۔ میں نے اُسے باہر چل کے آئس کریم کھانے کی دعوت دی، وہ بولا، آج میں الٹی سیدھی چیزیں نہیں کھانا چاہتا، کل میرا میچ ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں۔ کل تمہارا میچ ہے۔" ہیلن سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"میچ میں بہترین کارکردگی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی جسمانی طور پر پوری طرح فٹ ہو۔" ٹونی نے کہا۔

"ظاہر ہے۔" میں ہنسا۔

"ویسے بھی میں ممی اور ڈیڈی سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ یہ میچ ہر حال میں جیتوں گا اور میں ممی ڈیڈی سے کیا ہوا وعدہ ہر صورت میں پورا کرتا ہوں۔" مجھے اُس کی گفتگو سے پریشانی ہونے لگی۔

"یہ بہت اچھی بات ہے۔" ہیلن باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میں ممی ڈیڈی کو مایوس نہیں کروں گا۔" ٹونی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے ٹونی؟" میں نے تنہائی ملتے ہی سرگوشی کی۔ "تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے؟"

"وعدہ؟" وہ عیاری سے مسکرایا۔ "کیسا وعدہ؟"

ایک لمحے میں مجھ پر سب کچھ واضح ہوگیا۔ وہ

خبیث وعدہ کر کے مکر گیا تھا اور میں یعنی دنیا کا سب سے بڑا الّو کا پٹھا اُس کے بھروسے پر پانچ ہزار ڈالر جہنم میں جھونک آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک لاکھ ڈالر میں سے تیس ہزار اُسے دے دوں گا اور ستر ہزار سے کوئی کاروبار شروع کر کے ہیلن سے شادی کرلوں گا، باقی زندگی شریفانہ انداز میں بسر کروں گا۔ اُس پندرہ سالہ سُور نے میرا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اب میرے پاس ایک ہی چارہ رہ گیا ہے پیارے کارل!''

میں نے ایک پندرہ سالہ لڑکے کے ہاتھوں جمی جیسے شخص کے بے وقوف بننے کی داستان خوشی اور شوق سے سُنی اور کہا۔ ''کبھی نہ کبھی ہر آدمی کو شکست کھانی پڑتی ہے جمی۔''

''میچ کل صبح گیارہ بجے شروع ہوگا۔'' جمی کے لہجے میں مایوسی نہیں تھی، میں پورا منصوبہ تیار کر چکا ہوں۔ صرف معمولی سے تعاون کی ضرورت ہے مجھے۔''

''بدقسمتی سے میں ایک ہفتے تک بہت مصروف ہوں، بُری طرح پھنسا رہوں گا۔'' میں نے ٹیبل ڈائری الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

جمی نے مصروفیت کو ایک ناممکن سی گالی بکی اور کہا۔ ''یہی وہ وقت ہے کارل! جب تمہیں مجھ سے اپنی دوستی کا ثبوت دینا ہے، دوست وہی ہے جو مصیبت یا عشق میں کام آئے۔''

''کام کیا ہے؟''

''ٹونی کل رات اپنے جوتے بھول کر ٹیم کے دوسرے کھلاڑیوں کے پاس کیمپ چلا گیا تھا۔'' جمی نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے وہ جوتے ہیلن کے گھر میں صوفوں کے نیچے چھپا دیے ہیں۔ شاید تمہیں علم ہو، دنیا کا کوئی فٹ بال کھیلنے والا اپنے خاص جوتوں کے بغیر نہیں کھیلتا۔ اسے وہم سمجھ لو یا عقیدہ، کھلاڑی کے پاس جب تک اُس کے جوتے نہ ہوں، اُس وقت تک اُسے یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ شاندار کھیل پیش کر سکے گا۔ ہر کھلاڑی کے لیے اُس کے جوتے خوش قسمتی کی علامت ہوتے ہیں۔ کچھ دیر قبل ہیلن کے پاس ٹونی کا فون آیا تھا، میں اُس وقت وہیں تھا، ٹونی اپنے جوتے منگوانا چاہتا تھا۔ ہیلن نے اُس سے کہا کہ صبح وہ خود آ کے جوتے

ڈھونڈ لے۔ اب وہ کل صبح جوتے ڈھونڈنے آئے گا۔‘‘

’’میں سمجھ گیا۔‘‘ میں نے عقل مندی سے سر ہلایا۔ ’’تم جوتے بدل دو گے۔ نئے جوتے اُس کے لیے خوش قسمتی کا پیغام نہیں لائیں گے، اُس کی ٹیم ہار جائے گی۔‘‘

’’میں ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کروں گا۔‘‘ جمی نے کہا۔ ’’میں کل ہیلن کے ساتھ میچ دیکھنے جاؤں گا۔ میچ گیارہ بجے شروع ہوگا لیکن ہیلن کو میں صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دس بجے کے قریب ٹونی اپنے جوتے لینے وہاں پہنچے گا، اس کے بعد وہ وقت پر میدان میں نہیں پہنچ سکے گا۔ اُسے ہیلن کے فلیٹ ہی پر زبردستی روک لیا جائے گا۔‘‘

’’کیسے؟‘‘

’’تم ہیلن کے فلیٹ میں ہو گے اور اُسے روکو گے۔‘‘ اُس نے مسکرا کر کہا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ خاصی دیر کے بعد میں نے انکار میں سر ہلایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جمی کے سامنے کوئی داؤ نہیں چلتا۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ دلیل یہ تھی کہ ہیلن اُس کی زندگی ہے اور ایک لاکھ ڈالر نہ ملنے کی صورت میں بسر ہونے والی زندگی موت۔ پندرہ منٹ بعد وہ رخصت ہو گیا۔ میں خالی نظروں سے بند دروازہ تکتا رہا۔

جمی کی دی ہوئی چابی سے ہیلن کے فلیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے تمام گھڑیاں ایک گھنٹے پیچھے کر دیں۔ گھڑیال بھی، ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی چھوٹی گھڑی بھی اور اپنے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی بھی۔ صبح کے دس بجے تھے مگر فلیٹ کی گھڑیوں میں نو کا عمل تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک سیدھا سادہ لڑکا گھسی ہوئی جینز اور ڈھیلی سی قمیص پہنے کھڑا تھا۔ ’’میں جوتے لینے آیا ہوں۔‘‘ وہ مسکرایا۔ ’’کل دراصل......‘‘

’’مجھے معلوم ہے، کل جوتے یہیں رہ گئے تھے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اندر آ جاؤ۔ ہیلن کہہ کے گئی ہے کہ آنے والا بہت قریبی مہمان ہے، اُسے کچھ کھلائے پلائے بغیر رخصت نہ کرنا۔‘‘ وہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے اپنے اور اُس کے ڈیل ڈول کا موازنہ کیا اور اطمینان کی سانس لی۔ بظاہر مسکین نظر آنے والا ٹونی کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، طاقت میں مجھ سے نہیں جیت سکتا۔

’’یہ گھڑی ایک گھنٹے پیچھے چل رہی ہے کیا؟‘‘ اُس نے اچانک گھڑیال کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’نہیں۔‘‘ میں نے اپنی گھڑی پہ نظر ڈالی۔ ’’ٹھیک چل رہی ہے۔ نو بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔‘‘

’’کمال ہے۔‘‘ اُس نے اپنی گھڑی صحیح کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنے حساب سے یہاں دس بجے پہنچا تھا۔‘‘ وہ دیر تک ہنستا رہا، پھر خاموش ہو گیا۔

میں نے اُس سے گفتگو کا آغاز کیا۔ فٹ بال کی تکنیک کے بارے میں میرے سوال پر وہ دس منٹ تک بولتا رہا۔ پھر فٹ بال کی تاریخ کا ذکر چھڑا پھر فٹ بال کی عالمی مقبولیت کی بات ہوئی۔ غرض ایک گھنٹے میں، میں فٹ بال پر فٹ بال کے بڑے بڑے ماہروں کے برابر حقائق جان گیا۔ میں نے کئی نامور کھلاڑیوں کے دلچسپ واقعات سنے اور اُن تمام بڑے کھلاڑیوں کی قسمت پر اظہارِ افسوس کیا، جن کی زمانے نے قدر نہیں کی۔ اِس اثناء میں ٹونی نے فرج میں رکھے ہوئے تمام پھل اور بھنے ہوئے گوشت کی ایک پلیٹ کھالی۔ نیز مختلف مشروبات کی پانچ بوتلیں بھی اُس نے اُس کنویں میں انڈیل لیں، جسے پیٹ کہتے ہیں۔

گھڑیال نے دس بجائے تو میں سمجھ گیا کہ گیارہ بج گئے ہیں اور میچ شروع ہو گیا ہے۔ اُسی وقت ٹونی کھڑا ہو گیا۔ ’’میرا خیال ہے، میں جوتے ڈھونڈ لوں۔ ایک گھنٹے بعد میچ شروع ہو جائے گا۔‘‘

میں سمجھ رہا تھا کہ جوتے ڈھونڈنے میں اُسے کم سے کم بیس پچیس منٹ لگیں گے لیکن اُس نے صرف تین منٹ میں صوفے کے نیچے گھس کے جوتے نکال لیے۔

’’تھوڑی دیر بیٹھو۔‘‘ میں نے اُسے تیار دیکھ کر کہا۔ ’’ابھی تو خاصی دیر ہے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ اُس نے گھڑی دیکھی۔ ’’اب میں چلتا ہوں۔‘‘

’’بات یہ ہے۔‘‘ میں نے مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ’’تم فی الوقت جا نہیں سکتے۔‘‘

”کیا مطلب؟“ اُس کے چہرے پر اُلجھن نمودار ہوئی۔

”مطلب صاف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

اُس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن میں نے ہاتھ موڑ کے اُسے نیچے گرادیا اور اُس پر سوار ہوگیا۔

”یہ کیا مذاق ہے مسٹر؟“ وہ چلّایا۔

”یہ ایک بھیانک مذاق ہے۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔

معاً وہ تڑپ کے میری گرفت سے نکل گیا۔ میں اندھا دھند اُس کی طرف بڑھا۔ اُسی وقت میں نے اُس کی لات اپنی طرف آتی محسوس کی۔ یہ وہی کِک تھی جس کے سامنے بڑے بڑے کھلاڑی بے بس ہوجاتے ہیں اور گول کیپر خود کو لاچار محسوس کرتے ہیں اور عوام تالیاں بجا بجا کے پاگل ہوجاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میری کنپٹی پر لوہے کا گرز لگا ہو، میں نے کمرے کی دیواریں دھندلاتے، ڈگمگاتے دیکھیں پھر میں نے ہمت کر کے سر جھٹکا تو منظر ذرا واضح ہوا۔ ٹونی دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور اُسے لیتا ہوا فرش پر آگرا۔ ٹونی کے منہ سے نکلنے والی گالیاں اُس کی عمر سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔

مجھے علم ہوچکا تھا کہ اُسے کوئی موقع دینا حماقت ہے۔ میں نے اُس کا احتجاج نظر انداز کر کے سخت اقدامات شروع کیے۔ پانچ منٹ بعد وہ رسیوں سے بندھا ہوا فرش پر خاموش لیٹا تھا۔ خاموش اس لیے کہ اُس کے منہ میں رومال ٹھنسا ہوا تھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ وہ فرش پر لیٹا چھت گھورتا رہا، میں کرسی پر بیٹھا گھڑیال دیکھتا رہا۔ گھڑیال میں دس بج کر بیس منٹ ہوچکے تھے۔ یعنی گیارہ بج کر بیس منٹ، کھیل چل رہا ہوگا، میں نے سوچا، ٹونی کی ٹیم ٹونی کے بغیر کھیل رہی ہوگی اور سخت دباؤ میں ہوگی۔ اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ”ہیلو۔“ میں نے ریسیور اُٹھایا۔

”کارل!“ دوسری طرف سے جمی نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”اُلو کے پٹھے......! تم...... تم......“

کچھ عجیب و غریب گالیاں اور بے سروپا باتیں تھیں، زندگی اور شادی اور تباہی کا بار بار ذکر آرہا تھا۔

”کیا بکواس ہے جمی؟“ میں نے کہا۔

”تم نے ٹونی...... ٹونی کو......“ غصے میں اُس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

”ٹونی یہاں بندھا پڑا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اُس کے منہ میں رومال ہے اور ہاتھ پیروں میں رسیاں ہیں اور......“

”کارل!“ جمی نے تقریباً چلّاتے ہوئے کہا۔ ”ٹونی یہاں کھیل رہا ہے۔ وہ ایک گول کرچکا ہے۔“ پس منظر سے ہزاروں تماشائیوں کا شور اُبھرا۔ ”شاید وہ دوسرا گول بھی کرچکا ہے کارل!...... تم...... تم......“ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

”تم کون ہو؟“ میں نے لڑکے کے منہ سے رومال نکالا۔

”میں؟“ اُس نے حیرانی سے کہا۔ ”میں فلیش ہوں۔“

”کیا؟“

”ہاں، فلیش۔ ٹونی کی ٹیم کے چار محفوظ کھلاڑیوں میں سے ایک۔“

”تم...... تم ٹونی نہیں ہو؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ٹونی میرا دوست ہے، میری ٹیم کا کھلاڑی ہے، میں تو اُس کے جوتے لینے آیا تھا۔“

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہورہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ سب کچھ ایک مذاق تھا، میرا مقصد اُسے تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ میں نے اس کی رسّیاں کھولیں اور کہا کہ وہ جاسکتا ہے۔ ”شکریہ مسٹر!“ اِن الفاظ کے ساتھ ہی اُس کی کِک میرے پیٹ میں گولے کی طرح لگی۔ میں درد سے دُہرا ہوگیا۔ اُسی وقت دوسری لات میرے منہ پر پڑی، میں اُلٹ کر پیچھے جا گرا۔ کمرہ دھندلا گیا، ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

پھر مجھے ہوش آیا تو میں فلیٹ میں اکیلا تھا۔ واش بیسن کے آئینے میں، میں نے اپنا سوجا ہوا جبڑا اور پھٹا ہوا کوٹ دیکھا۔ پھر میں نے ایک ماہر مقرّر کی طرح آئینے میں اُن دلائل کی مشق شروع کردی جو مجھے اپنے خون کے پیاسے جمی کے سامنے پیش کرنے تھے۔

☆......☆

سرحد پار سے پہلی معرکۃ الآراء کہانی

منتر

منشی پریم چند

دو انسانوں کا ماجرا، دونوں اپنی اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ منشی پریم چند کے سحر آور قلم سے

شام کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی اٹھائے آتے دکھائی دیے۔ عقب میں ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا آرہا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رُک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے آکر دروازے پر پڑی چق میں سے جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے اُسے یہ خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کوئی جھڑک نہ دے۔ ڈاکٹر صاحب کو میز کے قریب کھڑے دیکھ کر بھی اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”حضور! بڑا غریب آدمی ہوں۔ میرا لڑکا کئی روز سے......“

ڈاکٹر صاحب نے سگار سلگا کر جواب دیا، ”کل صبح آؤ، کل صبح...... ہم اِس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔“

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا، اور بولا، ”دُہائی ہے سرکار کی! لڑکا مر جائے گا...... حضور چار دن سے آنکھیں نہیں......“

ڈاکٹر چڈھا نے کلائی پر نظر ڈالی، محض دس منٹ باقی تھے، گولف اسٹک کھونٹی سے اُتارتے ہوئے بولے، ”کل سویرے آنا، کل سویرے...... یہ ہمارے کھیلنے کا وقت ہے۔“

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی، اور رو کر بولا، ”حضور! ایک نگاہ ڈال دیں، محض ایک نگاہ...... لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا حضور! لڑکوں میں سے یہی ایک بچ رہا ہے...... حضور! ہم دونوں آدمی رو رو کر مر جائیں گے۔ سرکار کا اقبال بڑھے...... دین بندھو!“

ایسے گنوار اور ناسمجھ دیہاتی تقریباً روز ہی آیا کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب اُن کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ کوئی کتنا ہی کیوں نہ کہے، وہ اپنی ہی رَٹ لگاتے جائیں گے، کسی کی سنیں گے نہیں۔ آہستگی سے چق اٹھا کر موٹر کی طرف بڑھے۔ بوڑھا اُن کے پیچھے یہ کہتا ہوا لپکا، ”سرکار! بڑا کرم ہوگا۔ حضور! رحم کیجیے۔ بڑا بے بس اور دُکھی ہوں...... دنیا میں اَور کوئی نہیں ہے بابو جی!“

لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُس کی طرف منہ گھما کر دیکھا تک نہیں...... موٹر پر بیٹھ کر بولے، ”کل صبح آنا۔“

موٹر چلی گئی۔ بوڑھا کئی منٹ تک تصویر کی طرح ساکن کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی تفریح کے لیے دوسروں کی زندگی کی بھی پروا نہیں



کرتے۔ شاید اس پر اب بھی اُسے وشواس نہ ہوتا تھا۔ مہذب دنیا اِس قدر سنگ دل اور بے حس ہے، اِس کا ایسا تعجب انگیز احساس اُسے اب تک نہ ہوا تھا۔ وہ پرانے زمانے کے اُن لوگوں میں سے تھا جو لگی ہوئی آگ بجھانے، مردے کو کندھا دینے، کسی کا چھپّر اُٹھانے اور کسی جھگڑے کو مٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جب تک موٹر بوڑھے کی نظروں میں رہی، وہ وہیں کھڑا اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا...... شاید اُسے اب بھی اُن کے لوٹ آنے کی امید تھی...... پھر اُس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ ڈولی جدھر سے آئی تھی اُدھر ہی چلی گئی۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر وہ ڈاکٹر چڈھا کے پاس آیا تھا۔ ان کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہاں سے نا امید ہو کر وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا...... ماتھا پیٹ کر رہ گیا!

اُسی رات اُس کا ہنستا کھیلتا، سات برس کا بچہ اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بوڑھے ماں باپ کی زندگی کا یہی ایک سہارا تھا۔ اِسی کا منہ دیکھ کر وہ زندہ تھے۔ اِس چراغ کے گل ہوتے ہی زندگی کی تاریک رات میں سنسناہٹیں سی آ گھسیں۔ بڑھاپے کی شدید محبت ٹوٹے ہوئے دل سے نکل کر اُس تاریکی میں بلک بلک کر رونے لگی۔

کئی برس گزر گئے۔ ڈاکٹر چڈھا نے دولت کے ساتھ ساتھ عزت بھی خوب کمائی اور اپنی صحت کی سختی سے حفاظت کی، جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ یہ اُن کی باقاعدہ زندگی ہی کا نتیجہ تھا کہ پچاس برس کی عمر میں اُن کا ہر کام وقت کا پابند تھا۔ اِس پابندی سے وہ ذرّہ بھر بھی پرے نہ ہٹتے۔ عام طور پر لوگ صحت کے اصولوں کی پیروی اُس وقت کرتے ہیں جب وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے عام اصولوں کا بھید بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اُن کی اولاد بھی اسی قانون کے زیرِ اثر تھی۔ اُن کے محض دو بچے ہوئے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی...... تیسرا بچہ نہ ہوا، اِس لیے شریمتی چڈھا بھی ابھی جوان ہی نظر آتی تھیں۔ لڑکی کی شادی ہو چکی تھی، لیکن لڑکا ابھی کالج ہی میں پڑھتا تھا۔ وہی ماں باپ کی زندگی کا سہارا تھا۔ طبیعت میں انتہائی سکون، شرافت کا پتلا، بے حد باذوق اور فیاض، یونیورسٹی کا ہر دل عزیز طالب علم، نوجوان طبقے کا محبوب رکن...... جب بات کرتا تو جیسے منہ سے پھول جھڑتے۔ آج اُس کی بیس ویں سال گرہ تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ہری ہری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف اور کالج کے لڑکے دوسری طرف بیٹھے کھانا تیار کر رہے تھے۔ بجلی کے قمقموں سے میدان بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ تفریح کا تمام سامان بھی موجود تھا۔ چھوٹا سا مزاحیہ ڈراما کھیلنے کی تیاری بھی ہو رہی تھی۔ کھیل خود کیلاش ناتھ نے لکھا تھا، نمایاں کردار بھی وہی تھا۔ اِس

وقت وہ ایک ریشمی قمیص پہنے، ننگے سر، ننگے پاؤں اِدھر اُدھر دوستوں کی آؤ بھگت میں مشغول تھا۔ کوئی پکارتا، ”کیلاش! ذرا اِدھر آنا۔“ کوئی اُدھر سے بلاتا، ”کیلاش! کیا اُدھر ہی رہو گے؟“ کبھی اُسے چھیڑتے تھے، مذاق کرتے تھے۔ بے چارے کو دم مارنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔

اچانک ایک حسینہ نے اُس کے قریب آ کر کہا۔
”کیوں کیلاش! تمہارے سانپ کہاں ہیں؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو!“

کیلاش نے اُس سے مصافحہ کر کے کہا، ”مرنالنی! اس وقت معاف کرو، کل دکھادوں گا۔“

مرنالنی نے اصرار کر کے کہا، ”جی نہیں! تمہیں دکھانا ہی پڑے گا! میں آج نہیں ماننے کی۔ تم ہر روز ”کل کل“ کرتے رہتے ہو۔“

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے اور ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار۔ کیلاش کو سانپ پالنے، کھلانے اور نچانے کا بہت شوق تھا۔ اُس نے طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے۔ وہ اُن کی فطرت اور رہن سہن کا مطالعہ گہری نظر سے کیا کرتا تھا۔ تھوڑے دن ہوئے، اُس نے کالج میں سانپوں پر ایک معرکتہ الآرا تقریر کی تھی۔ سانپوں کے رقص کا مظاہرہ بھی کیا تھا...... یہاں تک کہ اس موضوع کے بڑے بڑے عالم بھی یہ مضمون سن کر انگشت بہ دنداں رہ گئے تھے۔ یہ فن اُس نے ایک معمر سپیرے سے حاصل کیا تھا۔ سانپ کے کاٹے کے علاج کے لیے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے کا اُسے جنون تھا۔ محض اس قدر اطلاع مل جانے پر کہ کسی آدمی کے پاس کوئی اچھی جڑی ہے، اُسے چین نہ آتا تھا، اُسے حاصل کر کے ہی دم لیتا۔ یہی ایک عیب تھا جس پر وہ ہزار ہا رُپے خرچ کر چکا تھا۔ مرنالنی کئی مرتبہ آ چکی تھی، لیکن کبھی سانپوں کو دیکھنے کے لیے اِس قدر مُصر نہیں ہوئی تھی۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ واقعی اُس کا اشتیاق اس قدر شدید ہو گیا تھا، یا وہ محض کیلاش پر اپنے حقوق کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی، لیکن اُس کی ضد بے موقع تھی۔ اس کوٹھری میں کتنی بھیڑ لگ جائے گی، ہجوم کو دیکھ کر سانپ کس قدر چونکیں گے، اور رات کو چھیڑنا اُنہیں کتنا برا لگے گا، اِن باتوں پر اُس نے ذرا بھی غور نہ کیا تھا۔

کیلاش نے کہا، ”نہیں، کل ضرور دکھادوں گا۔ اِس وقت عمدگی سے دکھا بھی تو نہ سکوں گا۔ کمرے میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ رہے گی!“

اک صاحب چھیڑ کر بولے، ”دکھا کیوں نہیں دیتے؟ اتنی سی بات کے لیے اتنی ٹال مٹول کر رہے ہو۔ مس گوبند! ہر گز نہ ماننا، دیکھیں، کیوں کر نہیں دکھاتے!“

دوسرے مہاشے اور بھی طنز سے بولے، ”مس گوبند اِس قدر معصوم اور سادہ لوح ہیں، تبھی اس قدر مزاج کرتے ہیں۔ کوئی اور ہوتیں تو اب تک اس بات پر بگڑ چکی ہوتیں۔“

تیسرے حضرت مذاق اُڑا کر بولے۔ ”اجی تعلقات ہی قطع کر لیتیں! بھلا کوئی بات ہے یہ بھی! اِس پر آپ کو دعویٰ ہے کہ مرنالنی کے لیے جان تک حاضر ہے!“

مرنالنی نے دیکھا کہ سبھی مِل جل کر اُسے بنا رہے ہیں، تو وہ بولی، ”آپ لوگ میری وکالت نہ کریں۔ میں خود اپنی وکالت کر لوں گی۔ میں اس وقت سانپوں کا تماشا دیکھنا نہیں چاہتی...... چلو، چھٹی ہوئی!“

ایک دوست نے مذاق اُڑایا، ”دیکھنا تو آپ سب کچھ چاہتی ہیں، لیکن کوئی دکھائے بھی تو!“

کیلاش کو مرنالنی کی اُتری اور جھینپی ہوئی شکل دیکھ کر معلوم ہوا کہ اُس کا یہ انکار اُسے کتنا برا معلوم ہو رہا ہے۔ جوں ہی پریتی بھوجن ختم ہو کر گانا شروع ہوا اُس نے مرنالنی اور دوسرے دوستوں کو سانپوں کے ڈربے کے سامنے لے جا کر بین بجانی شروع کر دی، پھر ایک ایک خانہ کھول کر ایک ایک سانپ کو نکالنے لگا۔ واہ، کیا کمال تھا! ایسا جان پڑتا تھا کہ یہ کیڑے اُس کی ایک ایک بات، اُس کے دل کے ہر ایک جذبہ سمجھتے ہیں...... کسی کو اٹھا لیا، کسی کو گردن میں حمائل کر لیا، کسی کو ہاتھ میں لپیٹ لیا۔ مرنالنی ہر مرتبہ منع کرتی کہ انہیں گلے میں مت ڈالو۔ دور ہی سے دکھا دو۔ بس ذرا نچا دو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھ کر اُس کی تو جان ہی نکلی جا رہی تھی۔ پچھتا رہی تھی کہ اُس نے خوامخواہ سانپ دکھانے کو کہا، لیکن کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ محبوبہ کے سامنے اپنے اس فن

کی نمائش کا ایسا موقع پا کر وہ کب چوکتا تھا! ایک دوست نے بتایا، ''دانت توڑ ڈالے ہوں گے!''

کیلاش نے ہنس کر جواب دیا، ''دانت توڑ ڈالنا مداریوں کا کام ہے۔ کسی کے دانت نہیں توڑے گئے۔'' یہ کہہ کر اُس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا، ''میرے پاس اس سے بڑھ کر زہریلا سانپ اور کوئی نہیں ہے۔ اگر کسی کو کاٹ لے تو آدمی چشم زدن میں مر جائے! ایک لمحے کی بھی مہلت نہ ملے۔ اِس کے کاٹے کا منتر نہیں...... اگر کہو تو اس کے دانت دکھادوں؟''

مرنالنی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، ''نہیں نہیں کیلاش! ایشور کے لیے اِسے چھوڑ دو، تمہارے پاؤں پڑتی ہوں!''

اس پر ایک دوست بولے، ''مجھے تو یقین نہیں آتا، لیکن تم کہتے ہو تو مان لوں گا۔''

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا، ''نہیں صاحب! آپ آنکھوں سے دیکھ کر ہی مانیے۔ دانت توڑ کر بس میں کیا تو کیا کیا۔ سانپ بڑا سمجھ دار ہوتا ہے۔ اگر اسے وشواس ہو جائے کہ اس آدمی سے اُسے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں تو وہ اُسے کبھی نہ کاٹے گا۔''

مرنالنی نے جب دیکھا کہ کیلاش کے سر پر بھوت سوار ہے تو اُس نے مظاہرہ ختم کر دینے کے ارادے سے کہا، ''اچھا بھئی! اب یہاں سے چلو، دیکھو، گانا شروع ہو گیا ہے۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی۔''

یہ کہہ کر اُس نے کیلاش کا شانہ پکڑ کر اُسے چلنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے نکل گئی...... لیکن کیلاش تو مخاطب لوگوں کا وہم دور کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اُس نے سانپ کی گردن پکڑ کر اس زور سے دبائی کہ اُس کا منہ سرخ ہو گیا، اور جسم کی تمام رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اُس کے ہاتھوں کبھی ایسا سلوک نہ دیکھا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اُس سے چاہتا کیا ہے۔ اُسے خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ اُسے مار ڈالنا چاہتا ہے، اس لیے وہ اپنی حفاظت کے لیے مستعد ہو گیا۔ کیلاش نے اُس کی گردن خوب دبا کر اس کا منہ کھول دیا اور اُس کے زہریلے دانت دکھاتے ہوئے بولا، ''جن دوستوں کو شک ہو، آ کر دیکھ لیں...... آیا یقین؟ یا اب بھی کچھ شک ہے؟''

احباب نے آ کر اُس کے دانت دیکھے اور متعجب رہ گئے۔ ٹھوس ثبوت کے سامنے شک و شبے کی گنجائش کہاں! دوستوں کے شکوک کا ازالہ کرنے کے بعد اُس نے سانپ کی گردن ڈھیلی چھوڑ دی اور اُسے زمین پر رکھنا چاہا، لیکن وہ کالا سانپ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ گردن نرم پڑتے ہی اُس نے سر اُٹھا کر کیلاش کی انگلی پر لپک کر زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کیلاش کی انگلی سے ٹپ ٹپ لہو ٹپکنے لگا۔ پوری قوت سے انگلی دبا کر کیلاش اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہاں میز کی دراز میں ایک جڑی پڑی تھی، جسے پیس کر لگا دینے سے سم قاتل کا اثر بھی دور ہو جاتا تھا۔ دوستوں میں ہلچل مچ گئی۔ باہر محفل میں اطلاع پہنچی، اور ڈاکٹر صاحب گھبرا کر دوڑے۔ فوراً انگلی کی جڑ کس کے باندھی گئی، اور جڑی پیسنے کے لیے دے دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب جڑی کے قائل نہ تھے۔ وہ انگلی کا ڈسا ہوا حصہ نشتر سے کاٹ دینا چاہتے تھے، لیکن کیلاش کو جڑی پر مکمل وشواس تھا۔ مرنالنی پیانو پر بیٹھی تھی، خبر ملتے ہی دوڑی آئی اور کیلاش کی انگلی سے ٹپکتا ہوا لہو رومال میں جذب کرنے لگی۔ جڑی پیسی جانے لگی، لیکن اسی ایک لمحے میں کیلاش کی آنکھیں جھپکنے لگیں، ہونٹوں پر زردی پھیل گئی...... یہاں تک کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ فرش پر بیٹھ گیا۔ سارے مہمان کمرے میں جمع ہو گئے۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ۔ اتنے میں جڑی پس کر آ گئی۔ مرنالنی نے کیلاش کی انگلی پر اس کا لیپ کیا۔ ایک منٹ اور گزرا، کیلاش کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ لیٹ گیا اور ہاتھ سے ہوا کرنے کا اشارہ کیا۔ ماں نے دوڑ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور میز کا برقی پنکھا لگا دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے جھک کر پوچھا، ''کیلاش! کیسی طبیعت ہے؟''

کیلاش نے آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیا، لیکن کچھ بولا نہیں۔ مرنالنی نے روتی آواز میں کہا، ''کیا جڑی اثر نہ کرے گی؟''

ڈاکٹر صاحب نے سر تھام کر کہا۔ ''کیا بتلاؤں! میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ اب تو نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔''

نصف گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ کیلاش کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جارہی تھی، یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے، اور چہرہ ماند پڑتا گیا۔ نبض کا کہیں پتا نہ تھا۔ موت کے بھی آثار نظر آرہے تھے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ایک طرف مرنالنی سر پیٹنے لگی، دوسری طرف ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی، ڈاکٹر چڈھا کو احباب نے تھام لیا، نہیں تو وہ اپنی گردن ہی میں نشتر اتار دیتے!

ایک صاحب بولے، ”کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو یقین ممکن ہے، اب بھی بچ جائے!“

ایک مسلمان نے اُس کی تائید کی، ”ارے صاحب! قبر میں پڑی ہوئی لاشیں زندہ ہوگئیں، ایسے ایسے باکمال موجود ہیں!“

ڈاکٹر چڈھا بولے۔ ”میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا کہ اس کی باتوں میں آگیا...... نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی! بار بار سمجھاتا تھا کہ بیٹا سانپ نہ پالو، مگر کون سنتا تھا! بلایئے، کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلایئے! میرا سب کچھ لے لے، میں اپنی تمام جائیداد اُس کے قدموں پر رکھ دینے کو تیار ہوں۔ میں لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا، لیکن میرا کیلاش، میرا عزیز کیلاش جی اُٹھے...... بھگوان کے لیے، کسی کو بلایئے!“

ایک صاحب کی کسی جھاڑنے والے سے جان پہچان تھی۔ دوڑ کر اُسے بلا لائے، لیکن کیلاش کی شکل دیکھ کر اُسے منتر چلانے کی جرأت نہ ہوئی، بولا ”اب کیا ہوسکتا ہے سرکار! جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا!“

ارے احمق! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا، ہو چکا۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ کہاں ہوا! ماں باپ نے بیٹے کا سہرا ابھی کہاں دیکھا! مرنالنی کی آرزوؤں کی تکمیل کہاں ہوئی! دل کے وہ حسین خواب جن سے زندگی مسرتوں اور قہقہوں سے بھرپور تھی، کہاں پورے ہوئے! زندگی کے رقصاں سمندر میں دل کی خوشی لوٹتے ہوئے کیا اُن کی نیا کو پانی نے نہیں نگل لیا! جو نہ ہونا تھا، وہ ہوگیا...... وہی ہرا ہرا میدان تھا، وہی نشلی روشن چاندنی ایک خاموش سنگیت کی طرح ماحول پر چھائی ہوئی تھی، وہی احباب کا جمِ غفیر تھا، وہی عیش و نشاط کے سامان تھے، لیکن جہاں مترنم قہقہے گونجتے تھے۔ وہاں اب درد و کرب اور آنسوؤں کا دور دورہ تھا۔“

شہر سے کئی میل دور ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بوڑھا اور بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ بوڑھا ناریل پیتا اور بیچ بیچ میں کھانستا بھی جاتا تھا۔ بڑھیا دونوں گھٹنوں میں سر دیے آگ کی طرف تاک رہی تھی۔ مٹی کے تیل کی ایک کپی طاق پر جل رہی تھی۔ گھر میں نہ تو چارپائی تھی، اور نہ بچھونا...... ایک کنارے تھوڑی سی پیال پڑی تھی، اُس کوٹھری میں ایک چولہا تھا۔ بڑھیا دن بھر سوکھی لکڑیاں اور اُپلے چنتی تھی، بوڑھا رسّی بنا کر شہر میں فروخت کر آتا تھا، یہی اُن کی زندگی تھی۔ اُنہیں نہ کسی نے روتے دیکھا اور نہ ہنستے۔ اُن کا تمام وقت زندہ رہنے میں کٹ جاتا تھا، موت دروازے پر کھڑی تھی...... رونے یا مسکرانے کی فرصت کہاں؟ بڑھیا بولی، ”کل کے لیے سن تو ہے نہیں، کام کیا کرو گے؟“

”جا کر جھگڑو شاہ سے دس سیر سن ادھار لاؤں گا۔“

اُس کے سابقہ دام تو دیے نہیں، وہ ادھار کیونکر دے گا؟“

”نہ دے گا، نہ سہی۔ گھاس تو کہیں نہیں گئی! دوپہر تک کیا دو آنے کی بھی نہ کاٹ سکوں گا!“

اتنے میں ایک آدمی نے آ کر آواز دی، ”بھگت...... ! بھگت! کیا سو گئے؟ ذرا کواڑ تو کھولو۔“

بھگت نے اُٹھ کر کواڑ کھول دیے۔ ایک آدمی نے اندر آ کر کہا، ”کچھ سنا؟ ڈاکٹر چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ کھایا!“

بھگت نے چونک کر کہا، ”چڈھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڈھا بابو ہیں نہ جو چھاؤنی میں بنگلے میں رہتے ہیں؟“

”ہاں ہاں وہی! شہر بھر میں کہرام مچا ہوا ہے، جاتے ہوئے تو جاؤ...... آدمی بن جاؤ گے!“

بوڑھے نے سخت لہجے میں سر ہلا کر کہا، ”میں نہیں جاتا۔ میری بلا جائے۔ وہی چڈھا ہیں، خوب جانتا ہوں۔ پتا کو لے کر انہیں کے پاس گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ میں اُن کے پاؤں پر گرا تھا کہ ایک نظر دیکھ لیجیے، لیکن سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ بھگوان بیٹھے سن رہے

ہیں، اب جان پڑے گا کہ بیٹے کا غم کیسا ہوتا ہے! اور کے لڑکے ہیں؟"

"نہیں جی، یہی تو ایک لڑکا تھا۔ سنا ہے، سب نے جواب دے دیا ہے۔"

"بھگوان بڑا کارساز ہے۔ اُس وقت میری آنکھوں میں آنسو تیر آئے تھے، لیکن اُنہیں ذرا بھی رحم نہ آیا۔ میں تو اُن کے دروازے پر ہوتا تو بھی بات نہ پوچھتا!"

"تو نہ جاؤ گے؟ ہم نے جو سنا تھا، تم سے آ کر کہہ دیا......"

"اچھا کیا...... اچھا کیا۔ کلیجا شانت ہوگیا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ لڑکا بھی سرد ہوگیا ہوگا۔ تم جاؤ، آج میں سکھ کی نیند سوؤں گا۔ (بڑھیا سے) ذرا تمباکو لے لے۔ ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہوگا لالا کو۔ ساری صاحبی نکل جائے گی۔ ہمارا کیا بگڑا! لڑکے کے مرجانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ جہاں چھ بچے چلے گئے، ایک اور گیا تو کیا ہوا! تمہارا تو راج سونا ہوگیا۔ اسی کے لیے سب کا گلا دبا دبا کر جمع کیا تھا نا! اب کیا کرو گے؟ ایک بار دیکھنے جاؤں گا، لیکن کچھ دن بعد طبیعت کا حال پوچھوں گا!"

آدمی چلا گیا۔ بھگت نے کواڑ بند کرلیے اور چلم پر تمباکو رکھ کر پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا، "اتنی رات گئے جاڑے میں کون جائے گا؟"

"ارے، دوپہر ہوتی تو بھی نہ جاتا! سواری دروازے پر لینے آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا! پنا کی صورت اب بھی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اُس بے رحم اور سنگ دل نے اُسے نگاہ اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہیں بچے گا! خوب جانتا تھا۔ چڈھا بھگوان نہیں تھے کہ اُن کے ایک نظر دیکھ لینے سے امرت برس پڑتا...... نہیں، محض دل کا وہم تھا۔ ذرا تسلی ہوجاتی، بس اسی لیے اُس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی روز جاؤں گا اور پوچھوں گا، کیوں صاحب! کہیے، کیسے رنگ ہیں؟ دنیا برا کہے گی، کہے، کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہیں، بڑوں میں کوئی خامی نہیں ہوتی، دیوتا ہوتے ہیں!"

بھگت کے لیے زندگی میں یہ اوّلین موقع تھا کہ ایسی خبر پا کر وہ خاموش بیٹھا رہا ہو۔ اسی برس کی زندگی میں ایسا کبھی نہ ہوا کہ سانپ کی خبر پا کر وہ دوڑا نہ گیا ہو۔ پوہ ماگھ کی اندھیری رات، چیت بیساکھ کی دھوپ اور لُو، ساون بھادوں کے سیلاب زدہ ندی نالے، کسی کی اُس نے پروا نہ کی تھی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا، بے لوث اور بے مدعا...... لینے دینے کا جذبہ کبھی دل میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ ایسا کام ہی نہ تھا۔ زندگی کی قیمت کون دے سکتا تھا! یہ ایک نیک کام تھا۔ صدہایوں آدمیوں کو اُس کے منتروں نے زندگی عطا کی تھی، لیکن آج وہ گھر سے قدم نہیں نکال سکا۔ یہ اطلاع پا کر بھی سونے کے لیے جا رہا تھا۔

بڑھیا نے کہا، "تمباکو انگیٹھی کے قریب رکھی ہوئی ہے۔ اُس کے بھی آج اڑھائی پیسے ہوگئے ہیں۔ دیتی ہی نہ تھی۔"

بڑھیا یہ کہہ کر لیٹ گئی۔ بوڑھے نے کپی گل کی۔ کچھ دیر کھڑا رہا، پھر بیٹھ گیا، آخر میں لیٹ گیا، لیکن وہ خبر اُس کے سینے پر ایک بوجھ بن کر موجود تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہے، جیسے تمام کپڑے گیلے ہوگئے ہیں، یا پاؤں میں کیچڑ چمٹ گیا ہے...... جیسے کوئی اُس کے دل میں بیٹھا اُسے گھر سے نکلنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ بڑھیا تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے باتیں کرتے کرتے سوتے ہیں، اور ذرا سی آہٹ پا کر ہی جاگ اُٹھتے ہیں...... تب بھگت اُٹھا، اپنی لکڑی اٹھالی، اور آہستہ سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا کی نیند کھل گئی۔ اُس نے جلدی سے پوچھا، "کہاں جاتے ہو؟"

"کہیں نہیں! دیکھتا تھا کہ کتنی رات باقی ہے۔"

"ابھی بہت رات ہے، سو جاؤ۔"

"نیند نہیں آتی۔"

"نیند کاہے کو آئے گی۔ دل تو چڈھا کے گھر کے اردگرد گھوم رہا ہے۔"

"اُس نے مجھ سے کون سی نیکی کی ہے جو میں اُس کے ہاں جاؤں۔ وہ آ کر پاؤں پر گرے تو بھی نہ

جاؤں۔"

"اٹھے تو اسی ارادے سے ہو۔"

"نہیں ری! ایسا احمق میں بھی نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے دے اُسی کے لیے پھول بوتا پھروں!"

بڑھیا پھر سوگئی۔ بھگت نے کواڑ بند کر دیے اور پھر آ کر بیٹھا، لیکن اُس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی جیسی اُپدیش سننے والوں کی باجے کی آواز کان میں پڑنے پر ہوتی ہے، آنکھ چاہے اُپدیشک ہی کی طرف ہو، لیکن کان باجے ہی پر لگے رہتے ہیں۔ دل میں بھی یہی آواز گونجتی رہتی ہے۔ بے رحم سلوک کا احساس بھگت کے لیے اُپدیشک تھا، لیکن دل اُس بد قسمت نوجوان کی طرف جھک رہا تھا جو اِس وقت مر رہا تھا...... جس کے لیے ایک ایک پل کی تاخیر بھی تباہ کن اور ہولناک ثابت ہوتی۔ اُس نے پھر کواڑ کھولے، اِس آہستگی سے کہ بڑھیا کو بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ باہر نکل آیا۔ اُس وقت گاؤں کا چوکی دار گشت لگا رہا تھا، بولا، "کیسے اُٹھے بھگت؟ آج تو بہت سردی ہے۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟"

بھگت نے کہا، "نہیں جی، جاؤں گا کہاں! دیکھتا تھا، ابھی کتنی رات باقی ہے۔ بھلا وقت کیا ہوگا؟"

"ایک بجا ہوگا اور کیا۔ ابھی تھانے سے آ رہا تھا تو دیکھا کہ ڈاکٹر چڈھا بابو کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ اُن کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہوگا! کیڑے نے چھو لیا ہے۔ چاہے مر بھی گیا ہو۔ تم چلے جاؤ تو شاید بچ جائے۔ سنا ہے، دس ہزار تک دینے کو تیار ہیں۔"

"میں تو نہ جاؤں گا، خواہ وہ دس لاکھ بھی دے۔ مجھے دس ہزار، یا دس لاکھ لے کے کرنا بھی کیا ہے! کل مر جاؤں گا، پھر کون بھوگنے والا بیٹھا ہے؟"

چوکی دار چلا گیا۔ بھگت نے پاؤں آگے بڑھائے، جیسے نشے میں انسان کا جسم اُس کی روح سے باغی ہو جاتا ہے، اُس کے بس میں نہیں رہتا...... پاؤں کہیں رکھتا ہے اور پڑتا کہیں ہے...... کہتا کچھ ہے اور زبان سے نکلتا کیا ہے۔ یہی کیفیت اُس وقت بھگت کی تھی۔ دل میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ انتقام تھا، جوابی عمل کی آگ روشن تھی، لیکن عمل دل کے قابو میں نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار کو حرکت نہیں دی، وہ ارادہ کرنے پر بھی اُسے نہیں چلا سکتا۔ اُس کے ہاتھ کانپتے ہیں، اُٹھتے ہی نہیں۔

بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا لپکا جا رہا تھا۔ احساس روکتا تھا، جذبہ اُڑائے لیے جا رہا تھا۔ خادم آقا پر فوقیت حاصل کر کے قابض تھا۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد اچانک بھگت رک گیا۔ ہنسا اور انتقام نے فرض پر غلبہ پا لیا۔ "میں یوں ہی اتنی دور چلا آیا۔ اِس سردی اور تاریکی میں بے مقصد ہی اتنی دور آ گیا۔ مجھے جان ہلکان کرنے کی کیا پڑی ہے! آرام سے سویا کیوں نہ رہا! نیند نہ آتی، نہ سہی۔ دو چار بھجن ہی گاتا، یوں ہی یہاں تک دوڑ آیا۔ چڈھا کا لڑکا رہے یا مرے، میری بلا سے، میرے ساتھ اُنہوں نے ایسا کون سا اچھا سلوک کیا تھا! میں اُن کے لیے مروں! دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں، ہزاروں جیتے ہیں، مجھے کسی کے مرنے جینے سے کیا واسطہ!"

لیکن انتقام نے ایک دوسرا رُخ اختیار کیا۔ جو ہنسا سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ وہ جھاڑ پھونک کرنے نہیں جا رہا، وہ تو دیکھے گا کہ لوگ کیا کر رہے ہیں، کس طرح پیٹتے ہیں۔ کیونکر پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ وہ دیکھے گا کہ بڑے لوگ بھی چھوٹوں کی طرح روتے ہیں؟ یا صبر کر لیتے ہیں؟ بدلہ لینے کے جذبے کو تسکین دیتا ہوا اِس طرح وہ آگے بڑھنے لگا۔

اتنے میں دو آدمی آتے دکھائی دیے۔ وہ دونوں باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ "چڈھا بابو کا گھر اُجڑ گیا۔ یہی تو ایک لڑکا تھا۔" بھگت کے کانوں میں آواز پڑی۔ اُس کی چال اُور بھی تیز ہوگئی۔ تکان کے مارے پاؤں نہ اُٹھتے تھے۔ وہ اس قدر جلد جلد قدم اٹھا رہا تھا جیسے اب منہ کے بل گر پڑے گا۔ اس طرح وہ کوئی دس منٹ تک چلا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلا نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں جل رہی تھیں، لیکن سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رونے پیٹنے کی آواز بھی نہ آتی تھی۔ بھگت کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، کہیں اُسے بہت دیر تو نہیں ہوگئی! اپنی عمر میں وہ اس قدر تیز کبھی نہ دوڑا ہوگا۔ بس، یہی معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے عقب میں موت دوڑی آ رہی ہے۔

دو بج گئے۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے، رونے

والوں میں محض آکاش کے تارے رہ گئے تھے، اور بھی رو رو کر تھک گئے تھے۔ بڑی بے تابی سے لوگ رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کسی طرح صبح ہو، اور لاش کو گنگا کی آغوش میں بہا دیا جائے!

بھگت نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔ ڈاکٹر صاحب سمجھے، کوئی مریض آیا ہوگا۔ کسی اور دن انہوں نے اس آدمی کو لوٹا دیا ہوگا...... لیکن آج وہ باہر نکل آئے، دیکھا، ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہے، کمر جھکی ہوئی، پوپلا منہ، بھنویں تک سفید ہوگئی تھیں۔ وہ لکڑی کے سہارے کھڑا کانپ رہا تھا۔ ڈاکٹر چڈھا بڑی نرمی سے بولے، "کیا ہے بھائی! آج تو ہم پر وہ مصیبت آپڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا، پھر کبھی آنا اِدھر۔ ایک مہینے تک تو شاید میں کسی مریض کو نہ دیکھ سکوں گا۔"

بھگت نے کہا۔ "سن چکا ہوں بابو جی! اسی لیے تو آیا ہوں! بھیا کہاں ہیں؟ ذرا مجھے بھی دکھا دیجیے۔ بھگوان بڑا کارساز ہے، مردے کو بھی جلا سکتا ہے۔ کون جانے اب بھی اُسے دَیا آجائے۔"

چڈھا نے بے قرار لہجے میں کہا، "چلو، دیکھ لو، لیکن تین چار گھنٹے ہو گئے...... جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ بہتیرے جھاڑنے پھونکنے والے دیکھ دیکھ کر لوٹ گئے۔"

ڈاکٹر صاحب کو امید تو کیا ہوتی! ہاں، بوڑھے پر دَیا آگئی، اندر لے گئے۔ بھگت نے لاش کو دو منٹ دیکھا۔ تب مسکرا کر بولا، "ابھی کچھ نہیں بگڑا بابو جی! وہ نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹے میں بھیا اُٹھ بیٹھیں گے۔ آپ ناحق دل چھوٹا کر رہے ہیں۔ ذرا کہاروں سے کہیے، پانی تو بھریں!"

کہاروں نے پانی بھر بھر کر کیلاش کو نہلانا شروع کیا۔ پائپ بند ہو گیا تھا، کہاروں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اس لیے مہمانوں نے احاطے کے بیرونی کنویں سے پانی بھر بھر کر انہیں دینا شروع کیا۔ مرنالنی برتن لیے پانی لا رہی تھی، بوڑھا بھگت مسکرا مسکرا کر منتر پڑھ رہا تھا، جیسے کامیابی اُس کے سامنے کھڑی ہو۔ جب وہ ایک منتر ختم کرتا تو جڑی نکال کر کیلاش کو سنگھا دیتا۔ اس طرح نہ جانے کتنے گھڑے کیلاش پر ڈالے گئے اور نہ جانے کتنی مرتبہ بھگت نے منتر پھونکا۔ آخر اُس نے جب اپنی لال لال آنکھیں کھولیں تو کیلاش کی لال لال آنکھیں بھی کھل گئیں۔ ایک ہی لمحے میں اُس نے انگڑائی لی اور پینے کے لیے پانی مانگا۔

ڈاکٹر چڈھا نے دوڑ کر نارائنی کو گلے لگا لیا۔ نارائنی دوڑ کر بھگت کے پاؤں پر گر پڑی اور مرنالنی کیلاش کے سامنے آنسوؤں سے آنکھیں پر کر کے بولی، "اب طبیعت کیسی ہے؟"

ایک ہی لمحے میں یہ خبر ہر طرف منتشر ہو گئی۔ احباب مبارک باد دینے آنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب ہر ایک کے سامنے انتہائی عقیدت سے بھگت جی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ سبھی لوگ بھگت کے درشنوں کے لیے بے تاب ہو اُٹھے، لیکن اندر جا کر دیکھا تو بھگت کا کہیں پتا نہ تھا۔ نوکروں نے کہا، "ابھی تو یہیں بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ ہم لوگ تمبا کو نکال کر دینے لگے تو نہیں لی، اپنی نکال کر چلم سلگائی۔"

یہاں تو بھگت کی چاروں طرف تلاش ہونے لگی اور اُدھر بھگت لپکا ہوا گھر جا رہا تھا کہ بڑھیا کے بیدار ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔

جب مہمان چلے گئے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے نارائنی سے کہا، "بوڑھا نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ایک چلم تمبا کو کا بھی روادار نہ ہوا۔"

نارائنی نے کہا، "میں نے تو سوچا تھا کہ اُسے کوئی بہت بڑی رقم نذر کروں گی!"

ڈاکٹر چڈھا بولے، "رات کو تو میں نے نہیں پہچانا، لیکن ذرا صاف ہونے پر میں اُسے پہچان گیا تھا۔ ایک بار یہ ایک مریض لے کر آیا تھا۔ مجھے اب یاد آتا ہے کہ میں اُس وقت گولف کھیلنے جا رہا تھا اور مریض کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج اُس روز کی بات یاد کر کے مجھے اس قدر کوفت اور خجالت محسوس ہو رہی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں اب اُسے کھوجوں گا اور اُس کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگوں گا۔ وہ کچھ لے گا نہیں، یہ میں جانتا ہوں۔ اُس کا جنم لیش کی بارش کرنے ہی کے لیے ہوا ہے۔ اُس کے خلوص نے مجھے ایسا آدرش دکھایا ہے جو زندگی بھر میری نظروں میں رہے گا۔"

☆......☆

سرحد پار سے دوسری کہانی

خوشبو

گربچن سنگھ

کچھ فیصلے انسان کرتے ہیں اور کچھ وقت، وقت کے ایک اٹل فیصلے کی کہانی

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے ایک جانی پہچانی خوش بو کا احساس ہوا۔ برسوں پہلے کی بات ہے، ایک دن یہ کمرا گجروں کی خوش بو سے مہک رہا تھا۔ وہ ملن کی پہلی رات تھی۔ اِس پلنگ پر بچھی ہوئی ریشمی چادر بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھی اور اُس پر بیٹھی ہوئی کملا عروسی لباس میں جگمگا رہی تھی۔ آج اُسی پلنگ پر کچھ خطوط اور تصویریں بکھری ہوئی تھیں، جنہیں اشوک دوپہر سے اب تک کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور پھر ایک تصویر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ تصویر پر کسی اَن جانے ہاتھ کے دستخط تھے۔ 'ریکھا۔' تصویر کے ساتھ ایک خط بھی آیا تھا، اُس میں ریکھا دیوی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ" وہ ایک نرس ہے اور اُسے بہت پسند کرتی ہے۔"

تصویر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ لڑکی خوب صورت ہے، نقش بھی اچھے ہیں، عمر بھی زیادہ نہیں، لیکن...... اشوک ایک اور خط پڑھنے لگا، جو کسی ڈاکٹرنی کی طرف سے آیا تھا۔ وہ ایک سرکاری اسپتال میں ملازم تھی۔ اُس نے بھی شادی کی خواہش ظاہر کی تھی۔

اِس طرح کے ایک نہیں، کئی خطوط تھے، جو اشوک کو دو چار دن میں باہر سے موصول ہوئے تھے۔ اُس نے ہر خط پڑھا تھا۔ جو جو تصویریں آئی تھیں، انہیں غور سے دیکھا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی صورت اُسے اپنی طرف راغب نہیں کر سکی تھی۔ سارے چہرے اَن جانے سے تھے۔ اُن میں اُس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔

'ضرورتِ رشتہ' کے کالم میں اُسے اپنی شادی کا اشتہار شائع کروانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اُس کے بہنوئی راجندر نے یہ کام خود ہی کیا تھا، کیوں کہ اشوک کی بہن اُس پر کافی دباؤ ڈال رہی تھی۔

اخبار میں شادی کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ جواب میں یہ تصویریں اور خط آئے تھے۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تصویروں میں نہیں، بلکہ اَن جانی خبیث روحوں کے درمیان گھرا بیٹھا ہے اور ایک بہت بڑا جمگھٹ کمرے میں جمع ہو گیا ہے، لیکن عجیب بات تھی، وہ دوسرے ہی لمحے تنہائی محسوس کرنے لگتا تھا۔ 'کملا تو اِتنی بُری نہیں تھی۔' اُس کے دل میں ایک اُبال سا اُٹھنے لگا تھا۔ 'بے یقینی کا طوفان مجھے اُکھاڑ کر کہیں دور پھینک دے گا، ایسا میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔'

چار برس پہلے کملا اِس گھر میں بہو بن کے آئی تھی۔ اُس بہار کی آمد سے سارے ماحول میں ایک خوش گوار کیفیت رچ گئی تھی۔ کملا حسین تھی، تعلیم یافتہ تھی، اشوک

نے خود اُسے پسند کیا تھا، اُس کے والد اگرچہ اس شادی کے حق میں نہیں تھے، لیکن مالا سے کہہ کر اُس نے اپنے والد کو بھی راضی کرلیا تھا۔ جس دن کملا اس گھر میں آئی تھی، پہلی ہی ملاقات میں اشوک نے اُس سے کہا تھا۔

"اِس گھر میں تمہارے آنے سے جو خوشی مجھے نصیب ہوئی ہے، اُسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

جواب میں کملا نے کہا تھا۔ "لیکن تمہارے پتا جی تو مجھے اس گھر میں لانے کے حق میں نہیں تھے۔"

کہو، یہ گھر تمہیں کیسا لگا؟ تمہارے گھر سے تو ہمارا گھر چھوٹا ہے۔"

"ابھی میں نے گھر دیکھا ہی کہاں ہے۔" اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

ماں بڑی خوش تھی، اُس کے اکلوتے بیٹے کی بہو آئی تھی۔ محلے کی جو بھی عورت کملا کو دیکھنے آتی، ماں بڑی شان سے اُس سے کہتی "میری بیوی دیکھنے میں جس قدر حسین ہے، اُتنی ہی خوبیوں والی بھی ہے۔ معمولی گھر کی



"یہ تم نے کس طرح جانا؟"

"تم سے کچھ چھپا تھوڑا ہی رہتا ہے۔"

"رشتے ناتے کے معاملوں میں ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ایسی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔ یہ

بیٹی نہیں ہے۔ بہت بڑے وکیل کی لڑکی ہے، کافی پڑھی لکھی ہے۔ اشوک کی اپنی پسند ہے۔"

اشوک پچھلی باتیں یاد کرتے کرتے پلنگ پر سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ ایک سگریٹ سلگایا

اور اُس کا کش لیتے ہوئے باہر پائیں باغ میں جھانکنے لگا۔ ہلکی خوش گوار ہوا بہہ رہی تھی۔ اُس میں سمندری ہواؤں جیسی نمی نہیں تھی۔ کیلے کے پتے آہستہ آہستہ ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ جن پر اوس ملی چاندنی چمک رہی تھی۔

کملا کو بھی شاید اس کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر باہر جھانکنا اچھا لگا کرتا تھا۔ وہ اِس جگہ کھڑی کافی دیر تک کچھ سوچتی رہتی تھی، کھوئی کھوئی نگاہوں سے جیسے باہر کچھ تلاش کر رہی ہو۔

اشوک کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ کملا کی طبیعت اِس گھر میں نہیں لگتی، اور اُس کے مزاج سے میل کھانے والا آدمی اِس گھر میں نہیں ہے۔ وہ اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا، لیکن پھر اُسے مایوسی ہی ہوتی اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ میں تو کملا کے لیے اِتنا کچھ کر رہا ہوں۔ پیار، محبت، عزت اور خوشی سب اُس کے قدموں میں ڈھیر کرتا ہوں، لیکن اس کے بدلے میں اُس کی طرف سے مجھے کیا ملتا ہے؟'

ایک دن ماں کہنے لگی۔ ''ارے بیٹا اشوک! کوئی رسوئی بنانے والا لے آ، بہو کو میرے ہاتھ کا بنا کھانا اچھا نہیں لگتا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا اماں؟''

''ارے میں سب سمجھتی ہوں! وہ پیٹ بھر کبھی کھاتی ہی نہیں۔ اسی لیے چہرہ اس قدر اُترا اُترا سا دکھائی دیتا ہے۔''

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں۔'' اس نے ماں کی بات ٹال دی، لیکن کچھ تو ایسا تھا، جو اُداسی کی پرت بن کر کملا کے چہرے پر چھا جاتا تھا۔ یہی جاننے کے لیے ایک دن اُس نے کملا سے کہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟ جواب دو گی؟''

''پوچھو۔''

''کملا! کیا یہاں تمہارا دل نہیں لگتا؟''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔''

''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے گھر والے مجھ پر شک کرتے ہیں۔''

''اِس کی بھی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟''

''ہو گی۔ وہی تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''یہ سب تمہارا وہم ہے۔''

اشوک نے سوچا۔ 'کبھی کبھی انسان بے کاری میں کچھ سوچ کر اُس کے بارے میں اپنا فیصلہ بھی دے دیتا ہے، ٹھیک وہی حال کملا کا ہے۔ کملا اپنے آپ کو گھر کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے سے معذور ہے۔'

اشوک کی بڑی بہن کچھ دن کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔ اُسے کملا سے ملنے کا چاؤ تھا۔ وہ شادی کے موقع پر زچگی کے مرحلے سے گزرنے کی وجہ سے شریک ہی نہیں ہو سکی تھی اور اب جو اُس نے کملا کو دیکھا تو خوشی سے کھل اٹھی۔

''واہ، میری بھابی تو پری ہے! جیسا سنا تھا، ویسا ہی روپ ہے۔''

اشوک نے اپنی بڑی بہن سے کہا تھا۔

''دیدی! تمہاری بھابی دیکھنے میں جس قدر نازک ہے، حقیقت میں اُتنی ہی سخت ہے۔ کملا اِس گھر میں خوش نہیں ہے۔''

''وجہ؟''

''وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ماں بھی یہی کہتی ہے اشوک! مجھے بڑا دکھ ہوا سن کر۔''

''کملا کو جانے کس بات کا غرور ہے۔ وہ یہاں سب سے ناخوش ہے۔''

بڑی بہن کی یہ باتیں سن کر اسے اور بھی دکھ ہوا تھا۔

اشوک کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر پھر پلنگ پر آ گیا۔ نوکر کمرے میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مالک! کھانا لگاؤں؟''

بے دلی سے کچھ کھا چکنے کے بعد اشوک نے پلنگ پر بکھرے ہوئے خط اور تصویریں سمیٹیں اور ایک میز پر رکھ دیں، پھر اُس نے کپڑے بدلے اور پائیں باغ میں نکل آیا۔ وہ اُسی درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا، جہاں بے شمار پھول جھڑ کر نیچے بکھرے ہوئے تھے۔ جھڑے ہوئے پھولوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ زندگی کی شاخ

سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ٹھیک اِسی طرح، ایک دن کملا اُس کی زندگی کی شاخ سے ٹوٹ گئی تھی۔ اُس کے اور کملا کے درمیان کی کھائی بڑھتی ہی گئی۔ گھر کے ماحول سے وہ ناخوش تھی اور گھر والے اُس سے۔ ایک دن اُس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے والدین کے ہاں جانا چاہتی ہے۔

ماں اُن دنوں بیمار تھی۔ اشوک نے کہا تھا کہ ماں کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر جانا ٹھیک نہیں ہے، لیکن وہ جانے کی ضد پر اَڑی رہی۔ آخر میں اشوک نے دکھی ہو کر کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے! اگر تم گئیں تو پھر لوٹ کر اِس گھر میں نہیں آسکو گی۔“

”مجھے اِس کا افسوس نہیں ہوگا۔“

”یہ تو سوچو، لوگ کیا کہیں گے؟“

”کوئی کچھ کہے، مجھے اِس کی پروا نہیں۔“

کملا چلی گئی تھی، چھوڑ گئی تھی، صرف ایک مہک...... وہ بیلے کے پھولوں کے گجرے والی خوش بو۔ اُسے جانے کی خوشی تھی، گھر میں سب دکھی تھے۔ اشوک کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد نے اُس کے اِس طرح گھر سے چلے جانے میں اپنی زبردست ہتک سمجھی تھی۔ والد نے کہا تھا۔ ”اب جیتے جی میں اُسے اِس گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔“

کاش، کملا وقت کی نزاکت سمجھتی! اُس نے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بات یہیں ختم ہو جاتی تو ٹھیک تھا، لیکن کسی زہریلی بیل کی طرح بات بڑھتی ہی گئی تھی۔ کملا کے وکیل باپ نے اشوک کے نام ایک نوٹس بھیجا، جس میں درج تھا کہ کملا اِس شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں۔ اُس کا اب اِس گھر میں گزارا مشکل ہے، اِس لیے وہ طلاق لینا چاہتی ہے۔ یہ بہتر ہوگا، اگر اشوک اور کملا سیدھے سادے ڈھنگ سے کچہری میں یہ معاملہ طے کرلیں، ورنہ کملا کی طرف سے یک طرفہ کارروائی ہو جائے گی، اور اِس سے اشوک کی زیادہ بدنامی ہوگی۔

اشوک کے پتا بھی تاؤ میں آگئے۔ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے حق میں تھے، لیکن اشوک راضی نہیں ہوا۔ اُسے اِن باتوں کا اِس قدر دکھ ہوا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں بھاگ جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُن سب کی نظروں سے دور، جو اُس سے واقف تھے۔ وہ خود کو بزدل محسوس کر رہا تھا۔ افسوس، وہ ایک کملا کو بس میں نہیں کر سکا تھا! وہ بہت دکھی تھا۔ کملا کے پتا کے نوٹس کا اُن کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا تھا۔ سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

کچھ ہی دن بعد اشوک کی ماں کا انتقال ہوگیا، اور اُس کے دو ڈھائی مہینے بعد پتا جی بھی سورگ باش ہوگئے۔ اب رہ گیا تھا یہ گھر، پرانا نوکر، یہ دنیا اور اِس کی کچھ یادیں۔

گلاب کے پھول آج بھی گھر کے پائیں باغ میں کھلتے ہیں، آج بھی پرندوں کا غول آتا ہے اور یہاں کی پرسکون فضا میں چہچہاتا رہتا ہے۔ آج بھی گھر کے ہر در و دیوار سے کچھ جانی پہچانی آوازوں کی گونج سنائی دیتی ہے، لیکن دکھائی کوئی نہیں دیتا۔

اگلی صبح وہ کافی دیر سے اٹھا۔ اُس روز دفتر بند تھا، اِس لیے اُسے کوئی جلدی نہیں تھی، لیکن جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ تازگی اور فرحت کے بجائے سستی سی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی لیٹا رہا، پھر اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

نو بجے کے قریب وہ صبح کا ناشتا کرنے بیٹھا ہی تھا کہ بیٹھک میں سے کسی بچے کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز اور پھر اُسے چپ کراتی ہوئی کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

اشوک نے کہا۔ ”دیکھو تو برجو کاکا! باہر کون ہے؟“

برجو بیٹھک کی طرف گیا اور فوراً ہی حیران پریشان سا واپس لوٹ آیا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ آہستگی سے اُس کے کانوں میں پھسپھسایا۔

”مالک! بہو آئی ہے۔“

”بہو؟ کون سی بہو؟“ چائے کی پیالی اشوک کے ہونٹوں تک جاتے جاتے رک سی گئی۔

”اپنی بہو، کملا رانی!“

”کملا!“ اشوک نے منہ ہی منہ میں لفظ دہرایا۔

”وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہی ہے۔“

”میرے بارے میں؟“ اشوک کو یقین نہیں آ رہا

تھا۔

'کملا یہاں کیسے آ سکتی ہے! ضرور بدجو کو دھوکا ہوا ہے۔'

بدجو بھی بیٹھک میں آ گیا، اور بولا۔ ''بہو رانی! اچھی تو ہو؟''

''اچھی ہوں کاکا۔'' کملا نے جواب دیا۔ ''تم سب اچھے ہو نا؟''

''ہاں بہو رانی! مالک اور مالکن تو بھگوان کو پیارے ہو گئے......اور......''

''بدجو!'' اشوک درمیان میں بول پڑا۔ ''اِن سے پوچھو، یہ کس لیے آئی ہیں؟''

''امانت سونپنے۔'' کملا نے کہا۔

بدجو کمرے سے باہر چلا گیا۔

''امانت!'' اشوک کی نظریں اُٹھیں اور اُس نے دیکھا۔ وہی روپ، وہی آنکھیں، کل کی کملا اور آج کی کملا میں کوئی فرق نہیں ہے۔

''ہاں، امانت......تین برس سے اِسے پال رہی ہوں۔ ''پہچان لو!'' اُس نے گود کے بچے کو فرش پر چھوڑ دیا۔

بچہ رفتہ رفتہ، جھجکتا جھجکتا اشوک کی طرف آنے لگا۔ وہ اُسے غور سے دیکھنے لگا، بالکل اُس کے جیسا چہرہ ہے، ویسی ہی آنکھیں، ویسا ہی نقشہ۔ بچہ اُس کے قریب آ گیا، اور معصوم نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا یہ صرف میرا ہے؟ تم اِس کی کچھ نہیں لگتیں کیا؟''

''لگتی ہوں، لیکن میرا اِس پر حق نہیں ہے۔''

اشوک معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''جب تم نے مجھے اپنا نہیں سمجھا، میرا حق مجھے نہیں دیا، تو آج یہ بچہ، جسے تم نے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے، اِس پر میرا حق سمجھ کر مجھے کیسے سونپنے آئی ہو!''

''شاید میں اِس کی وجہ نہ بتا سکوں، لیکن ایک بات ہے، اور وہ یہ کہ اب میں اِسے سنبھالنے سے معذور ہوں۔''

''کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''

''پتا جی اب اِس دنیا میں نہیں رہے۔ میں نے نوکری کر لی ہے، اور میں......'' وہ کہتے کہتے رُک سی گئی۔

اشوک نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اُس کا جی چاہا کہ فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر چلا جائے، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا، پھر اسے کہنا ہی پڑا۔

''کچھ کہہ رہی تھیں نا! رُک کیوں گئیں؟''

''اور کچھ کہنے کو نہیں ہے۔ تم بچہ اپنے پاس رکھو۔ یہ میری التجا ہے!''

''اگر میں انکار کر دوں تو؟''

کملا کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔

اشوک بچے کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی معصوم آنکھوں میں پیار تھا، بھولا پن تھا، ماں یہی روپ دیکھنے کے لیے ترسا کرتی تھی۔ وہ ایک ایسا ہی ننھا بچہ گود میں کھلانا چاہتی تھی۔

وہ کملا سے مخاطب ہوا ''آج میں پہلی مرتبہ تمہارے چہرے پر ندامت کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ کملا مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی؟ کیوں روٹھ گئی تھی مجھ سے؟ کیوں اُس نے ماں اور بابو جی کی موت کی خبر سُن کر بھی اِس گھر میں قدم نہیں رکھے؟ اُس نے ایک بچے کو جنم دیا، وہ ماں بن گئی، لیکن اُس نے ہونے والے بچے کے باپ کی ضرورت نہیں سمجھی، اُس کی بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔''

کملا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا یہ سوال آج بھی اپنی جگہ ہے؟''

اشوک کی نظریں اُس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ ''آج تک یہ بات میں نے تم سے نہیں پوچھی تھی۔ آج تمہیں اِس کا جواب دینا ہی پڑے گا، پھر شاید میں آگے کچھ سوچ سکوں۔''

''تو کیا تمہیں اِس بچے کو قبول کرنے سے انکار ہے؟''

''کیا تم مجھے صرف اِسے ہی سونپنے آئی ہو؟''

''ہاں!''

''اوہ!'' اشوک نے محسوس کیا، جیسے کسی غیبی طاقت نے اسے اوپر اُچھال کر نیچے پھینک دیا ہو۔ وہ قدرے تلخی سے بولا۔ ''مجھے تو تعجب ہے کہ تم نے اب تک اِس بچے کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ لوگ اِس کے باپ کے بارے

سر والٹر ریلے

29 اکتوبر 1618ء کو ٹاور آف لندن میں سر والٹر ریلے کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ سر والٹر ریلے ایک اچھا جہاز راں، سیاح، انشاء پرداز، شاعر اور تاریخ نگار تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے پورے یورپ کو تمباکو اور آلو سے متعارف کرایا۔ اس کی کتاب ہسٹری آف دی ورلڈ بہترین تاریخی کتاب شمار کی جاتی ہے اور اس کی نظمیں اسے صف اول کے شعراء میں جگہ دلواتی ہیں۔ 1616ء میں وہ سونے کی تلاش میں ایک مہم میں وینز ویلا گیا تھا۔ اس سفر میں اس کا اسپین کے جہازوں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وطن واپسی پر اسپین کے دباؤ پر جیمز اول نے اس پر مقدمہ چلوا کر اسے موت کی سزا دے دی۔

میں تم سے ضرور کچھ پوچھتے ہوں گے، تم کوئی جواب بھی دیتی ہو گی۔ کیا کہا کرتی تھیں، مجھے بتا سکو گی؟''

''میں کسی سے کیا چھپاتی؟ سبھی جانتے ہیں کہ یہ تمہارا بیٹا ہے۔''

''اس کے علاوہ اور بھی تو کچھ پوچھتے ہوں گے؟''

جواب میں اُس نے دیکھا کہ کملا کی مغرور آنکھوں میں مایوسی اور معذرت کے آنسو تھے۔

چند لمحے اُن کے درمیان خاموشی حائل رہی، پھر اشوک کہنے لگا۔ ''تم مجھ سے کوئی بدلہ لے رہی ہو؟''

''کیسا بدلہ؟'' کچھ چونک کر کملا نے پوچھا۔

''تم یہ جانتی ہو کہ میں اِس بچے کو نہیں پالوں گا، ورنہ یہ میری دوسری شکست ہو گی۔ ہے نا؟''

''نہیں، اگر تم اِسے نہیں سنبھالو گے تو کوئی دوسرا تو سنبھالے گا ہی۔''

''اور کون ہے اِس گھر میں، جو اِسے سنبھالے گا؟''

''شادی کے لیے تم نے اشتہار دے ہی رکھا ہے۔ میری جان پہچان کی ایک عورت بھی امیدواروں میں سے ہے۔ ویسے وہی اِس گھر میں آئے گی، اِسے سنبھال لے گی۔''

''کیا تم اسی بھروسے پر اِسے لوٹانے آئی ہو؟''

''تمہارا بچہ ہے۔ کیا یہ تمہاری شفقت اور محبت سے محروم رہے گا؟''

''ہاں، یہ میرا بچہ ہے۔ میں اِسے پیار دوں گا، لیکن تم اِس کی ماں ہو، کیا تم اِس سے الگ رہ سکو گی؟''

کملا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔

اشوک کہتا رہا۔ ''ایک دن تم غصے میں آ کر اپنی مرضی سے چلی گئی تھیں، اور میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید میں بزدل تھا، تمہیں روک نہیں سکا تھا، لیکن اگر آج میں تمہیں اِس گھر میں روک لوں اور باہر قدم نہ رکھنے دوں تو تم کیا کرو گی؟''

کملا ایک ٹک اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''اگر اُسی وقت تم نے ایسی جرأت سے کام لیا ہوتا تو میں کیا کر سکتی تھی۔''

چند لمحے بعد وہ بولی۔ ''میں غلطی پر نہیں تھی، مجھے روکا کیوں نہیں؟ میں چلی ہی گئی تھی تو میرے جینے مرنے کی خبر تو لی ہوتی۔'' اشوک خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اُسے اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اِس کی وجہ ڈھونڈ نکالنا اُتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا کوئی بھرتا ہوا زخم کرید کر اُس کی گہرائی دیکھنا۔ وہ صوفے پر سے اٹھا اور بچے کو کملا کی گود میں دیتے ہوئے بولا۔ ''میں اِسے تمہیں سونپتا ہوں۔ تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا اور اِس بچے کا خرچ تمہیں بھیجتا رہوں گا، اور اگر اِسے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتیں، اور اِسے یہیں چھوڑنا چاہتی ہو تو تمہیں بھی یہیں رہنا پڑے گا۔''

اتنا کہہ کر وہ بیٹھک سے اندر کمرے میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ برجو دروازے کے قریب کھڑا، انگوٹھے سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

''برجو کاکا!'' اشوک آہستہ سے پھسپھسایا۔ ''بہو کو سمجھاؤ، اور اُسے جانے نہ دو۔'' اُس کی نظریں ماں کی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ ''ماں! تم بھی پگلی کملا کو معاف کر دو۔''

☆☆☆......☆☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن۔" آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر:3

گزشتہ قسط کا خلاصہ:

مہاراجہ رام ناتھ بنیادی طور پر رنگین طبیعت رکھتے تھے۔ مہاراجہ کی تیس سالہ خوب صورت بیوی ماریہ سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ مہاراجہ شکنتلا کے معاملے میں جان بوجھ کر احتیاط برت رہے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اتنی جلدی شکنتلا کے سامنے اپنی کمزور خواہش کا اظہار کریں۔ دوسری طرف شکنتلا جو ابھی ناگ کے غم سے باہر نہ آئی تھی، اس کی بھی خواہش تھی کہ مہاراجہ کو خود سے دور رکھ کر حالات کا جائزہ لے۔ دلاور ایک عام سا دکاندار تھا، غزالہ اس کی خوش شکل بیوی تھی اور نوشابہ ان کی پانچ سالہ اکلوتی اولاد تھی۔ تیز طوفانی بارش میں دلاور دھرم پور سے واپس گھر آرہا تھا کہ اسے کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔ وہ آس پاس کا بغور جائزہ لیتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ جس چٹان کی اوٹ میں وہ کھڑا ہے۔ یہ غار کا دہانہ ہے۔ وہ غار کے اندر داخل ہوتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہاں شادی کی کوئی تقریب ہے۔ اچانک اس کے پاؤں کسی نرم چیز پر پڑتے ہیں اور وہ نیچے گر جاتا ہے، تب اس کو بہت سارے بچوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ گھبرا کر دوڑتا ہوا غار سے باہر آتا ہے اور گرتا پڑتا اپنے گھر پہنچتا ہے۔ جہاں اس کے گھر کے صحن میں محلے کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس کی بیوی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عورتیں اسے بتاتی ہیں کہ نوشابہ پر اچانک کوئی دورہ پڑ گیا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں مڑنا شروع ہو گئے تھے اور آخرکار اس نے دم توڑ دیا تھا۔ دلاور سمجھ جاتا ہے کہ اُس غار پر جنات کا قبضہ ہے۔ ان کے بچے اس کے پاؤں کے نیچے کچلے گئے تو انتقامی کارروائی کے طور پر اس کی معصوم بچی سے بدلہ لیا گیا۔ مہاراجہ رام ناتھ سے ملاقات کے لیے شکنتلا کو تیار کیا جاتا ہے۔ آئینے میں شکنتلا خود کو ناگن کے اصل روپ میں دیکھتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اسے آئینے سے بچ کر رہنا ہوگا۔ بال بال موتی پروئے حسین شکنتلا کو دیکھ کر مہاراج اپنے حواس کھونے لگتے ہیں۔ شکنتلا سمجھ جاتی ہے کہ مہاراج اس کے حسن کے جادو کا شکار ہو چکے ہیں وہ ان سے کہتی ہے کہ وہ اسے اپنی مہارانی بنا لیں۔ راجہ رام ناتھ اس کے ناز و انداز کے زیر اثر کہتے ہیں کہ ہم کل ہی بھرے دربار میں تمہیں اپنی رانی بنانے کا اعلان کریں گے اور شکنتلا کو بااختیار زندگی گزارنے کا خواب پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اگلے روز دربار میں مہاراج رام ناتھ شکنتلا سے دوسری شادی کا اعلان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آج اسی وقت شادی کی رسوم ادا کی جائیں۔ رام ناتھ اور شکنتلا کے سات



پھیرے آگ کے گرد مکمل ہو جاتے ہیں۔ شکنتلا مہارانی ماریہ کی خاص کنیز کوشیلیا کو کنیزوں کی سرداری سے برطرف کر دیتی ہے اور پریہ کو کنیز عالیہ بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف ماریہ سامری جادوگر سے شکنتلا کے متعلق پوچھتی ہے، لیکن سامری جادوگر اسے کہتا ہے کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے گرو کی روح سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ مہارانی اسے جلد از جلد شکنتلا سے نجات دلانے کا کہتی ہے۔ سامری جادوگر ماریہ سے شکنتلا کو شاہی محل سے نکالنے کا وعدہ کرتا ہے۔ کوشیلیا روز صبح اسے محل کے تمام واقعات آ کر بتاتی تھی، لیکن اس روز وہ غائب تھی۔ مہارانی ماریہ اس کے نہ آنے پر پریشان ہوتی ہے اور سوچتی ہے کہ کہیں شکنتلا کو پتا تو نہیں چل گیا کہ کوشیلیا مہارانی کی جاسوسہ ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

''اپنے کمرے میں، میں اگر ان پر تشدد کروں گی تو بہت شور شرابہ کریں گی اور بہت مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی ایسا تہہ خانہ مل جائے جہاں ہم اپنے دشمنوں کو رکھا کریں...... لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے یہاں آئے ہوئے اور آپ بھی ابھی نئی ہیں، ہمیں تو ایسی کسی جگہ کا ابھی علم نہیں۔''

''تو کیا ہوا...... ہم لوگ اگر نئے ہیں تو کوشیلیا اور سادھنا تو بہت پرانی ہوں گی یہاں، خصوصاً کوشیلیا کو ایسی کسی خفیہ جگہ کا علم ضرور ہوگا۔ اسی سے پوچھو......''

''بہت خوب...... مہارانی جی! آپ کی عقل اپرم پار ہے، آپ واقعی مہارانی بننے کی اہل تھیں......'' پریہ کا لہجہ خوشامدی تھا۔

''تو پھر جاؤ اور ہو جاؤ شروع! کسی میں اتنی قوت نہیں جو تمہیں کچھ کہہ سکے۔''

''لیکن مہارانی جی! اگر ان باتوں کی بھنک مہاراجہ رام ناتھ کو ہو گئی تو......؟''

''تو کیا ہوگا۔'' شکنتلا زلفوں کو جھٹک کر بولی۔ ''شکنتلا کے حسن کا جادو مہاراج کو اپنے سحر میں لے چکا ہے۔ ہمارے حسین شریر نے مہاراجہ کو دیوانہ بنا رکھا ہے، تو اتنی چھوٹی باتوں کی چنتا نہ کیا کر۔'' پھر وہ مستی بھری انگڑائی لے کر بولی۔ ''پرنتو مہاراجہ کا بوڑھا کھوسٹ شریر ہمارے جوان من کی پیاس بجھانے سے قاصر ہے۔ ہمارے لیے کسی کڑیل خوب صورت نوجوان کا بندوبست بھی تمہیں کرنا ہوگا۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔'' شکنتلا نے آخری فقرہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسے نہ سمجھوں گی...... مہارانی جی آخر کو آپ کی داسی ہوں۔''

''اب تم جا سکتی ہو......'' مہارانی اپنے نفیس پلنگ پر دراز ہو کر بولی...... ''جو حکم میری آقا'' پریہ نے جھک کر فرشی سلام کیا اور الٹے قدموں چلتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔

☆......☆

شکنتلا کے کمرے سے نکل کر پریہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔ راستے میں اس نے سوچ لیا تھا کہ شکنتلا کو خوش کرنے، اس کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے، کنیز عالیہ کا عہدہ پکا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ماریہ کی جاسوسی کرنے والے غلام اور کنیزیں گرفتار کر کے شکنتلا کو پیش کر دیے جائیں۔ وہ سیدھی کال کوٹھڑی پہنچی جو اس کے کمرے کے عقب میں تھی۔ اس نے دیکھا کہ کوشیلیا اور سادھنا کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور نرملا، پونم اور سوشیلا ان کے پاس کھڑی تھیں۔ ''کوشیلیا کو کھول دو۔'' پریہ حکم دے کر تخت پر بیٹھ گئی۔ کوشیلیا رحم طلب نظروں سے دیکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ''دیکھو کوشیلیا تم میری مار سے واقف ہو چکی ہو۔'' پریہ اپنی چوٹیوں سے کھیلتی ہوئی شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''لہٰذا میرے دونوں سوالوں کا جواب فوراً اور درست دینا۔ ورنہ...... یہ سمجھ لو کہ مہارانی کی مجھے مکمل آشیرباد حاصل ہے کہ جس کے ساتھ جو چاہوں سلوک کروں۔''

''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ وہ خفیہ کمرہ کون سا ہے جہاں تکلیف سے چلانے کی آواز باہر نہ جاتی ہو۔ پریہ کا سوال سن کر کوشیلیا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اور میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کے نام بتاؤ جو تمہارے سمیت

رانی ماریہ کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔"

"یہاں سے دو کمرے اندر جا کر اس کے فرش کے نیچے ایک خفیہ کمرہ ہے۔ کوشیلیا نے فرفر بتا دیا۔ شاباش اور اب دوسرے سوال کا جواب نرملا اور پونم کو بتانا اور سنو نرملا۔" "جی کنیز عالیہ" "جن جن کے یہ نام بتائے، ان کو لکھ لو اور جب میں حکم دوں، ان کو گرفتار کر کے لے آنا۔"

"جو حکم کنیز عالیہ۔" پونم نے سر جھکا دیا۔

"اس کو باہر لے جا کر نام وغیرہ لکھ لو اور پھر اس کو کھانے پینے کے لیے کچھ دے دو اور تھوڑا آرام کرنے دو۔ بے چاری کل سے پریہ کا عذاب سہ رہی ہے۔" کوشیلیا کو دیکھ کر پریہ سفاک لہجے میں مسکرا کر بولی اور پھر نرملا سے مخاطب ہوئی۔ "سادھنا کو کھول دو۔" حکم کی تعمیل ہوئی۔ کل جو حشر میں نے کوشیلیا کا کیا تھا، وہ اس محل کی ہر کنیز نے دیکھا۔ پر تو تو اس سے واقف نہیں، لہٰذا تجھے اس سزا کی ایک جھلک دکھائی ہے۔" "نہیں کنیز عالیہ۔ میں وہ سب کچھ، جو آپ پوچھیں گی، سچ سچ بتا دوں گی۔" سادھنا لرزنے لگی......

"بہت اچھے...... باتوں کی بھتنی لگتی ہو۔" پریہ مسکرانے لگی۔

☆......☆

راج محل کی چار دیواری ہزاروں ایکڑ پر مشتمل تھی۔ مرکزی محل کے علاوہ بے شمار انتظامی اور رہائشی عمارتیں تھیں اور اس کے ساتھ بے شمار جگہ ویران اور غیر آباد بھی تھی۔ ایسے ہی ایک الگ تھلگ کونے کھدرے میں جہاں گھنے درختوں کے جھنڈ تھے اور نامکمل عمارت کے کھنڈرات بھی جو شاید شاہی محل کے کسی شعبے کے لیے تعمیر کی جا رہی تھی، لیکن بوجوہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور یہ پھر کسی طرح کوشیلیا یا ماریہ کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ انہوں نے یہاں اپنا عقوبت خانہ بنا لیا۔ اس طرف ویسے ہی کوئی نہیں آتا تھا، لیکن احتیاط کے تقاضے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے گھنے درختوں کے شروع ہونے سے کافی پہلے ہی خاردار باڑ لگا



کر اس طرف جانے کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ وہاں ایک فوجی چوکی بھی موجود تھی، جہاں مامور پہرے دار مخصوص حد سے آگے کسی کو نہ جانے دیتے تھے۔ رانی کا حکم ہو تو کسی میں جرأت ہے کہ آگے جا سکے...... ایک پکی روش بھی اس بوسیدہ عمارت تک جاتی تھی۔ یوں گھنے درختوں کے بیچ پوشیدہ اس عمارت کے گرد دور دور تک کوئی انسان نہ تھا۔ اس عمارت کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ ارد گرد کمرے اور درمیان میں صحن تھا، جو کہ کچا تھا۔ صحن میں چند درخت اور ایک تالاب تھا، جس میں تھوڑا سا گندہ پانی بھی جمع تھا، جس پر سبز کائی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ کمروں کی تعداد چھ تھی، جن میں سے تین تو بغیر چھت کے بالکل بے کار تھے، جب کہ ایک میں دو چار پائیاں اور کاٹھ کباڑ کے ساتھ کچھ کنستر رکھے تھے، جن میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ پانچویں کمرے کو قید خانے کا انداز دیا گیا تھا۔ آدھے کمرے میں چاروں طرف مضبوط سلاخیں لگائی گئی تھیں، جب کہ چھٹا کمرہ انتہائی آراستہ و پیراستہ تھا۔ کوشلیا جب یہاں آتی تو یہ کمرہ اس کے تصرّف میں رہتا یا کبھی کبھار رانی ماریہ یہاں آتی تو آرام کرتی۔ اسی کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ تشدد کے کئی آلات لٹکے ہوئے تھے۔ یہ ساری معلومات پریہ کو سادھنا اور پھر کوشلیا سے حاصل ہوئی تھیں، جن کی خبر پریہ نے فوراً شکنتلا کو کر دی تھی اور پھر یہاں آ کر پریہ نے دیکھا کہ سلاخوں والے کمرے میں تین بیٹھے کٹے غلاموں کے ساتھ ایک خوش شکل لڑکی بندھی تھی اور صحن میں تین آدمی، جن کے پاؤں میں لوہے کے شکنجے تھے اور زنجیریں مختلف درختوں کے ساتھ بندھی تھیں، پڑے تھے۔ ان کی شکستہ حالت بتا رہی تھی کہ وہ سالوں سے یہیں بندھے ہوئے ہیں۔ پریہ نے ہاتھ میں پکڑی خوب صورت لچکدار چھڑی جب زور سے گھما کر کوشلیا کے منہ پر مار کر ان قیدیوں کے بارے میں سچ سچ بتانے کو کہا تو کوشلیا نے بتایا۔

”جب رانی ماریہ کی شادی رام ناتھ کے ساتھ نہیں ہوئی تھی تو اس وقت بھی میں اس کی لاڈلی کنیز تھی۔ ان دنوں میں ایک دفعہ میں بازار سے گزر رہی تھی تو چند اوباش نوجوانوں نے مجھ سے چھیڑ خانی کی اور مجھے اغوا کر کے زیادتی کی۔ جب ماریہ کی شادی رام ناتھ سے ہو گئی اور میں شاہی محل کی کنیز خاص بن گئی، تو میں نے ان کو اغوا کروالیا اور یہاں لے آئی۔ تب سے اب تک یہ یہاں قید ہیں۔ یہ جوہڑ کا گندہ پانی پیتے ہیں اور دونوں کے بعد تھوڑی سی خوراک انہیں دے دی جاتی ہے تاکہ زندہ رہیں اور کنیز عالیہ سادھنا نے اپنی اہمیت بنانے کے لیے دخل اندازی کی۔ اس عرصے میں کوشلیا جب بھی یہاں آتی تھی، ان کو کوڑے سے خوب مارتی تھی۔ یہ سب کچھ بارہ سالوں سے ہو رہا ہے۔“

یہ سب تمام انکشافات سن کر پریہ نے کوشلیا اور سادھنا کو ایک درخت کے ساتھ الٹا لٹکانے کا حکم دے دیا اور خود حواری کنیزوں کے جلو میں بیٹھ گئی اور تمام کنیزوں، غلاموں اور محل کے کارندوں، جن کی تعداد درجن بھر تھی، کو گرفتار کر کے لانے کا حکم دیا۔ اب پریہ نے تینوں قیدیوں کو کھلوا دیا۔ تینوں کے سر، منہ جھاڑ جھنکار تھے۔ بے تحاشہ اور بے ترتیب بڑھے ہوئے بال، انتہائی شکستہ اور قابل رحم حالت کہ پریہ جیسی سنگدل کو بھی ان پر ترس آ گیا اور اس نے انہیں آزاد کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ ادھر سلاخوں والے کمرے میں بند تین بیٹھے کٹے غلاموں اور کنیز کو باہر نکالا گیا۔ پریہ نے کنیز کو پہچان لیا، یہ چمپا تھی، جسے کوشلیا نے کسی بات پر ناراض ہو کر تین غلاموں کے ساتھ اس کمرے میں قید کر دیا تھا۔ اس کی حالت بھی قابل رحم ہو چکی تھی۔ غلاموں نے اسے جی بھر کر نوچا کھسوٹا تھا۔ اب پریہ نے جا کر شکنتلا کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ تمام جاسوسوں کی گرفتاری کی خبر سن کر شکنتلا خوش ہو گئی اور بولی۔ ”پریہ اب محل میں ماریہ کا عمل دخل تقریباً ختم ہو چکا ہے، لیکن میرا اس جگہ تک جانا مناسب نہیں، کیوں کہ پھر یہ خبر پھیل جائے گی اور رازداری نہ رہے گی۔ تم ایسا کرو کہ کوشلیا اور سادھنا کے علاوہ تمام جاسوسوں کو فی الحال وہیں قید رکھو، اس حد تک خوف زدہ کر دو کہ وہ کہیں زبان نہ کھولیں۔“

آخر کار شام تک پچیس تیس غلام اور کنیزیں جمع کر لیے گئے اور پھر بھیڑ بکریوں کی طرح کمرے میں ٹھونس کر کڑا پہرا لگا کر پریہ نے شکنتلا کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا تو شکنتلا خوش ہو کر بولی۔ ”بہت خوب پریہ۔ تو واقعی کنیز خاص بننے کی اہل ہے۔ اب پورے محل کی نچلی سطح پر ہمارا قبضہ مضبوط ہو گیا ہے۔ ان سب کو وہیں رکھو، جب کہ کوشلیا اور سادھنا پر بطور خاص نظر رکھنا اور پھر میرے اگلے حکم کا انتظار کرو۔“

☆......☆

مہاراجہ رام ناتھ سرکاری کاموں سے فارغ ہو چکے تھے اور اب شکنتلا کی صورت من میں سجائے خوابگاہ کی طرف رواں تھے۔ وزیر اعظم بال ٹھاکرے، سپہ سالار بلگرام اور شاہی جادوگر سامری ان کو زنان خانے کی حدود تک چھوڑنے کے لیے، ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ رام ناتھ سامری سے کہہ رہے تھے۔

''ہاں تو سامری تم ہماری نئی رانی شکنتلا کے لیے اپنے علم اور نجوم کی مدد سے جنم کنڈلی (زائچہ) تیار کر رہے تھے۔ اس کا کیا ہوا؟''

''جہاں پناہ'' سامری اپنی چمکتی ٹانٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''میرا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا...... ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ سارا زائچہ تیار ہے پرنتو ایک الجھن دور کرنے کے لیے رات کے آخری پہر شہر سے باہر پرانے شمشان گھاٹ میں اپنے گروشداد جادوگر کی بدروح سے ملاقات کروں گا اور کل صبح آپ کو ساری کتھا سناؤں گا۔''

''ارے سامری!'' مہاراجہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''دنیا ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے، پر تم جادوگر لوگ روحوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ بھئی عجیب ہے تم لوگوں کا جیون بھی۔ اچھا بھئی اب تم لوگ واپس جاؤ، شام ہو رہی ہے، کل دربار میں ملاقات ہوگی۔'' اور پھر سامری اور بال ٹھاکرے مہاراجہ کو جھک کر آداب کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اب زنان خانے کی حدود شروع تھی، لہٰذا شاہی فوج کا محافظ دستہ بھی وہاں رُک گیا۔ رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس خوب صورت کنیزوں نے مہاراجہ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ شاہی فوج کا یہ دستہ اب رات بھر شاہی قیام گاہ کی حفاظت کی غرض سے آیا تھا اور صبح سے تعینات دستہ واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سپہ سالار بلگرام، جو مضبوط جسم، اونچے قد اور صاف رنگت کا مالک تھا، اپنے ماتحتوں کو ہدایات دینے لگا۔ مہاراجہ اب زنان خانے کی حدود میں آ گئے تھے، لہٰذا چند چنچل کنیزوں نے ان کو اپنے جلو میں لے لیا اور مہاراجہ دو خوب صورت کنیزوں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر، ان کو پہلو سے چمٹائے خراماں خراماں چل رہے تھے، باقی کنیزیں ہنسی بکھیرتی ان کے دائیں بائیں اور پیچھے چل رہی تھیں۔

''ارے بھئی وہ کوشلیا کل سے نظر نہیں آ رہی؟'' مہاراجہ نے کنیزوں سے پوچھا۔ تمام کنیزیں ایک دم خاموش ہو گئیں، بالکل سناٹا چھا گیا۔ کوئی جواب نہ ملا...... تو مہاراجہ جھلا گئے! ''کیا بات ہے بکتی کیوں نہیں۔ میں نے کیا پوچھا ہے۔ تم بتاؤ نرملا......'' مہاراجہ نے دائیں پہلو سے چمٹی کنیز کو مخاطب کیا۔

''جہاں پناہ...... کوشلیا کو کنیز خاص کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے اور اب پریہ جی کنیز عالیہ ہیں!''

''پریہ......'' مہاراج ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے...... ''یہ کون ہے؟ کس نے اسے کنیز خاص بنایا ہے۔ ہمارے استقبال کو کیوں نہیں آئی؟'' مہاراجہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے ''اور کوشلیا کدھر ہے؟''

''جہاں پناہ'' نرملا مہاراجہ کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے بولی۔ ''نئی رانی شکنتلا جی نے کوشلیا کو برطرف کیا ہے اور انہوں نے ہی پریہ کو کنیز عالیہ کا درجہ دے دیا ہے۔ استقبال کے لیے نہ آنے کا سبب تو پریہ جی ہی بتا سکتی ہیں۔'' مہاراجہ نے اب دونوں کنیزوں کی کمر سے ہاتھ نکال لیے تھے، کیوں کہ شاہی حجلہ قریب آ گیا تھا اور چوب دار مہاراجہ کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ شکنتلا جو نیم دراز شراب کی چسکیاں لے رہی تھی، مہاراجہ کی آمد کی اطلاع پا کر مسہری سے نیچے اُتر آئی۔ آب خورہ قریب کھڑی کنیز کے سپرد کیا اور اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی...... اتنے میں مہاراجہ پردہ سرکا کر اندر داخل ہوئے۔ شکنتلا سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مہاراجہ کھل اٹھے۔ شکنتلا مسکرا دی اور بانہیں وا کر کے دھڑام سے کنیزوں کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے مہاراجہ کے سینے سے جا لگی۔ حالاں کہ اس کا یہ عمل شاہی روایات کے خلاف اور بے پردگی میں آتا تھا۔ مہاراجہ نے بھی دونوں ہاتھ کمر میں ڈال کر اسے بھینچ لیا اور شکنتلا مسکرانے لگی۔ تمام کنیزیں سر جھکائے شکنتلا کی قسمت پر رشک و حسد کر رہی تھیں کہ چند دن پہلے ملازمہ کی حیثیت سے آنے والی کے بھاگ کیسے جاگ اُٹھے تھے۔ چند ساعتیں اسی طرح گزر گئیں، پھر مہاراجہ نے آہستگی سے اسے علیحدہ کیا اور تمام کنیزوں کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد باتوں میں لگے رہے، پھر ایک کنیز اجازت پا کر اندر آئی اور رات کے بھوجن تیار ہونے کی خبر دی۔ مہاراجہ اور شکنتلا بانہوں میں بانہیں ڈالے کھانے کے کمرے میں آ گئے...... دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانے لگے۔ کنیزیں

مور چھل چھلتی رہیں۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا اور پھر دونوں صبح تک کے لیے کمرے میں بند ہو گئے۔ شکنتلا نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور باغیچے کی طرف والی تمام کھڑکیاں تازہ ہوا کے لیے کھول دیں۔ کمرے میں کئی شمعدان روشن تھے اور ان کی پیلی اور سرخ روشنی میں شکنتلا دل فریب لباس میں پری پیکر معلوم ہو رہی تھی۔

مہاراجہ کشادہ ریشمی بستر پر نیم دراز ہو چکے تھے۔ اب شکنتلا نے مہاراجہ کے جوتے اتارے اور ان کے پاؤں ہولے ہولے مسلنے لگی...... بستر کے ساتھ ہی چھوٹی سی میز پر اعلیٰ درجے کی شراب اور دو جام رکھے تھے اور میز کے پاس ہی مہاراجہ کے لیے اعلیٰ تمباکو سے بھرا حقہ تازہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ بلوریں صراحی پانی سے بھری تھی اور دو چاندی کے کٹورے بھی موجود تھے۔ اب شکنتلا نے دونوں جام شراب سے بھرے اور ایک جام جھک کر مسکراتے ہوئے مہاراجہ کو پیش کیا تو مہاراجہ نے شکنتلا کو دبوچنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے، لیکن شکنتلا فوراً چکنی مچھلی کی طرح ان کی دسترس سے دور ہو گئی اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں گالوں کے نیچے رکھ کر مہاراجہ سے دور کھڑی دعوتی انداز میں مسکرانے لگی۔

''ہمارے صبر کا امتحان نہ لو شکنتلا......''

''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے مہاراج۔'' شکنتلا لمبی لمبی زلفوں کو جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

''شکنتلا تمہیں میرے پیار کی قسم۔'' مہاراجہ لجاتے ہوئے بے بسی سے بولے۔

''اچھا حضور مجھ سے پیار بھی کرتے ہیں؟'' شکنتلا نے دائیں انگلی ٹھوڑی کے نیچے تل پر رکھ کر ادا سے پوچھا......

''کیوں تمہیں کوئی شک ہے؟''

''بھلا کتنا پیار کرتے ہیں آپ اپنی شکنتلا سے؟''

''جتنے آسمان پر تارے ہیں۔''

''تارے تو انسان کی دسترس سے دور ہیں۔''

''اچھا تو پھر...... جتنے ریت کے ذرے ہیں۔''

''ناں جی ناں، ریت آنکھوں میں پڑ گئی تو پیار کا رستہ بھی نظر نہ آئے گا۔''

''اچھا تو پھر جتنے ہمارے محل کی کیاریوں میں پھول ہیں۔''

''پھولوں کے ساتھ تو کانٹے بھی ہوتے ہیں حضور۔'' شکنتلا خراماں خراماں چلتی ہوئی مہاراجہ کے پاس پلنگ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''اسی طرح جتنا آپ شکنتلا سے اور شکنتلا آپ سے پیار کرتی ہے، اتنے ہی ہمارے پیار کے دشمن بھی ہیں۔''

''دشمن......؟ کون ہے ہمارے پیار کا دشمن؟'' مہاراجہ حیرت سے بولے۔

''نئے دشمنوں کو تو چھوڑیں...... ابھی تو میرے چار دشمن آپ کی قید میں زندہ ہیں اور آپ نے انہیں کوئی سزا نہیں سنائی۔'' شکنتلا نے روٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا اچھا۔'' مہاراجہ یاد آنے والے انداز میں بولے۔ ''تم ان خبیثوں کی بات تو نہیں کر رہی ہو، جنہیں دریائے کالکا کے کنارے تمہارے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا؟''

''ویسے میں بھی تو آپ کے پیار میں گرفتار ہوں۔'' شکنتلا نے اپنا سر رام کے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''باندھا تو تم نے ہمیں اپنی زلفوں سے ہے!'' مہاراجہ شکنتلا کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے اور پھر گویا ہوئے......

''تم فکر نہ کرو میں تمہارے چاروں دشمنوں کو کل ہی ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلنے کی سزا دوں گا اور وہ منظر چاہو تو تم بھی دیکھ سکتی ہو۔ ارجن کو قتل ہوتے ان چاروں کتوں کے علاوہ صرف میں نے دیکھا ہے! ان کو مرتے ہوئے سارا زمانہ کیوں دیکھے؟'' شکنتلا اپنا سر مہاراجہ کے زانوؤں پر رکھ کر لیٹتے ہوئے بولی۔

''بڑا پیار ہے...... تمہیں اپنے پہلے پتی سے۔'' مہاراجہ خفگی سے بولے۔ تو شکنتلا فوراً اپنی سڈول باہیں مہاراجہ کی گردن میں ڈال کر بولی۔

''مہاراج! اب تو میرا پیار صرف آپ کے لیے ہے، لیکن ان قاتلوں کے ساتھ بات پیار کی نہیں انتقام کے اس

ادھار کی ہے، جو میرے سر پر ہے۔ میری چھوٹی سی اِچھا ہے کہ وہ چاروں قاتل آپ کسی ایسے خفیہ تہہ خانے میں بند کر کے تہہ خانے کی چابی میرے حوالے کر دیں، جہاں میں ان سے آہستہ آہستہ اپنے انتقام کو پورا کر سکوں اور ان کی آواز بھی باہر نہ جا سکے۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے شکنتلا!'' اس خواب گاہ کے عین نیچے تہہ خانے میں ایک ایسا قید خانہ ہے جہاں قید ہونے کے بعد رام ناتھ کا دشمن دوبارہ آسمان دیکھنے کی خواہش من میں لیے نرکھ سدھار جاتا ہے۔'' یہ انکشاف سنتے ہی شکنتلا کی آنکھوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ''میں کل صبح ہی تمہیں یہ تہہ خانہ دکھا کر تمہارے چاروں دشمن اس کے اندر قید کر دوں گا، پھر چاہے تم انہیں کل ہی قتل کر دو یا ساری زندگی سسکا سسکا کر مارو۔ اب خوش ہو؟'' مہاراجہ شکنتلا کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر بولے۔

''صبح کیوں ابھی دکھا دیں نا......'' شکنتلا لاڈ لے لہجے میں بولی۔

''بہت ضدی ہو......'' مہاراجہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے اور بستر سے اُتر گئے۔ ''آؤ میرے ساتھ، اس وقت تہہ خانے تک تو نہیں جا سکتے پرنتو میں تمہیں اس کا انوکھا رستہ بتاتا ہوں۔'' شکنتلا بھی بستر سے اُٹھ کر اپنی دراز خوب صورت زلفوں کو درست کرتے ہوئے مہاراجہ کے ساتھ ہولی۔ کشادہ کمرے کے ایک کونے میں آ کر مہاراجہ نے فرش پر پڑا قالین ہٹایا تو نیچے سرخ رنگ کا ایک گول نشان بنا ہوا تھا۔ مہاراجہ نے جوتے اتار کر اپنی ایڑی اس سرخ نشان کے عین اوپر رکھی اور پاؤں کا پنجہ زمین سے اٹھا کر دائیں طرف زور سے گھوم گئے تو شکنتلا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا، کیوں کہ اب دیوار پر رنگوں سے بنی دو پھولوں کی بیلیں، جو چھت سے فرش تک تھیں، ایک دوسرے سے بے آواز جدا ہونے لگیں اور دیوار کے اندر اتنا شگاف پیدا ہو گیا کہ کم از کم دو آدمی بیک وقت گزر کر دوسری طرف جا سکتے تھے۔ مہاراجہ دیوار کے دوسرے جانب گئے تو شکنتلا بھی ساتھ ہی چلی گئی۔ اب اس نے دیکھا کہ وہ تقریباً چار فٹ چوڑے اور چھ فٹ لمبے تنگ کمرے میں تھی اور اس کے سامنے سپاٹ دیوار تھی اور فرش پر یہاں بھی قالین بچھا تھا۔ مہاراجہ نے دائیں اور بائیں دیواروں کے نیچے فرش سے قالین ہٹایا تو وہاں بھی ویسے ہی دو سرخ گول نشان بنے تھے۔ ''شکنتلا یہ دائیں طرف والا سرخ نشان ویسے ہی ایڑی سے دائیں طرف گھماؤ گی تو راستہ قید خانے کی طرف جائے گا اور بائیں دیوار کے ساتھ بنا سرخ نشان دائیں طرف گھمانے سے ایک طویل راہداری میں پہنچ جاؤ گی اور آخر چلتے چلتے خاصی دیر کے بعد یہ سرنگ محل سے بہت دور پہاڑیوں کے اندر ایک ویران جگہ پر جا نکلے گی۔ اگر کبھی شہنشاہوں اور مہاراجوں پر مشکل وقت آن پڑے تو ایسے ہی خفیہ راستے وہ اپنے فرار کے لیے تیار رکھتے ہیں اور سنو...... ان دونوں گول نشانوں میں سے کسی ایک کو بائیں طرف گھمانے سے خواب گاہ کی دیوار ایسے جڑ جائے گی کہ پتا بھی نہ چلے گا اور ایسے ہی نشان قید خانے اور فرار والی دیواروں کے اندر بھی ہیں، تا کہ یہ دیواریں بھی بند کر کے کسی کو اپنے پیچھے آنے سے روکا جا سکے۔ آؤ اب آرام کریں......'' اور پھر مہاراجہ شکنتلا کو لے کر خوابگاہ میں آ گئے اور گول نشان پر ایڑی رکھ کر اسے بائیں طرف گھمایا تو دیوار مکمل خاموشی سے پھر ایسے ساتھ مل گئی، جیسے یہاں دیوار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ شکنتلا کا منہ حیرت سے اب تک کھلا تھا۔ اتنا بڑا راز ملنے کی اس کو توقع نہ تھی۔

''منہ بند کر لو شکنتلا...... مکھی پڑ جائے گی۔'' مہاراجہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگے جیسے بہت اعلیٰ مذاق کیا ہو۔ شکنتلا جیسے ہوش میں آ گئی اور پھر خود سپردگی کے عالم میں مہاراجہ کی طرف جھکنے لگی۔

☆......☆

دلاور کی چیخیں سن کر ارد گرد کے ہمسائے گھروں سے نکل آئے...... اور دلاور جیسے سنجیدہ آدمی کو ہذیانی انداز میں بھاگتے چلاتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ دلاور کا ایک دوست جبار آگے بڑھا اور اسے بازوؤں میں تھاما تو دلاور اس کی بانہوں میں جھول گیا...... جبار اور دوسرے لوگوں نے اسے اٹھایا اور اس کو گھر کے اندر لائے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کی بیوی غزالہ...... گھر کی دہلیز پر اوندھے منہ پڑی زار و قطار رو رہی ہے...... سب لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے...... تھوڑی دیر بعد

دلاور کے حواس قائم ہوئے تو اس نے ہمسائیوں کو تمام واقعات تسلسل کے ساتھ سنائے۔ بستی کے سیانوں اور بزرگوں نے صلاح دی کہ اس سلسلے میں بابو جی سے رابطہ کیا جائے۔

بابو جی بستی نور پور میں ہی رہتے تھے۔ دلاور کے دوست صبح صبح بابو جی کو لے آئے۔ یہ منحنی سے تھے، چھوٹی چھوٹی مہندی رنگی داڑھی تھی...... صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور مشہور تھا کہ جن بھی حاضر کر لیتے ہیں۔ جبار اور دیگر دوست ان کو اسی لیے لائے تھے کہ دلاور اور غزالہ کے گھر کو جنوں سے نجات دلائی جائے۔ بابو جی جیسے ہی گھر کی دہلیز پار کرنے لگے'' اچانک خون کے چھینٹے فرش پر نمودار ہوئے...... بابو جی نے فوراً پاؤں باہر کھینچا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئی بوتل سے خون پر دم کیا ہوا پانی چھڑکا...... اور پھر اندر آئے۔ خون کے چھینٹے دیکھ کر تمام عورتیں اور مرد سہم گئے اور انہیں یقین ہو چلا کہ جنوں والی بات سچ ہے۔ بابو جی گھر کے صحن میں کرسی بچھا کر بیٹھ گئے اور اپنے سامنے زمین پر انہوں نے ایک چھری کی مدد سے علامتی دائرہ کھینچا۔ ساتھ ساتھ کچھ پڑھتے بھی جا رہے تھے اور تمام ہدایات اشاروں سے دے رہے تھے۔ غزالہ اور دلاور بھی کھڑے تھے۔ غزالہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ محلے کی عورتیں اور مرد دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے، اچانک کئی عورتیں چیخنے لگیں، کیوں کہ پورے صحن میں خون کے قطرے نظر آنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ خون جیسے زمین کے مساموں سے پھوٹ پڑا ہو، صرف دائرے والی جگہ خالی تھی...... خون دیکھ کر بابو جی سرعت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کڑک کر بولے۔

'' لڑکی تو دائرے کے اندر آ جا......'' غزالہ سہمے سہمے انداز میں قدم قدم دائرے کی طرف چلنے لگی...... لیکن اب اس کے چہرے کا زاویہ بگڑنا شروع ہو چکا تھا...... جیسے ہی وہ بابو جی کے قریب پہنچی، بابو جی نے ہاتھ میں پکڑی بوتل سے پانی کا چھینٹا غزالہ کے منہ پر مارا تو غزالہ کی چیخ نکل گئی...... وہ ایسے تڑپنے لگی جیسے اس پر ابلتا پانی پھینک دیا گیا ہو۔

'' چلو دائرے کے اندر آ جاؤ۔'' بابو جی کی آواز اُبھری...... اور انہوں نے دوبارہ پانی غزالہ کے منہ پر پھینکنا چاہا تو...... غزالہ جس کے چہرے کی ہیئت خوف ناک ہو چکی تھی، نے اُچھل کر بابو جی کی گردن دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں لے لی اور پھر اس سے پہلے کہ دلاور یا دوسرے لوگوں کو کسی بات کی سمجھ آتی...... بابو جی کٹے ہوئے درخت کی مانند زمین پر گر گئے...... غزالہ ان کی گردن چھوڑ چکی تھی، لیکن بابو جی کے ناک منہ اور کانوں سے خون فوارے کی مانند ایک ثانیہ کے اندر نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ بابو جی دنیا چھوڑ چکے تھے...... اہل محلّہ یہ دیکھتے ہی چھلانگیں مارتے ہوئے باہر کی طرف دوڑے!!

☆......☆

پے در پے واقعات نے دلاور کو پاگل کر کے رکھ دیا۔ اس کا ہنستا بستا گھر اُجڑ کر رہ گیا تھا...... اب تو بستی والے اس کے گھر بھی نہیں آتے تھے کہ کیا خبر غزالہ کو کب دورہ پڑ جائے...... ایسی صورتحال میں دلاور غزالہ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ آخر اس کی بیوی تھی جو بیٹی کے بعد اس کا واحد اثاثہ تھی...... لیکن غزالہ کے ساتھ تنہائی میں وہ سو بھی نہیں سکتا تھا کہ جانے کب غزالہ کا دماغ الٹ جائے اور وہ حملہ کر دے...... لہٰذا دلاور کا دوست جبار بھی وہیں آ گیا تھا۔ غزالہ کے سونے کے بعد دلاور سوتا اور جبار جاگتا اور پہرہ دیتا رہتا تھا۔ بابو جی کی موت کے بعد غزالہ پرسکون تھی اور بظاہر بھلی چنگی تھی...... لیکن دلاور کا خوف کم نہ ہو رہا تھا اور بدستور سہما ہوا تھا۔ اس وقت جبار اور دلاور بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور غزالہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ جبار کہنے لگا...... '' کل صبح ایک عامل کو بلایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں ایک دفعہ جس چار دیواری کے اندر قدم رکھ دوں...... اگر جن وہاں ہیں تو باہر نہیں جا سکتے...... اور اگر اس وقت وہاں نہیں ہیں...... تو آئندہ وہاں آ نہیں سکتے۔''

'' کیا نام ہے اس عامل کا......'' دلاور اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔

'' نام تو مجھے صحیح نہیں معلوم...... مگر لوگ انہیں شاہ صاحب کہتے ہیں۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ جب میں نے غزالہ بھابی کا ذکر ان سے کیا تو انہوں نے فوراً حساب لگا کر بتایا کہ یہ کافر جن ہیں اور کافر جن نقصان پہنچائے بغیر نہیں جاتے۔ میں نے کل صبح ان سے آنے کا وعدہ لے لیا ہے اور گھر کا پتا اور نقشہ سمجھا دیا ہے...... ان شاء اللہ

سب ٹھیک ہو جائے گا......"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو......" دلاور مایوس لہجے میں بولا۔

☆......☆

رات آخری ہچکیاں لے رہی تھی! دلاور گہری نیند میں تھا۔ جبار بھی جاگتے جاگتے اب اونگھ رہا تھا...... ساری رات اکیلے جاگ کر گزارنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اچھے اچھوں کو رات کے آخری پہر نیند اپنے شکنجے میں کس لیتی ہے۔ ایسے میں غزالہ...... جو اپنے بستر پر اوندھی پڑی تھی، ہولے سے کسمسائی، پھر ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر وہ خالی الذہن سوچتی رہی، پھر مشینی انداز میں چارپائی سے نیچے اُتر گئی...... اور کمرے سے باہر نکل گئی، اس کا رُخ باورچی خانے کی طرف تھا۔ چند ہی لمحوں بعد غزالہ ہاتھ میں سبزی کاٹنے والی تیز دھار چھری تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ اب اس کے چہرے کی رنگت اور نقشہ تبدیل ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی خوب صورتی اور چہرے کی معصومیت کی جگہ وحشت لے چکی تھی۔ اس کی نظریں...... چارپائی پر سوئے ہوئے دلاور پر جمی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ میں موجود چھری پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے وہ نپے تلے قدموں کے ساتھ بے آواز دلاور کی جانب بڑھ رہی تھی کہ زمین پر اونگھتے جبار سے ٹکرا کر گر پڑی...... گرتے ہی اس کی نظریں جبار کی گردن پر پڑیں اور وہ دلاور کو بھول گئی اور تیز دھار چھری جبار کی گردن میں پوری قوت سے بلند کر کے گھونپ دی۔ غزالہ کے ٹکرانے سے جبار کی آنکھ کھل چکی تھی، مگر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی غزالہ کے اندر موجود نادیدہ قوت اپنا کام دکھا چکی تھی۔ خون کا ایک فوارہ جبار کی شہ رگ سے اچھل کر نکلا اور کمرہ جبار کی چیخوں سے گونجنے لگا۔ دلاور اس شور سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور کمرے کا منظر دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ غزالہ جبار کا خون اپنے منہ پر مل رہی تھی اور زبان پر لے رہی تھی، جبکہ دلاور کو اس نے چنداں اہمیت نہ دی...... دلاور اُچھل کر بستر سے نیچے اترا اور غزالہ پر جھپٹا۔ اسی اثناء میں باہر سے گلی والا دروازہ دھڑ ادھڑ کوئی پیٹنے لگا...... "دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو...... جلد کرو...... عنکبوت میں آ رہا ہوں...... عنکبوت میں آ رہا ہوں۔" دروازہ دھڑ ادھڑ پیٹا جا رہا تھا...... جیسے کوئی توڑنے کے لیے بے چین ہو۔ دلاور بے سوچے سمجھے خارجی دروازے کی طرف بھاگا...... اور اگلے لمحے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا...... اور ہکا بکا رہ گیا۔

☆......☆

چاند کی طرح چمکتی ٹنڈ، اماوس کی طرح سیاہ شکل کا سامری جادوگر شہر سے دور پرانے شمشان گھاٹ میں بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے اپنے گرو کی روح سے رابطے کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر جاپ شروع کر چکا تھا۔ سامنے چھوٹا سا الاؤ روشن تھا۔ سامری کے کاندھے پر ایک کانا الو بیٹھا ہوا تھا۔ سیاہ رات، آگ کی روشنی میں سیدھے ہاتھ میں انسانی کھوپڑی اور الٹے ہاتھ میں پنڈلی کی ہڈی تھامے اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس وقت وہ خود ایک بدروح نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، خاصی دیر تک اسی حالت میں وہ کوئی منتر پڑھتا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھوپڑی زمین پر رکھ کر سامنے پڑے پیالے سے مٹھی بھر کوئی چیز آگ میں پھینک دیتا جس سے آگ بھڑک اُٹھتی...... کافی دیر یہ عمل جاری رہا۔ اچانک قبرستان کا سناٹا چمگادڑوں کی چیخوں سے ٹوٹ گیا۔ تمام چمگادڑیں اپنے ٹھکانوں سے باہر نکل کر فضا میں چکر کاٹنے لگیں۔ بلیاں کتے اپنے بلوں سے نکل کر منحوس آوازوں کے ساتھ رونے لگے۔ معاً سامری نے دائیں ہاتھ میں پکڑی انسانی کھوپڑی بھی آگ میں جھونک دی۔ فوراً ہی ایک چٹاخ پیدا ہوئی اور کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گئی اور ساتھ ہی آگ بجھ گئی۔ اب ہر سُو مکمل اندھیرا تھا۔ الاؤ سے اب صرف گاڑھا گاڑھا دھواں اُٹھ رہا تھا...... اور دھوئیں سے اب کسی جاندار شے کا ہیولا بننے لگا۔ ہیولا آہستہ آہستہ واضح ہو رہا تھا۔ اس کے کئی فٹ لمبے دانت تھے اور درجنوں کالے غلیظ بازو تھے۔ آنکھ کے ڈھیلے باہر نکل کر لٹک رہے تھے۔ ہیولا اپنی لمبی زبان بار بار اندر باہر کر رہا تھا۔ سامری خوشی سے اچھلنے لگا...... اس کے گرو استاد کی روح آ گئی تھی۔

"استاد! استاد! مجھے پہچان......" سامری نے گرو کی روح کو متوجہ کیا۔

''تجھے پہچان چکا ہوں خبیث انسان۔'' روح کی منمناتی لیکن گونجدار آواز بلند ہوئی۔ ''کیوں کیا ہے پریشان؟ میری بیاکل آتما تڑپ کہ میں اپنے پاپوں کی سزا بھگت رہی تھی اور آج ہی میں چھٹی لے کر اپنے آباؤ اجداد کی آتماؤں کی تلاش میں نکلا تھا، لیکن تجھ جیسے غلیظ انسان نے میری چھٹی برباد کر دی۔ اوئے تو ہے ہی خبیث......''

''گرو...... استاد میری مشکل آسان کر دے۔'' سامری گھگھیاتے ہوئے بولا...... ''میرے کالے علم کی شکتی بھی شکنتلا کے ماضی میں نہیں جھانک سکتی...... استاد مجھے بتا یہ کون ہے اور اس پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔ کوئی ایسا گر مجھے پراپت کر دے کہ میرے کالے علم کی شکتی اپرم پار ہو جائے۔''

''اوئے کالے علم کے پتر......'' بدروح نے دھاڑ کر کہا۔ ''جیسے تیرا علم کالا...... ویسے تیری بوتھی بھی کالی اور جیسے تیری بوتھی کالی ویسے تیرا دل کالا اور گنجے شیطان چھوڑ میری جان۔ تو جیسا باہر سے کالا ویسا ہی اندر سے بھی کالا...... تیرا شیطان کی خالہ سے پڑا ہے پالا۔''

سامری ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا......

''استاد میری مشکل آسان کر دے تجھے کالی کا واسطہ......''

''اوئے ناپ اپنا رستہ'' بدروح کڑک کر بولی۔ ''سن اے نادان کالی کا دے بلیدان۔ کنیا سہاگن سامنے ہے ناگن...... سب کو چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ...... جا گنجے پوتی ناگن سے کر دوستی۔''

''گرو استاد...... تو نے بڑی دیا کی ہے! میں تیرے نام کا بلیدان بھی دوں گا، تا کہ تجھے سورگ پاش ہو......'' سامری بہت خوش تھا۔ اس کا عمل کامیاب ہو چکا تھا، لیکن گرو شداد کی بدروح اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی اور فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ آخری جملہ جو سامری کی سمجھدانی میں آیا وہ ''جا گنجے پوتی ناگن سے کر دوستی'' اور اس کے ساتھ بدروح چلی گئی...... اور سامری اپنا سامان تھیلے میں ڈال کر کاندھے پر لٹکائے واپس چل پڑا۔ اب وہ گہری سوچ میں گم تھا!

☆......☆

سامری جادوگر مہاراجہ رام ناتھ کے ساتھ زنان خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پیچھے چند کنیزیں اور غلام چل رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ آج دربار برخاست کرنے کے بعد سامری نے مہاراجہ سے درخواست کی کہ وہ کنڈلی کی تیاری کے سلسلے میں مہارانی شکنتلا سے براہ راست کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس وقت دونوں شکنتلا کے پاس جا رہے تھے۔ شکنتلا کو دونوں کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بھی اپنی خواب گاہ کی باغیچے کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی سوچ میں گم تھی۔ اس نے احتیاطاً تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں...... تا کہ حالات خراب ہوں...... تو فرار ہونے میں آسانی ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ...... کہیں سامری اپنے جادو کی مدد سے اس کا راز تو نہیں جان چکا۔ اگر ایسا ہو گیا تو بڑی مشکل درپیش ہو گی۔ بنا بنایا کھیل چوپٹ ہو جائے گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سامری اس کا راز مہاراج کو بتا چکا ہو اور اس کو دھوکے میں رکھ کر گھیر لیا جائے...... لہٰذا بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اتنے میں ایک کنیز نے آ کر سامری اور مہاراجہ کی آمد کی خبر سنائی اور شکنتلا ذہنی طور پر کسی بھی صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اب خواب گاہ کا پردہ اٹھا اور مہاراجہ رام ناتھ سنجیدہ چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوئے...... ان کے پیچھے سامری اور دیگر لوگ تھے۔ علیک سلیک کے بعد شکنتلا سامری اور مہاراجہ صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ پریہ سامری کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

''شکنتلا...... یہ ہمارے شاہی جادوگر ہیں۔ علم نجوم پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔'' مہاراجہ نے سامری کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ سامری نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شکنتلا کے چہرے پر جما رکھی تھیں! اور اس بات کو شکنتلا نے بطور خاص محسوس کیا تھا! اسی لیے وہ دانستہ آنکھیں جھپکا رہی تھی!

''رانی جی میں نے آپ کی جنم کنڈلی تیار کی ہے۔ کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گی۔''

''میں ساری صورت حال مہاراج کو بتا چکی ہوں۔'' شکنتلا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''لیکن رانی جی...... کچھ باتیں زائچہ کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے تخلیے میں

ملنا چاہتا ہوں......"

"میں کوئی بات مہاراج کی عدم موجودگی میں نہیں کر سکتی......" شکنتلا رام ناتھ کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے پیار سے بولی......اور مہارلجہ نے پیار سے اس کے گال تھپتھپا دیے۔

"آپ کی ماتا جی کا شبھ نام کیا ہے؟" سامری نے اپنی سلیٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"بملا کماری......" شکنتلا نے مہارلجہ کے شانوں سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور پتا جی......؟"

"سریندر کمار۔" شکنتلا نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن آپ یہ سب کچھ پوچھ کر کیا کریں گے؟" شکنتلا نے بور ہونے کے انداز میں جمائی لی۔

"آپ کی جائے پیدائش کہاں ہے؟" سامری نے بدستور اپنی آنکھیں شکنتلا پر جمار کھی تھیں...... "جی کلکتہ" شکنتلا نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "چلیں سامری جی اب ہماری رانی کو زیادہ پریشان نہ کریں۔" مہارلجہ نے شکنتلا کے چہرے پر چھائی بوریت بھانپ کر کہا اور کھڑے ہو گئے لہٰذا سب لوگ فوراً کھڑے ہو گئے اور مہارلجہ سے اجازت پا کر کمرے سے باہر نکل گئے...... پریہ اور شکنتلا کی آنکھیں چار ہوئیں اور شکنتلا نے بائیں آنکھ سے اسے خفیف اشارہ کر دیا......اور پریہ بھی سامری کے پیچھے باہر نکل گئی......اب چند کنیزیں اور سپاہی سامری کے ساتھ تھے اور پریہ بالکل سامری کے برابر چل رہی تھی۔

"سامری جی......" پریہ نے کھنکتی آواز میں سامری کو مخاطب کیا۔ "میرا بھی زائچہ بنا دیں۔" اور سامری نے پہلی بار پریہ کو بھرپور نظروں سے ناپا۔ بالکل کم سن اور انتہائی خوب صورت سانولی سلونی سی لڑکی تھی۔ گلابی ریشمی ساڑھی میں اس کا ملکوتی حسن عجب بہار دکھلا رہا تھا۔

"ضرور ضرور......کیا نام ہے تمہارا کنیا......؟"

"جی پریہ......"

"کون ہو تم......؟"

"میں جی کنیز خاص ہوں!"

"اوہ اچھا......زائچہ بنوانے کے لیے تمہیں میرے ساتھ حویلی چلنا ہوگا!"

"ضرور چلوں گی، بلکہ آپ مجھے ابھی اپنے ساتھ ہی لے چلیں۔"

"رانی سے پوچھ لیا ہے؟"

"وہ مجھے کچھ نہیں کہتیں۔"

"اچھا تو پھر آؤ میرے ساتھ......" اور پریہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی محل سے باہر آ گئی۔ شاہی محل کے صدر دروازے پر سامری کی بگھی موجود تھی۔ پریہ سامری کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

وہ جان بوجھ کر سامری کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی اور راستے بھر سامری سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ دوران گفتگو کئی بار اس نے اپنا وزن سامری پر ڈال دیا......سامری نے شادی نہ کی تھی وہ تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی حویلی شہر سے باہر نکل کر ویرانے میں تھی جہاں دُور دُور تک آبادی نہ تھی۔ بگھی خاصی دیر چلتی رہی اور پھر پکے راستے سے اُتر کر کچے راستے پر چلنے لگی، اب پتھریلی زمین شروع ہو گئی تھی۔ کافی دیر چلنے کے بعد بگھی حویلی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ سامری نے نیچے اُتر کر پیچھے دیکھا تو پریہ جان بوجھ کر بگھی کے پائیدان سے نیچے اُترنے میں ایسے ہچکچانے لگی...... جیسے ڈر رہی ہو......تب سامری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اتارنے کی کوشش کی تو وہ دانستہ اس کے اوپر آ گری، سامری گرتے گرتے بچا......اور دونوں ہنسنے لگے...... یہ حویلی سیاہ پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ صدر دروازے پر دو پہرے دار کھڑے تھے۔ جنہوں نے ان کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا......اور مستعد کھڑے رہے۔ ان کی آنکھیں بالکل گول تھیں جو تیزی سے

دائرے میں گھوم رہی تھیں۔ دروازہ ان کے قریب پہنچتے ہی خوف ناک چرچراہٹ کے ساتھ خود بخود کھلتا چلا گیا...... صدر دروازے سے گزر کر لمبی ڈیوڑھی تھی۔ حویلی اندر سے بھی سیاہ تھی۔ پریہ کو خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ ڈیوڑھی ختم ہونے کے بعد کشادہ صحن تھا...... جہاں ایک طرف کچھ کالے مزدور کھدائی کر رہے تھے۔ ان کی شکلیں بھی عجیب و غریب تھیں...... اور آپس میں کوئی بات نہ کر رہے تھے، حالاں کہ تعداد میں اچھے خاصے تھے۔ صحن پار کر کے برآمدہ تھا۔ اچانک پریہ کو محسوس ہوا کہ سامری کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس کے ساتھ چل رہے تھے، اس نے ایک دم دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا...... لیکن کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ لیکن احساس بدستور قائم تھا، پھر دروازے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے کے ساتھ اندر کی طرف کھل گئے۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا دروازہ کھولنے والا کوئی نہ تھا، البتہ کافی دور کمرے کے وسط میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سامری چلتے چلتے اس کے پاس پہنچ کر ایک ساعت رُکا...... تو لڑکی کے ہونٹ ہلے اور نمستے...... کی ایک گونجدار آواز اُبھری...... پریہ چونک گئی...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے آواز کسی گنبد سے ٹکرا کر آئی ہو...... کیوں کہ چاروں طرف سے یکساں سنائی دی تھی۔ لڑکی کی شکل کچھ پُراسرار تھی۔ اس کی آنکھوں اور ناک کا درمیانی فاصلہ خاصا زیادہ تھا۔ جب کہ ہونٹ اور تھوڑی بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ سامری نے سر ہلا کر جواب دیا اور آگے بڑھنے لگا۔ لڑکی بھی ساتھ ساتھ چلنے لگی لیکن یہ کیا......؟ پریہ دھک سے رہ گئی! لڑکی چل نہیں رہی تھی...... بلکہ زمین سے ایک بالشت اوپر تھی اور اس کے پیر اُلٹے رُخ تھے اور ان کے ساتھ ساتھ یوں چل رہی تھی جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ پریہ خوف زدہ ہوگئی اور چیخ کر سامری سے جا لپٹی۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے...... اور وہ سامری کے بازوؤں میں بے ہوش ہو کر جھول پڑی۔ پریہ کو ہوش آیا...... تو وہ ایک سجے سجائے کمرے میں تھی۔ تمام کمرہ نظر نہ آنے والی روشنی سے دن کی طرح منور تھا۔ اسے یہ کمرہ راج محل کے کسی کمرے کی طرح محسوس ہوا۔ سامری ایک بڑی کرسی پر اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

"اب کیسی ہو......!" سامری نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ...... وہ کہاں ہے!" پریہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"فکر نہ کرو میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ حویلی سامری جادوگر کی ہے، یہاں کی ہر بات تجھے عقل سے پرے معلوم ہوگی۔"

"میں کہاں ہوں؟"

"تو ابھی میری حویلی میں ہی ہے اور محفوظ ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... تو میرے ساتھ اپنی جنم کنڈلی بنوانے آئی تھی...... ہے نا......"

"مجھے واپس شاہی محل لے چلو......"

"میرا نام سامری جادوگر ہے!" سامری ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

"مجھے پتا ہے...... کہ تو کس کارن میرے ساتھ آئی ہے۔ تجھے زائچہ وائچہ کوئی نہیں بنوانا تو صرف میرے اوپر اپنی اداؤں کا جادو جگانے آئی تھی۔ پرنتو یہ بات تمہیں...... اور تمہاری ملکہ کو نہیں معلوم کہ سامری کی شکتی اپرم پار ہے...... سامری لوگوں کے دلوں میں بھی جھانک سکتا ہے۔ تجھے میرے ساتھ شکنتلا نے دانستہ بھیجا ہے...... اور خواب گاہ سے اُٹھتے وقت اس نے تمہیں آنکھ سے جو اشارہ کیا...... وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنے کے باوجود بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔"

پریہ اس حیرت انگیز انکشاف پر ششدر رہ گئی۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سامری اتنا زبردست جادوگر ہے۔ اس کی نظر میں تو یہ محض شعبدہ باز تھا۔

"اور سنو لڑکی......" سامری نے نظریں پریہ پر گاڑ کر کہا۔

"شکنتلا کو جا کر کہہ دینا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے! اور جب کل صبح مہاراجہ دربار چلے جائیں گے تو میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے آؤں گا۔ اس کو کہنا کہ خواب گاہ کے دروازے بند رکھے اور کسی کنیز کو اندر نہ رہنے دے۔"

"بند دروازے ہوں گے تو آپ کیسے آئیں گے؟" پریہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''میرا جادو چڑھ کر بولتا ہے لڑکی۔ بس اسے تم میرا سندیس پہنچا دینا۔ چلو تمہیں محل لے چلیں۔'' پریہ بستر سے نیچے اُتر کر جوتے پہننے لگی۔ جوتے پہنتے ہی سامری نے اسے زور سے دھکا دیا۔ پریہ نے گرنے سے بچنے کے لیے فوراً اپنے ہاتھ آگے کر لیے تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی درخت کی ٹہنی اس کے ہاتھ میں آ گئی ہو۔ اور جیسے ہی اس نے نظر اُٹھائی...... ہکا بکا رہ گئی...... اور بغور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ اور وہ راج محل کے باغیچے میں ایک درخت کی ٹہنی تھامے کھڑی تھی۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ چراغ روشن ہو رہے تھے۔ پریہ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے زنان خانے کی طرف چل دی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ راستے میں ملنے والے تمام غلام اور کنیزیں اسے رک کر جھک کر آداب کرتے، لیکن پریہ کسی پر توجہ دیے بغیر سیدھی شکنتلا کی خواب گاہ کی طرف رواں دواں تھی۔ خواب گاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوتے وقت...... دربان اسے روک کر بڑے ادب سے مخاطب ہوا...... ''کنیز عالیہ...... اندر مہاراجہ حضور بھی موجود ہیں۔''

''اطلاع کرو کہ پریہ آئی ہے۔ رانی سے ملنا چاہتی ہے۔'' پریہ نے ماتھے پر بار بار آ جانے والی آوارہ لٹ کو پیچھے کرتے ہوئے شانِ بے نیازی سے کہا۔ پہرے دار اجازت طلب کر کے اندر گیا اور واپس آ کر پریہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

''پریہ حاضر ہو سکتی ہے حضور......؟'' پریہ نے دروازے سے داخل ہو کر پردے کی اوٹ سے پوچھا۔

''آؤ پریہ آؤ'' شکنتلا کی زندگی سے بھرپور شوخ آواز سنائی دی تو پریہ شاہی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہی شاہی چھپر کھٹ پر مہاراجہ اور رانی تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ کنیزیں مور کے پروں والا پنکھا جھل رہی تھیں۔ جس کی ہوا سے شکنتلا کے بال آہستگی سے بکھر رہے تھے...... دونوں شراب کی چسکیاں اور مہاراجہ ساتھ میں حقے سے شغف فرما رہے تھے۔ دو مالن لڑکیاں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ ایک گلدانوں میں دوسری شکنتلا کے بالوں میں پھول اور کلائیوں میں گجرے پہنا رہی تھی۔ پورا کمرہ موتیے اور رات کی رانی کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

''پریہ کیسی ہو؟'' شکنتلا جام کنیز کو تھماتے ہوئے بولی......

''دیا ہے آپ کی!''

''اچھا یہ ہے پریہ......'' مہاراجہ اس کو دیکھتے ہوئے بولے...... پریہ نے فوراً جھک کر اور دونوں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر نمستے کہا اور پھر اپنے نرم و نازک ہاتھ مہاراجہ کے پاؤں پر رکھ دیے۔

''شکنتلا وہ...... کوشلیا کہاں ہے۔ کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی......''

''مہاراج اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کو کنیز خاص کے عہدے سے ہٹا کر...... پریہ کو یہ منصب سونپ دیا ہے اور کوشلیا کو اس کی خدمت گار بنا دیا گیا ہے۔''

''بہت خوب مگر شکنتلا تم نے پہلے نہ بتایا کہ اس نے بدتمیزی کی ہے۔ کسی کی کیا مجال جو تمہاری شان میں گستاخی کرے...... مگر وہ ہے کہاں؟ بھئی ہمارا تو بڑا خیال رکھتی تھی۔'' مہاراجہ معنی خیز انداز میں بولے تو پریہ فوراً جھکی اور مہاراجہ کے پاؤں چھونے لگی اور بولی۔

''کنیز بھی تو آپ کی ہی داسی ہے حکم کریں، پریہ ''ہر خدمت'' کے لیے حاضر ہے۔''

''حضور والا...... اگر اجازت مرحمت فرمائیں...... تو میں کنیزوں کے ہمراہ باغ کی سیر کر آؤں۔'' شکنتلا نے موقع مناسب جانتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''کیوں نہیں...... لیکن شکنتلا جلدی آ جایئے گا۔'' مہاراجہ نے ماحول کی مناسبت سے انکار مناسب نہ سمجھا۔ شکنتلا پلنگ سے نیچے آنے لگی تو پریہ نے فوراً جوتے پاؤں میں پہنائے اور دو کنیزیں اس کا لباس درست کرنے لگیں۔

''سنو پریہ......'' مہاراجہ نے آواز دی......

''ذرا کوشلیا کو میرے پاس بھیج دینا...... اس سے کوئی کام ہے۔''

''جی اچھا حضور......'' پریہ نہ کہنے کی جرأت نہ رکھتی تھی۔ لیکن سوچنے لگی...... کوشلیا کہیں مہاراجہ کی زیادہ لاڈلی ہوئی تو...... گڑبڑ نہ ہو جائے۔

''مہارانی جی اب کیا کریں!'' پریہ نے باہر نکل کر شکنتلا سے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے! ہم جلدی آنے کی کوشش کریں گے اور تم ذرا تاخیر سے کوشلیا کو بھیجنا عذر کر دیں گے کہ کہیں کام سے گئی تھی! اور پونم اور نرملا کو اس کے ساتھ بھیجنا تاکہ وہ کھل کر بات نہ کر سکے اور سنو پونم کو ابھی روانہ کرو کہ وہ کوشلیا کا حلیہ درست کر دے اور بھیجنے سے پہلے...... اس کو اپنے طریقے سے سمجھا دینا۔ آپ فکر نہ کریں حضور پریہ عمر میں کم مگر عقل میں پوری ہے۔

''پونم......''

''جی کنیز عالیہ......''

''تم فوراً بھوجن خانے جاؤ...... وہاں کوشلیا کنیزوں غلاموں کے لیے تندور پر روٹیاں پکا رہی ہو گی، اسے لے کر ہمارے کمرے میں جاؤ...... اور اس کا سنگھار وغیرہ کرواور اسے خوب صورت لباس پہنا دو، اس کی جگہ پر کسی اور کو روٹیاں پکانے پر لگاؤ۔''

''جی کنیز عالیہ۔'' یہ کہہ کر پونم سعادت مندی سے سر جھکا کر چل دی۔ شکنتلا اور پریہ آگے تھیں اور کنیزیں ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب غلام گردش سے نکل کر لمبے برآمدے میں چلنے لگیں۔ تمام راستے پر قالین بچھا ہوا تھا اور برآمدہ بے شمار شمعوں سے روشن تھا۔ اب وہ باغیچے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ہر طرف قسم قسم کے پھولدار پودے اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مناسب وقفوں پر سرو کے پودے بھی تھے۔ اب پریہ نے پیچھے دیکھ کر باقی کنیزوں کو فاصلہ بڑھانے کا حکم دیا اور خود ساڑی سنبھالتی ہوئی دوڑ کر مہارانی کے قریب پہنچ گئی۔

''پریہ تم آج سامری کے ساتھ گئی تھیں...... کیسا رہا؟''

''تو بہ تو بہ رانی جی وہ تو اتنا بڑا جادوگر ہے کہ روئے زمین پر اس جیسا نہ ہوگا۔'' پریہ نے شروع سے آخر تک تمام واقعات من و عن شکنتلا کو سنا دیے۔

''ہوں......'' شکنتلا کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارا راز پا چکا ہے!''

''کیسا راز رانی جی؟'' پریہ حیرانی سے بولی۔

''جو ہم نے تمہیں بتانے کا وعدہ کیا ہے۔''

''صبح مہاراجہ کے دربار جانے کے بعد اور سامری کے آنے سے قبل تم میرے پاس آنا۔ میں تمہیں ساری بات سمجھاؤں گی۔ سامری نے اگر وہ راز مہاراجہ کو نہیں بتایا اور ہم سے ملنا بھی چاہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کچھ لین دین کرنا چاہے گا۔'' پریہ کے پلّے شاید کوئی بات نہ پڑی تھی...... ''چلو دیکھ لیں گے۔'' شکنتلا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی اور پھر بولی۔ ''چلو پریہ اب تم جاؤ اور فوراً کوشلیا کو مہاراجہ کے پاس بھیج دو، ہم بھی تھوڑی ہی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔'' پریہ جب اپنے کمرے میں واپس آئی تو پونم دوسری کنیزوں کے ساتھ مل کر کوشلیا کا بناؤ سنگھار تقریباً مکمل کر چکی تھیں۔ مختصر چولی اور رنگین گھاگھرا پہنے وہ خاصی سندر لگ رہی تھی اور حیران بھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پریہ کے آتے ہی اس کی آنکھوں میں خوف لہرانے لگا۔ پریہ نے آتے ہی تمام کنیزوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا، صرف پونم اور نرملا وہاں رہ گئیں۔ کنیزوں کے باہر نکلتے ہی پریہ نے فوراً کمرہ اندر سے بند کرنے کا حکم دیا۔ نرملا آگے بڑھی اور چٹخنی چڑھا دی۔

''پونم میرا بید لاؤ۔'' پریہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔ کوشلیا ایک دم سہم گئی اور پریہ کی طرف مترحم نظروں سے دیکھنے لگی۔ پریہ نے آگے بڑھ کر کوشلیا کے شانوں پر خوب صورتی سے بکھرے بالوں کو بے دردی سے اپنی مٹھی میں لے کر زوردار جھٹکا دیا۔ کوشلیا سسکنے لگی۔ اب اس کا سر بالوں کے ساتھ نیچے ہو گیا تھا اور اس کے لمبے بال پریہ کی مٹھی میں تھے۔ پریہ اسے اسی

طرح کھینچتے ہوئے چلنے لگی اور صوفے پر بیٹھ کر بولی......

"سنو کوشیلیا...... اس سے تجھے مہاراجہ نے یاد کیا ہے۔ اس لیے تمہیں تیار کرا کر وہاں بھیجا جا رہا ہے۔" کوشیلیا چپ رہی۔

"سن رہی ہو میری بات......" پریہ اس کے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر بولی۔

"جج...... جی کنیز عالیہ......" تکلیف کی شدت سے کوشیلیا دہری ہوئی جا رہی تھی۔

"کان کھول کر سن لو۔ تم نے اگر وہاں کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی کوشش کی...... تو واپس آ کر تمہارا حشر نشر کر دیا جائے گا...... تم نے مہاراجہ سے صرف ہوں ہاں میں بات کرنی ہے۔ کوئی شکوہ شکایت یا فالتو بات نہیں کرنی۔" یہ کہتے ہوئے پھر زور سے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا...... "ورنہ ساری رات یہاں الٹا لٹکا کے رکھوں گی اور کھال ادھیڑ دوں گی۔"

"ایسا ہی ہوگا کنیز عالیہ......" کوشیلیا بمشکل آواز نکال رہی تھی۔ تب پریہ نے اس کے بال چھوڑے اور پونم اور کملا سے مخاطب ہوئی۔

"تم دونوں نے اس پر پوری نظر رکھنی ہے اور اس کے ساتھ ہونا ہے۔"

"جو حکم کنیز عالیہ۔" دونوں منمنائیں۔

☆......☆

مہاراجہ دربار جا چکے تھے اور شکنتلا کا بناؤ سنگھار کنیزیں کر رہی تھیں۔ شکنتلا نے انتہائی خوب صورت غرارہ جس میں سبز، سرخ اور پیلے رنگ استعمال کیے گئے تھے، پہنا ہوا تھا...... لمبی گھنیری زلفیں کھول کر اس کے شانوں اور سینے پر بکھرائی گئی تھیں۔ یہ روپ اس نے خاص طور پر سامری کے لیے سجایا تھا۔ اسے پتا تھا کہ مرد چاہے کتنا بھی کٹھور کیوں نہ ہو، عورت کا حسن اور جوانی اس کو کچھ نہ کچھ ضرور پگھلاتے ہیں۔ ابھی کنیزیں اس کی نوک پلک سنوار رہی تھیں کہ پریہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی ملکہ کی اجازت سے سب کنیزوں کو باہر نکال دیا اور شکنتلا سے گویا ہوئی۔

"مہارانی جی! بس کسی بھی وقت سامری نازل ہو سکتا ہے۔"

"سنو پریہ۔" شکنتلا ایک موڑھے پر بیٹھ کر بولی۔

"میری بات صرف تم تک رہنی چاہیے، اپنا یہ راز پوری دنیا میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں، ڈرنا بالکل نہیں...... تم اگر میری وفادار رہیں تو مجھے بھی اپنا مددگار پاؤ گی۔"

"آپ مجھ پر وشواس رکھیں مہارانی جی۔" پریہ فرش پر بیٹھ کر شکنتلا کے چرن چھو کر بولی۔

"سنو......" شکنتلا! پریہ کے چہرے پر اپنی آنکھیں مرکوز کر کے بولی۔

"میں انسان نہیں ہوں......"

"جی......" پریہ ایک دم گڑبڑا گئی۔

"سکون سے میری بات سنو...... سو سال کی عمر پانے کے بعد اب انسان بن گئی ہوں، لیکن حقیقت میں، میں ایک ناگن ہوں...... شیش ناگن!" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ...... آ...... آ...... آپ...... کیا فرما رہی ہیں مہارانی جی......" پریہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہو کر بولی......

"شا...... شاید...... آپ مذاق فرما رہی ہیں۔" پریہ کے چہرے پر خوف منڈلانے لگا...... ڈر سے اس کی جان نکلنے لگی کہ ایک ناگن بند کمرے میں اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پریہ کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور اس پر خوف طاری ہو گیا۔

"ڈرو نہیں پریہ میں ناگن تھی...... پرنتو اب ایک منش صورت ہوں۔ میرے اندر تمام خصوصیات ہیں۔ میں ایک مکمل لڑکی ہوں، عقل و فہم بھی رکھتی ہوں۔" شکنتلا انتہائی سکون سے کہہ رہی تھی۔

"تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... یہ بات اب یا تمہیں پتا ہے یا غالباً سامری اس راز کو پا چکا ہے۔"

"سامری کی شکتی اپرم پار ہے سانپ زادی..... "اچانک کمرے میں سامری کی کڑک دار آواز گونجی..... دونوں نے گردن پھیر کر دیکھا تو سامری جادوگر شکنتلا کے پلنگ پر جوتوں سمیت دراز تھا، اس کے ایک ہاتھ میں پنڈلی کی بوسیدہ ہڈی حسب معمول موجود تھی۔

"سامری کا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

"آؤ سامری آؤ۔ شکنتلا کو تمہارا ہی انتظار تھا۔" شکنتلا پورے اعتماد سے بولی۔ پر یہ کے اب اوسان خطا ہو چکے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب زیادہ دیر وہ اپنے پیروں کو کھڑا نہ رکھ سکے گی۔

"سامری چاہتا تو تمہارے راز کو پل بھر میں مہاراجہ تک پہنچا کر تیرا کریا کرم کروا چکا ہوتا، لیکن افسوس کہ گرو استاد شداد جادوگر کی بدروح نے مجھے اس کام سے منع کر دیا ہے۔ اب گرو جی کے حکم کو ٹالنا سامری کے بس میں کہاں۔"

"سنو سامری..... "شکنتلا اپنی زلفوں کو جھٹک کر شاہانہ چال چلتے ہوئے سامری کے بالکل قریب آ گئی..... "اگر تیرے گرو نے تجھے میرے خلاف چلنے سے منع کیا ہے تو ضرور وہ میری مہان شکتی کو سمجھتا ہوگا۔"

"ناگن..... "سامری زور سے دھاڑا۔

"تیری شکتی..... گرو استاد کے سامنے ایسے ہی ہے جیسے ہاتھی کے سامنے چیونٹی، میں چاہوں تو ابھی تجھے نرکھ میں جھونک دوں۔ پرنتو مجھے گرو کی بدروح نے منع کیا ہے اور مجھے کالی کے مندر میں نوجوان کنیا کا بلیدان کرنے کی ہدایت کی ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ سامری ساری بات سمجھ گئی!" شکنتلا موڑھا کھینچ کر پلنگ کے قریب لا کر سامری کے چہرے کے قریب ہی بیٹھ گئی اور بولی "تمہارا گرو اور تو..... کالی کے سیوک ہو جو ظلم کی دیوی ہے اور ہم ناگ دیوتا کے پجاری ہیں جو رحم کرنا نہیں جانتا۔ ہم دونوں ہی ظلم کی گود میں پروان چڑھے ہیں۔ کیا تم اپنے کسی جاپ یا کالی دیوی پر بلیدان کرتے وقت کسی منش پر دیا کرتے ہو.....؟"

"بالکل نہیں..... "سامری گرجا۔

"جاپ یا کالی کے لیے انسانی بلیدان کے دوران رحم کرنا دیوتاؤں کی توہین ہے۔"

"میں بھی یہی کہتی ہوں سامری..... مجھے بھی انسان بنانے کے لیے انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے سو سال تک ناگ دیوتا کو بلیدان پیش کیے اور اب مجھے اپنا انسانی وجود قائم..... اور جوانی برقرار رکھنے کے لیے ہر ماہ انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اب اگر..... شکنتلا ہو یا سامری..... عام انسانوں پر رحم کرنا شروع کر دیں تو دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر ہم نے ایک دوسرے کے خلاف کام کیا تو بھی دیوتاؤں کا عذاب ہم پر نازل ہوگا۔"

"سامری آؤ ہم مل کر اپنی آشاؤں کو پورا کریں۔" وہ دلیلوں سے سامری کو قائل کرنے لگی۔

"ظاہری شکل و صورت کی طرح باتیں بھی خوب صورتی کرتی ہو ناگن۔" سامری ایک انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تمہاری باتوں پر میں کبھی اعتماد نہ کرتا اگر میرے گرو نے مجھے تمہارے خلاف کام کرنے سے منع نہ کیا ہوتا..... کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ تو سانپ ہے اور سانپ کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ سانپ بے وفائی کی علامت ہے۔ تم لوگ تو اپنی نسل کے دشمن ہو۔"

"سامری..... "شکنتلا کھڑی ہو گئی اور مصنوعی جلال سے بولی۔

"اگر ہم اچھے نہیں ہیں تو..... جادوگروں نے کون سی دنیا میں اپنی عزت بنائی ہے۔ یہ بھی ہر دور میں ذلیل و خوار ہی ہوئے ہیں۔ کبھی کسی مقام پر جادوگر بادشاہ نہیں ہوتا..... تمہاری طرح اگر اپنے آپ کوئی بہت بڑا جادوگر کہلواتا ہے تو اس کا مقام اور اس کی زیادہ سے زیادہ عزت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی عام سے انسان کی حکومت میں شاہی جادوگر بن کر بادشاہ

کے پیچھے دن رات دم ہلاتا رہتا ہے۔"
"شکنتلا......" سامری غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ جادوگروں کی توہین برداشت نہیں کروں گا۔
"شکنتلا سچ کہہ رہی ہے...... سامری...... کہلاتے تم جادوگروں کے بادشاہ ہو...... اور شکنتلا کو پیغام بھجواتے ہو کہ کمرے کے دروازے بند رکھنا میں ملنے آؤں گا۔ ایک عام سے مہاراجہ کا تمہیں اتنا ڈر ہے کہ گندی نالی کی موری سے اندر آتے ہو۔"
"شکنتلا......" سامری نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے بال پکڑ لیے۔ پریہ ایک کونے میں سہمی کھڑی دونوں کی بحث سن رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں مہاراجہ کو اطلاع نہ کر دی جائے۔
"سامری چاہے تو تجھے ابھی نشٹ کر دے مورکھ۔"
"سامری اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ ایک لڑکی پر ہاتھ اٹھانے کے سوا......"
"تو اگر اتنا بڑا جادوگر ہے تو تجھے کسی ریاست کا مہاراجہ ہونا چاہیے۔
اپنے گرو کی بات مان اور میرا ساتھ دے ورنہ تجھ پر کالی دیوی کا عذاب بھی آ سکتا ہے۔ تجھ سے تیری ساری طاقتیں چھین سکتی ہیں۔ کالے علم کا سیوک ہو کر کالی طاقتوں کا راستہ مت روک...... سامری!! اسی میں تیری بھلائی ہے۔"
"کہتی تو تو بھی ٹھیک ہے۔" سامری ٹھنڈا ہوتے ہوئے بولا۔ اس نے شکنتلا کے بال چھوڑ دیے۔ شکنتلا اپنے بالوں کو سہلاتے ہوئے سامری کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور اس کے شانے پکڑتے ہوئے پیار سے بولی......
"سامری آؤ ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور ہر روپ دھار سکتی ہوں اور تو جادوگروں کا بادشاہ۔ ہم دونوں بادشاہ...... اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ تو کالی کا سیوک میں ناگ دیوتا کی داسی، ہم دونوں ظلم کی پیداوار ہیں۔ آؤ کالی طاقتوں کے فروغ کے لیے ایک ہو جائیں۔"
"ٹھیک ہے شکنتلا پر تو...... چند دن صبر کر میں پھر آؤں گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"شکنتلا تمہارا انتظار کرے گی سامری......" شکنتلا نے یقین دلایا۔ اس کے ساتھ ہی سامری غائب ہو گیا۔
"سامری کے جاتے ہی شکنتلا نے ایک لمبی سانس لی...... اور پھر اسے پریہ کا خیال آیا، مڑ کر دیکھا تو پریہ ایک کونے میں کھڑی پسینے میں شرابور تھر تھر کانپ رہی تھی۔
"پریہ...... او پریہ تو ڈر رہی ہے؟" شکنتلا نے آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا...... مہارانی کی آغوش میں آ کر پریہ کو کسی حد تک سکون آیا۔ شکنتلا نے اس کو کھینچ کر پلنگ پر بٹھایا۔
"دیکھ پریہ تو اب میری ساتھی ہے۔ اب تو ڈرنا چھوڑ دے۔ میرے ساتھ رہ۔ زندگی بھر عیش کرے گی اور ایسے مناظر سے تو تجھے روز واسطہ پڑے گا۔ اب اپنے آپ کو ان کا عادی بنا لے۔"
"مہارانی جی......" پریہ نے بمشکل حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔
"بولو...... بولو پریہ!"
"مہارانی جی...... آپ سامری کو کہہ رہی تھیں...... کہ آپ کو انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے۔" پریہ ڈرتے ڈرتے بولی۔
"یہ بات بالکل حقیقت ہے اور ہاں سنو پریہ اور آج کے بعد میرے لیے نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمے داری ہو گی۔ بلکہ آج تجھے میرے لیے ایک خوب صورت، طاقتور اور صحت مند مرد کا بندوبست کرنا ہو گا۔"
"اگر سامری نے ساری باتیں مہاراج کو بتا دیں تو......"
"یہ ناممکن ہے......! ویسے بھی ان تمام باتوں کا اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں اور پریہ......" شکنتلا نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔
"تم اب میری اور سامری کی رازداں ہو...... لہٰذا یہ بات تم بھی پلّے باندھ لو کہ اگر ان میں سے کسی بات کی بھنک

بھی کسی کو پڑی...... تو میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ اگر تم میرا ساتھ مخلصانہ طریقے سے دو گی...... تو تابانہ کی حکومت کے ہاتھ آنے کے بعد شکنتلا اور سامری کے بعد تمہاری حیثیت تیسری بااختیار شخصیت کی سی ہوگی۔ اب تم اچھی طرح سوچ لو...... کہ عیش و عشرت اور بے پناہ اختیارات سے لبریز جیون گزارنا چاہو گی یا دردناک موت......" آخری الفاظ کہتے ہوئے شکنتلا کے لہجے میں بے پناہ سفاکی عود کر آئی تھی...... جس کو محسوس کر کے پریہ شکنتلا کے قدموں میں گر گئی۔

"میں تو آپ کی داسی ہوں حضور آپ کی بات کو کیسے ٹال سکتی ہوں۔ آپ مجھے موم کی گڑیا سمجھیں جس طرح موڑیں گی مڑ جاؤں گی جو روپ بھی بخشیں گی مجھے منظور ہے۔ میں آپ کی مرضی پر چلوں گی۔"

"شاباش پریہ شاباش...... اور دیکھو......" شکنتلا نے اسے نزدیک کرتے ہوئے کہا......"انسانی خون پیے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ ویسے بھی مہاراج رام ناتھ میں جوانوں والی بات نہیں...... تمہیں میرے لیے آج ہی خوب صورت گبرو جوان کا بندوبست کرنا ہوگا۔"

"جو حکم مہارانی جی......" اور پریہ نے سر جھکا دیا۔

☆......☆

پریہ اپنے آرام دہ کمرے میں لیٹی گزشتہ چند روز سے پیش آنے والے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ جنہوں نے اس کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ آج سے چند دن پہلے وہ ایک عام سی باندی تھی۔ پُر مشقت کام، ڈانٹ ڈپٹ، کم کھانا اور بے وجہ مار اس کا مقدر تھی۔ شکنتلا کے کمرے میں پہلے دن ہی اس کے آنے سے تقدیر بدل گئی تھی۔ اسے تمام غلاموں، کنیزوں کی کنیز عالیہ بنا دیا گیا۔ کسی قسم کی مشقت کے بغیر اچھا کھانا، اچھی رہائش، خوب صورت لباس، بے پناہ اختیارات چند دنوں میں ہی پریہ اپنی گزشتہ زندگی کو بھول گئی تھی اور اب سامری کے گھر کی سیر...... وہاں سے چند لمحوں میں جادو کے زور پر محل واپسی، سامری اور شکنتلا کی لڑائی...... پھر صلح...... ملکہ کا ناگن ہونا اور نوجوان خون کی فرمائش اور انکار کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکی۔ "اُفوہ......" گھبرا کر پریہ نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔ یکے بعد دیگرے حیرت انگیز اور عقل سے پرے کے واقعات کہیں اسے پاگل نہ کر دیں لیکن اب اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ شکنتلا اور سامری کا ساتھ دے یا انکار کر دے۔ انکار کی صورت میں شکنتلا اسے قتل کروا سکتی ہے اور وہ خود بھی ناگن ہے اسے زندہ نہ چھوڑے گی۔ مزید یہ کہ سامری بہت بڑا جادوگر ہے۔ اس سے چھپ کر پریہ بے چاری کہاں جا سکتی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم تھا کہ آج اگر شکنتلا اس کو کنیز عالیہ سے ہٹا دے تو اس کی اپنی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ تو دو ٹکے کی نہیں تھی، تو کیوں نہ شکنتلا کا ساتھ دے کر زندگی کو پر لطف بنایا جائے، کیوں کہ اگر اس نے انکار کر دیا...... تو شکنتلا کنیز عالیہ بننے کے لیے جس کنیز کو کہے گی وہ راضی ہو جائے گی، لہٰذا پریہ نے انتہائی سکون سے شکنتلا اور سامری کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس کا دل و دماغ پر سکون تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور نیند کی وادی میں چلی گئی۔ سہ پہر کے وقت پریہ نے آنکھ کھولی اور انتہائی سکون کے ساتھ تو بہ شکن انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی اب اس کا ذہن تر و تازہ تھا...... اور وہ خوش حال اور پر تعیش زندگی کے لیے ہر کام کرنے پر رضامند ہو چکی تھی...... اُٹھ کر اس نے زور سے تالی بجائی تو...... نرملا اندر آ گئی۔ "پھلوں کا رس لاؤ......" اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چند ہی لمحوں بعد "کنیز عالیہ رس حاضر ہے" کی آواز آئی، پریہ نے آنکھیں کھولیں اور نرملا سے رس کا کٹورہ لے کر تکیے سے ٹیک لگا کر ہولے ہولے چسکیاں لینے لگی اور نرملا کو ٹانگیں دبانے کا اشارہ کیا...... نرملا فرماں برداری کے ساتھ پریہ کی ٹانگیں دبانے لگی۔

"نرملا......" پریہ اس سے مخاطب ہوئی......

"رات کو شیلیا...... اور مہاراج میں کیا گفتگو ہوئی......؟"

"کوئی خاص نہیں کنیز عالیہ۔ بس مہاراجہ نے اس سے حال احوال پوچھا...... میں اور پونم...... ساتھ ہی تھیں اور کو شیلیا کو تنہائی کا کوئی موقع فراہم نہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی شکنتلا جی آ گئی تھیں اور انہوں نے ہمیں کو شیلیا کو واپس لے جانے کا اشارہ کر دیا تھا، لہٰذا ہم لوگ مہاراجہ سے اجازت پا کر واپس آ گئے اور آتے ہی کو شیلیا سے وہ لباس اُتروا لیا اور پھر ہم اسے لنگر خانے چھوڑ آئیں۔ جہاں اس کا کام تندور پر روٹیاں پکانا ہے۔"

''شاباش...... نرملا...... اور ایک ضروری بات یہ کہ...... کوشلیا اور سادھنا ماریہ کی حویلی نہ جانے پائیں اور وہاں سے آنے والا کوئی آدمی انہیں نہ ملے...... ورنہ شکنتلا جی جلال میں آ گئیں تو مصیبت بن جائے گی۔''

''آپ قطعاً فکر نہ کریں کنیز عالیہ...... یہ میری ذمے داری ہے۔ آپ کو کبھی شکایت نہ ہوگی۔''

''چلو میرے لیے اشنان کا بندوبست کرو میں نے مہارانی جی سے ملنے جانا ہے۔'' پھر کچھ ہی دیر بعد پریہ تیار ہو کر مہارانی جی کے حضور پہنچ چکی تھی۔ پریہ کو دیکھ کر شکنتلا نے تمام کنیزوں کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اب کمرے میں دونوں تنہا رہ گئیں۔ شکنتلا حسب معمول اپنے پلنگ پر آرام دہ حالت میں نیم دراز اور پریہ ہاتھ باندھے سر جھکائے اس کے پاس کھڑی تھی۔ مہارانی شکنتلا اس وقت پھلوں سے شوق فرما رہی تھیں۔

''پریہ...... تم نے محل سے باہر جانا ہو تو...... کیا کرتی ہو؟''

''حضور اب تو میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا...... لیکن اس سے پہلے تقریباً ناممکن ہی تھا، کیوں کہ کسی بھی کنیز کو باہر جانے کے لیے صدر دروازے پر کنیز خاص سے حاصل کردہ اجازت نامے دکھانا پڑتا تھا اور کنیز خاص کوشلیا تھی جو صرف اپنی منظور نظر کنیزوں کو ہی اجازت نامہ جاری کرتی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ......'' شکنتلا کچھ سوچتے ہوئے بولی...... ''اب تو باہر جا سکتی ہے!''

''جی ہاں مہارانی جی آپ کی کرپا سے......'' وہ شکنتلا کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''ٹھیک ہے آج رات جب رات خاصی گہری ہو جائے تم محل سے باہر نکلنا، میں بھی کسی نہ کسی طرح باہر نکلوں گی۔''

''وہ کس لیے مہارانی جی؟''

''میں اب انسانی خون کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔'' شکنتلا نے پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا، تو خوف کی ایک لہر پریہ کے جسم میں سرایت کر گئی۔ کتنے آرام سے انسانی خون پینے کی بات شکنتلا نے کر دی تھی، جیسے شربت پینے کی بات کی ہو۔

''مہارانی جی! آپ نے مجھے حکم دیا تھا...... میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی غلام کو بہلا پھسلا کر اپنے کمرے میں لا کر اسے پھر کسی طریقے سے آپ کے حوالے کر دوں گی!''

''کچے کام نہیں کرنے پریہ! مہاراجہ کے سامنے مجھ پر پہلا الزام ہی یہ لگا ہے کہ میں ناگن ہوں اور اگر محل میں کسی کا خون پیا گیا تو وہ الزام شک میں اور پھر شک یقین میں بدل جائے گا۔ ابھی سامری بھی پوری طرح قابو میں نہیں آیا۔ میں نہیں چاہتی کھیل بگڑ جائے تم ابھی رہنے دو...... اب تم جا سکتی ہو۔''

☆......☆

''خوب صورت خواب گاہ میں مہاراجہ رام ناتھ اور شکنتلا محو خواب تھے۔ شکنتلا جھوٹ موٹ سو رہی تھی۔ سانپ کی حیثیت سے اس کو سونے کی ضرورت تو نہیں ہوتی تھی۔ البتہ وہ اپنی مرضی سے سو سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ درحقیقت جاگ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور مسہری سے نیچے اُتر گئی پھر آگے بڑھ کر اندر سے چٹخنی لگا دی اور پھر کچھ دیر خاموشی سے کھڑی مہاراجہ کو دیکھتی رہی...... مہاراجہ گہری نیند میں تھے۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ پائنتی کی طرف آئی اور گہری سانس لے کر آہستگی سے پھنکار ماری...... چشم زدن میں شکنتلا ناگن بن گئی۔ اب فرش پر شیش ناگن پھن اٹھائے آہستہ آہستہ مسہری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب وہ مسہری کے پائے پر چڑھتی ہوئی اس کے اوپر آ گئی۔ مہاراجہ کے پاؤں کا نشانہ لے کر پھن اُٹھایا اور ہلکا سا ڈس لیا۔ ڈستے وقت شکنتلا نے تھوڑا سا زہر مہاراجہ کے جسم میں داخل کیا...... کیوں کہ اگر وہ پوری قوت سے ڈستی تو مہاراجہ لمحوں میں نیلا پڑ کر ملک عدم سدھار چکے ہوتے! لیکن معمولی زہر داخل ہونے سے مہاراجہ کا جسم...... ذرا سا جھٹکا کھا کر رک گیا۔ اب مہاراجہ زہر کے اثر سے بے ہوش ہو چکے تھے۔ اور دن چڑھنے سے پہلے ہوش میں آنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ شیش ناگن مسہری سے اُتر کر کھلی کھڑکی کے راستے باغ میں چلی گئی باغ ویران تھا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد ایک پھنکار ماری اب ناگن ایک عقاب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

عقاب بننے کے بعد شکنتلا اوپر کو اُڑی...... وہ عمودی پرواز کے ذریعے خاصی بلندی تک پہنچ گئی۔ اب اس کا رُخ محل سے باہر تھا۔ صدر دروازہ کے خاصا اوپر سے گزر کر وہ باہر نکل گئی...... باہر ویرانی تھی...... اکا دُکا پہرے دار کھڑے تھے۔ محل کے عین سامنے کشادہ راستہ خاصی دور تک سیدھا جاتا تھا۔ اطراف میں درخت تھے...... راستہ خوب صورت ٹائلوں سے بنا تھا، خاصی دور اڑنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ٹائلیں ختم ہوگئی ہیں اب سرخ اینٹوں والا راستہ تھا۔ کچھ دیر اُڑنے کے بعد یہ رستہ بھی کچے پکے راستے میں تبدیل ہوگیا...... اب شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ تابانہ خوش حال ریاست تھی...... راستے خوش نما، مکانات خوب صورت اور درخت اور پودے جابجا تھے۔ شکنتلا نے عقاب کی حیثیت سے اپنی پرواز جاری رکھی...... اب وہ شہر کے اوپر پرواز کر رہی تھی، لیکن اس کی منزل شہر سے کچھ باہر مضافاتی علاقہ تھا جہاں سکون ہو۔ کچھ دیر بعد شہر ختم ہونا شروع ہوگیا اور مکانات ایک دوسرے سے فاصلے پر دکھائی دینے لگے۔ وہ مختلف مکانوں کے اوپر آ کر مکان کو غور سے دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی...... خاصی دیر اس عمل کو دہرانے کے بعد اسے اپنی مرضی کا ایک بڑا حویلی نما مکان پسند آیا...... جس کے صحن میں ایک بگھی کھڑی تھی۔ وہ اُتر کر مکان کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ دور سے اسے ایک کمرے کا روشندان دکھائی دیا۔ وہ اُڑ کر روشندان کے پاس گئی اور اندر جھانکا...... بستر پر ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی جو میاں بیوی معلوم ہوتے تھے، محوِ خواب تھے۔ دونوں ہی صحت مند تھے۔ شکنتلا نے فوراً سانپ کا روپ اختیار کیا اور روشن دان کے راستے اندر چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل تھا اور لالٹین جل رہی تھی۔ شکنتلا پلنگ پر چڑھ گئی اور پھن اٹھا کر لڑکی کے پاؤں پر ڈسا اور لڑکی نیند ہی میں بے ہوش ہوگئی۔ شکنتلا نے انسانی روپ میں آ کر اسے اٹھا کر آہستگی سے پلنگ سے نیچے رکھ دیا۔ اب وہ صبح سے قبل ہوش میں نہیں آ سکتی تھی۔ اب پلنگ پر صحت مند کڑیل جوان اپنے انجام سے بے خبر لیٹا تھا۔ شکنتلا نے لالٹین بجھا دی، کمرے میں اندھیرا ہوگیا...... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا...... لیکن شکنتلا ناگن تھی، اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھیں۔ وہ پلنگ پر چڑھ گئی۔ نوجوان سوتے میں کسمسا اُٹھا، لیکن گہرے اندھیرے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کی جگہ شکنتلا کی پہچان نہ کر سکا...... اور اس کو اپنی مردانہ وار گرفت میں لے لیا۔ چند لمحوں میں مطلع بالکل صاف ہوگیا...... اور شکنتلا نے اپنے ہونٹ نوجوان کی گردن پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کیا اور دانت شہ رگ میں پیوست کر دیے۔ نوجوان کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور تڑپنے کے باوجود بھی شکنتلا نے اس کی آواز نکلنے نہ دی اور اس کا منہ دبائے اور اپنا منہ اس کی شہ رگ سے لگائے اپنی خونی پیاس بجھاتی رہی...... نوجوان کا خون اپنے معدے میں منتقل کر لینے کے بعد وہ اُٹھی...... منہ خون سے لتھڑا ہوا اور آنکھوں میں جنونیت تھی...... اٹھتے ہی وہ ایڑی کے بل گھوم کر ناگن بن گئی اور دیوار پر چڑھتے ہوئے روشندان کے راستے باہر نکلنے لگی۔ باہر نکلتے ہی زور سے پھنکار مار کر عقاب کی شکل اختیار کی اور پھر اونچی اور تیز رفتار پرواز کے ساتھ شاہی محل کی طرف رواں ہوگئی۔

☆......☆

سامری اپنی حویلی کے اندر اسی پراسرار شکل والی لڑکی کے ساتھ اپنے کمرۂ خاص، جسے وہ سامری جادو نگری کہتا تھا، میں کھڑا شفاف پتھر کی مستطیل سل پر سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ہی مہارانی محل سے نکلی اور اب خون پی کر عقاب کی شکل میں واپس اپنے محل میں اُتر کر باغ سے ناگن کی شکل میں کمرے کے اندر داخل ہوئی...... مہاراجہ کے پاؤں پر جہاں اس نے ڈسا تھا...... منہ لگا کر سارا زہر چوسا اور پھر شکنتلا بن کر مہاراجہ کے پہلو میں لیٹ گئی۔ سامری یہ سب کچھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور پھر اس نے سنگِ مرمر سے مشابہ شفاف پتھر پر ہاتھ پھیرا تو سارا منظر غائب ہوگیا۔

''سمترا......'' اس نے آواز لگائی۔

''حکم سامری۔'' سمترا ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ ''تو کچھ مشورہ دے سمترا...... کیا ناگن شکنتلا کے بارے میں مہاراجہ کو سب باتیں بتا کر...... اس کو آگ میں جلا دیا جائے...... یا...... اس کے ساتھ مل کر ریاست تابانہ حاصل کر لیں؟''

''مہاراجہ رام ناتھ کے ساتھ ہماری کوئی ہمدردی یا دشمنی نہیں سامری۔'' سمترا بدستور ہوا میں تیرتے ہوئے بولی...... ''لیکن ناگن ناگ دیوتا کی پہچان ہے، جو ظلم کا دیوتا ہے اور تو کالی کا سیوک ہے، دونوں ہی کنیاؤں کا بلیدان مانگتے ہیں۔

ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو کالی طاقتوں کو آپس میں ٹکرا دے...... پھر تیرا اتنا بڑا جادوگر ہونا کس کام کا کہ تو رام ناتھ کا ماتحت ہے۔ میں کہتی ہوں کہ شکنتلا کے ساتھ بیاہ کر لے اور ٹھاٹ سے حکومت کر...... تاکہ تیری حکومت میں سمترا بھی انسانی خون حاصل کر سکے، ورنہ تو میرے پیر پچھلی جانب دیکھ کر لوگ پہچان لیتے ہیں۔ شکنتلا مزے میں ہے، وہ خوب صورت لڑکی بن کر جوانی کے مزے بھی لوٹتی ہے اور خون سے پیاس بھی بجھا لیتی ہے۔"

"ٹھیک ہے سمترا...... میں جلد ہی شکنتلا سے رابطہ کرتا ہوں۔" سامری شاید قائل ہو رہا تھا۔

☆......☆

آج صبح سے ہی شکنتلا شوخ اور ترو تازہ لگ رہی تھی۔ مہاراجہ کے ساتھ ناشتا کرنے کے بعد اس نے بناؤ سنگھار اپنی خصوصی کنیزوں سے مکمل کروایا...... آج اس نے مہاراجہ سے فرمائش کی تھی کہ وہ بھی دربار میں جائے گی اور اس کے علاوہ واپسی پر پورے محل کا دورہ بھی کرنا چاہے گی، لیکن یہ بات سوائے مہاراجہ کے کسی اور کو معلوم نہ تھی۔ شکنتلا...... اس وقت نہایت خوب صورت لباس میں ملبوس تھی، کئی کنیزیں پوشاک زمین پر گرنے سے بچانے کے لیے پیچھے سے لباس تھامے چل رہی تھیں۔ آج خاص طور پر خواب گاہ سے لے کر دربار تک قالین بچھایا گیا تھا۔ پہلے جب شادی کی رسوم ادا کی گئی تھیں اس وقت شکنتلا زیادہ وقت گھونگھٹ میں رہی تھی، لہٰذا درباریوں کو اس کے حسن کا جلوہ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا تھا، لیکن آج وہ اپنے حسن کا مکمل دیدار کرانے کے خیال میں تھی۔ وہ مہاراجہ رام ناتھ کے پہلو میں چلتے ہوئے جب دربار میں داخل ہوئی تو اس وقت تک تمام مصاحبین پہنچ چکے تھے۔ رانی ماریہ بھی اپنے تخت پر بیٹھی تھی۔ تمام لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے، پھر مہاراجہ اور مہارانی اپنی جگہوں پر بیٹھے تو تمام مصاحبین بیٹھ گئے۔ آج مہارانی شکنتلا بغیر کسی گھونگھٹ کے پورے طمطراق سے اپنی جگہ براجمان تھی اور سرکاری کارروائی مکمل دل جمعی کے ساتھ دیکھ رہی تھی، لیکن اس کی نظریں پورے دربار کا جائزہ لیتیں۔ آخر کار سپہ سالار بلگرام پر آ کر ٹھہر گئیں جو نہایت اونچے قد کاٹھ اور کسرتی جسم کا مالک تھا...... ایک دفعہ بلگرام نے جب شکنتلا کو دیکھا تو...... اسے اپنی طرف دیکھتے پایا...... تھوڑی ہی دیر بعد سپہ سالار کی نظریں مہارانی سے چار ہوئیں تو بھی وہ اسے گھور رہی تھی...... بلگرام گڑبڑا گیا۔ اس نے فوراً نظریں پھیر لیں، لیکن جب تیسری دفعہ بھی اس نے مہارانی کو اپنی طرف مکمل متوجہ پایا تو پریشانی فطری تھی۔ مہاراجہ مختلف فیصلے کر رہے تھے۔ سرکاری کاموں کے لیے ہدایات اور عنایات جاری تھیں، جب کہ شکنتلا اب تک سپہ سالار کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد...... شکنتلا نے مہاراجہ کو مخاطب کر کے دربار سے جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا...... لہٰذا مہاراجہ نے پورے اعزاز کے ساتھ واپس بھجوانے کا بندوبست فرمایا۔ بلگرام حیران تھا کہ مہارانی کیوں اتنا زیادہ اس کی طرف متوجہ تھی۔ ادھر شکنتلا نے مہاراجہ کو اپنے ساتھ بلگرام کو بھیجنے کی درخواست کی۔ رام ناتھ نے بلگرام کو تھوڑی دیر بعد بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ شکنتلا نے ایک سرے سے محل کا دورہ کرنا شروع کیا۔ پریہ، کملا، پونم اور دوسری کنیزوں کی ایک فوج اور شاہی محل کی انتظامیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ سب سے پہلے دربار سے باہر آتے ہی اس نے محافظ دستے کے سربراہ سے پوچھا کہ راج محل کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات ہوتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ محل جو کئی ہزار ایکڑ پر مشتمل ہے، اس کے گرد موٹی سیسہ پلائی دیوار ہے یہ دیوار دس گز اونچی اور تین گز چوڑی ہے۔ اس کے اوپر ہر وقت مسلح افواج کے دستے تعینات رہتے ہیں اور ہر پچاس گز کے فاصلے پر گرم تیل یا پانی کے ابلتے کڑاہ ہر وقت تیار ہوتے ہیں، تاکہ اگر بیرونی فوج حملہ آور ہو کر شہر پر قبضہ بھی کر لے تو محل آسانی سے فتح نہ کر سکے۔ یہ محل نہ صرف پُر آسائش ہے بلکہ حفاظتی نکتۂ نظر سے کسی قلعے سے کم نہیں۔ شکنتلا نے تھوڑی دیر محل کی دیوار پر چڑھ کر سرسری نظر سے سارا انتظام دیکھا اور نیچے اُتر گئی۔ اب وہ...... محل کی انتظامیہ کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ انتظامیہ کا سربراہ ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہو گیا۔ اس کو یہ توقع نہ تھی...... کہ مہارانی اچانک دورے پر آ جائے گی۔

"آ...... آ...... آیئے آیئے تشریف لایئے مہارانی جی......" وہ ہکلانے لگا۔

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط مارچ میں ملاحظہ کیجیے)

شعلہ ساماں تحریریں

پہلا شعلہ

تم کون ہو...؟

زاہدہ حنا

معاشرے کی گندگی سے وجود میں آنے والا وہ سچ جس سے بھلا کون نظر چرا سکتا ہے

اس بھدے سچ کو زاہدہ حنا کے جادوگر قلم نے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اندھیرے ڈھول کے اندر تھا اور ڈھول بے طرح پیٹا جا رہا تھا۔

کیا آنکھ واقعی کھل گئی تھی؟

آنکھ کھلتے ہی روشنی بھی ساتھ چلی آتی ہے، جبکہ وہاں روشنی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس کی کنپٹیاں ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ پھڑکنے لگیں...... تیز اور تیز۔ اس نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونسنا چاہیں، لیکن کانوں کے سوراخ چھوٹے ہو گئے تھے۔ اور اُنگلیاں ککڑیوں میں بدل گئی تھیں۔

"کراری ککڑیاں ہیں۔ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں۔" شور کے شانوں پر بیٹھ کر ایک آواز جانے کہاں سے آئی۔

اس نے سر کو جھٹکا۔ "نہیں...... یہ اُنگلیاں ہیں۔ میری اُنگلیاں۔"

کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "انگلیاں تو لکھتی ہیں، رنگ بھرتی ہیں۔ یہ ککڑیاں ہیں جو کاٹی جاتی ہیں، کھائی جاتی ہیں۔"

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ ککڑیاں ہوتیں تو کب کی کھالی جاتیں۔ یہ انگلیاں ہیں۔" اس نے اپنی انگلیوں کو لہرایا، پھر بے تابی سے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے ٹٹولا اور خود کو تسلی دی۔ وہ لرز رہی تھیں۔ اس نے ان کی لرزش کو محسوس کیا۔

گھر کے پچھواڑے جو باڑی تھی، اس میں ککڑیوں کی ایک بیل تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب وہ گھونسلوں سے انڈے نکالنے کے لیے اور انہیں رنگ کر پھر سے گھونسلوں میں رکھ دینے کے لیے پیڑوں پر چڑھتا اور اس کی نظر ککڑیوں کی بیل پر پڑتی تو اسے لٹکتی ہوئی ککڑیاں ہوا سے ہولے ہولے لرزتی ہوئی نظر آتیں۔ سیکڑوں اُنگلیاں جو اسے اشارے سے منع کرتیں۔ "یہ نہ کرنا۔ یہ نہ کرنا۔"

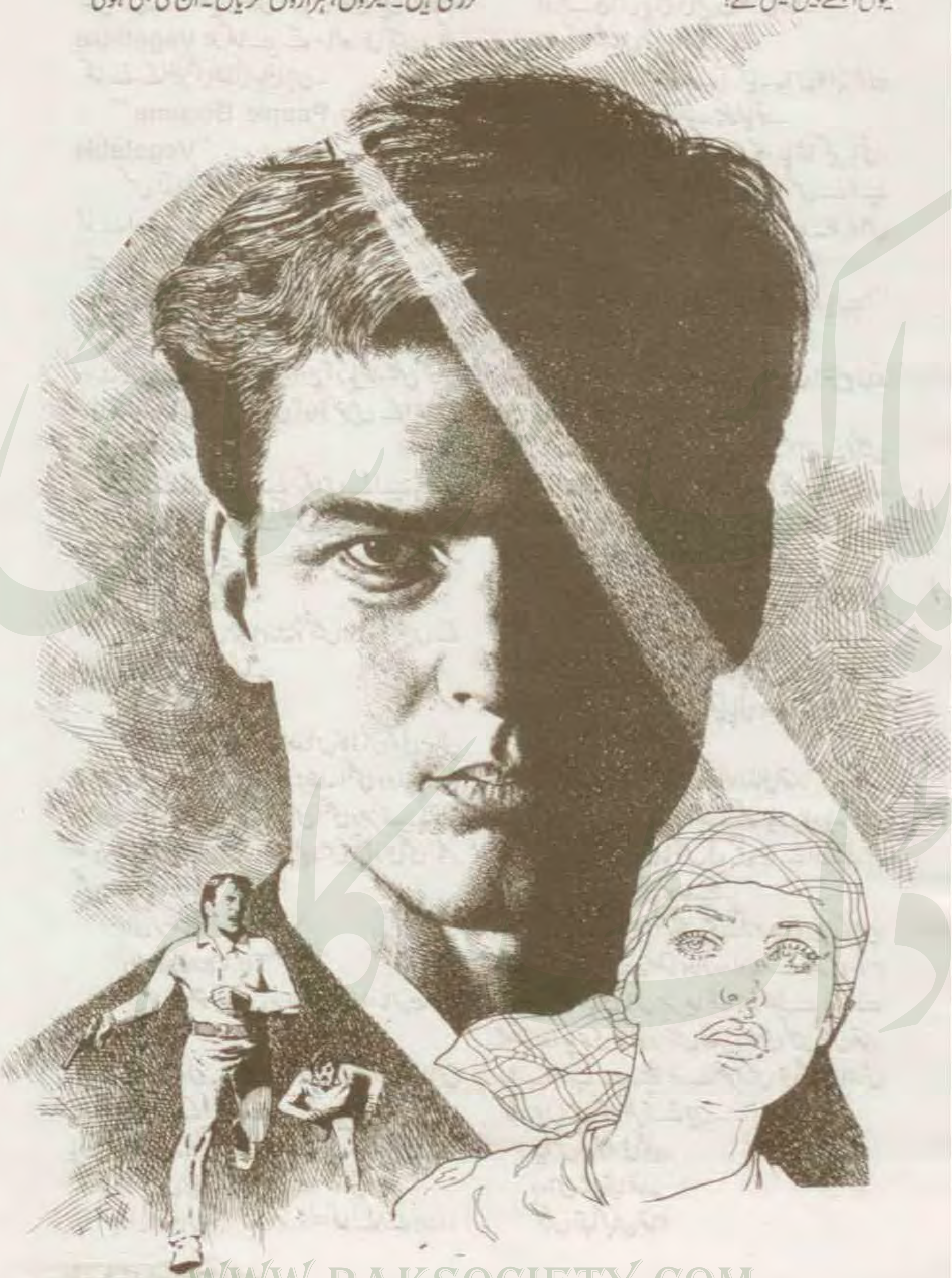
اماں کی آواز اس تک آئی۔ "ہاں ہم نے تو تمہیں بہت سمجھایا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں سائے سے لہرائے۔ اس نے سسکی لی۔ "آپ یقین کریں اماں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو بس پیڑ پر چڑھا تھا۔"

پھر اسے خیال آیا کہ وہ پیڑ پر کیوں چڑھا تھا؟ وہاں تو کوئی گھونسلا نہ تھا۔ گھونسلے میں انڈے نہ تھے وہ تو بس سر تھے اور سروں میں سفید و سیاہ خواب تھے۔ اڑے اڑے سے، مٹے مٹے سے، اُس نے انہیں اُمید رنگوں میں رنگنا چاہا تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ کی نسبت رنگین

تصویریں تو سب ہی کو اچھی لگتی ہیں، تو پھر رنگین خواب کیوں اچھے نہیں لگیں گے؟

تیز ہوا شور مچاتی ہوئی چلتی ہے اس لیے ککڑیاں لرزتی ہیں۔ سیکڑوں، ہزاروں ککڑیاں۔ ان کی ہلتی ہوئی



انگلیاں مجھے منع کرتی ہیں۔ "یہ مت کرو، یہ مت کرو۔" لیکن نہیں۔ وہ انگلیاں نہیں ککڑیاں ہوتی ہیں Raw Vegetable جو کھانے کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ کھانے کے بغیر بھی کھائی جاتی ہیں۔

"But When People Become Vegetable"

کس قدر فضول بات ہے۔ جب آلو، بینگن، ٹنڈے اور ٹماٹر انسان نہیں ہو سکتے تو انسان سبزی میں کیسے بدل سکتے ہیں؟

سر ہنڈولے میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ رہٹ میں بٹھا دیا گیا۔ رہٹ تیزی سے نیچے جا رہا تھا، اُوپر آ رہا تھا، لیکن کنواں خالی تھا، اندھا تھا اور ڈھول کی آواز کنویں کے اندر بھی آ رہی تھی۔

ہنڈولے میں بیٹھے ہوئے سر کو اس نے اپنے ہاتھوں سے تھام لیا، انگلیاں چپچپانے لگیں۔ ایک دوسرے سے چپکنے لگیں، اس نے حیرت سے اپنی انگلیوں کو چکھا۔ وہ شاید نمک کی بنی ہوئی تھیں۔

"لیکن نمک میں چپچپاہٹ تو نہیں ہوتی؟" اس کے ذہن نے ایک دم سوال کیا۔

سوال!

گھنٹوں، دن یا صدیوں بعد اس کا ذہن کوئی سوال قائم کر سکا تھا۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ابھی وہ زندہ تھا، گردن پر رکھے ہوئے سر میں ذہن ابھی دھڑک رہا تھا۔ سوچ سکتا تھا۔ ڈھول کی آواز پور پور میں چیخ رہی تھی، پھر بھی سوال کر سکتا تھا۔

سوال کر سکتا؟

"To Question"

ذہن کا وہ ستون جس پر انسان اور انسانیت قائم ہے۔

اب وہ ڈھول کے اندر لیٹا نہیں، بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کان ڈھول کے فرش سے دُور تھے۔ شور اس سے ایک یا دو سینٹی میٹر دور ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی چپچپی انگلیوں کو منہ میں لیا تو شدید بھوک کا احساس ہوا۔

چاول اور دال کا آخری لقمہ..... کھانے کے بعد وہ اسی طرح انگلیاں چاٹتا تھا۔

اور تب سچ اس پر صبح کی طرح طلوع ہوا۔

اس کی انگلیاں خون آلود تھیں۔

شور پر خون کا ذائقہ غالب آ گیا۔ یہ اس کا اپنا خون تھا۔ اس نے اپنے خون کا نمک چکھ لیا تھا۔

"تو کیا میں سلجوقیوں کے عہد کا، چاشنا گیر باشی، ہوں۔ مجھ سے بڑا چکھنے والا کون ہوگا کہ جس نے اپنے خون کا نمک چکھا۔" اس کے سوئے ہوئے حواس آنکھیں ملنے لگے۔

"ارے کم بخت اتنا نمک کیوں جھونک دیا ہے؟" لتاں انجم کو پھٹکار رہی تھیں۔

ان کی آواز سنتے ہی بھوک نے اس کی انتڑیوں کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

"اماں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔" اس نے انہیں آواز دی۔ "دال چاول پر اچار کی پھانک رکھ دیں۔ چاول گرم ہوں تو ذرا سا گھی بھی......" تاریک اندھیرے میں رنگ لہرائے اور منہ ذائقوں سے بھر گیا۔

"کس قدر نیند آ رہی ہے۔" اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔

"جانے انجم کہاں رہ گئی۔ شاید میرے اُونگھتے میں وہ سینی رکھ گئی۔" اس نے اپنی کپکپاتی ہوئی نمکین انگلیوں سے فرش پر سینی کو ٹٹولا۔

فرش کھردرا تھا، سیلن زدہ تھا اور خالی تھا۔

خالی فرش نے اسے سب کچھ یاد دلا دیا۔ جیسے تاریک کمرے میں کوئی ماچس کی تیلی جلائے اور لمحے بھر کے لیے سارا کمرہ روشن ہو جائے۔

لتاں نہیں تھیں، انجم نہیں تھی۔ گرم چاولوں کے اوپر رکھا ہوا اور نرمی سے پگھلتا ہوا زرد اور دانے دار گھی، آم کے اچار کی سیاہی مائل سبز پھانک اور ٹھنڈے پانی سے چھلکتا ہوا چاندی کا کٹورا نہیں تھا۔ کچھ بھی کہیں نہیں تھا۔

سراب دھوپ سے تپتے ہوئے صحرا میں ہی نہیں، اندھی کوٹھریوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

یہ اُس کی کوٹھری تھی۔

وہ اس میں تنہا تھا۔

نہیں، تنہا کہاں تھا؟

اس کے ساتھ اس کی پیاس تھی، بھوک تھی۔ اس کا بدن تھا جس میں اب اس کے بجائے درد رہتا تھا۔ وہ سمٹ سمٹا کر بس سر میں چلا گیا تھا اور کبھی کبھی تو اسے گمان گزرتا تھا کہ شاید وہ اپنے سر میں بھی نہیں رہتا۔

وہ تنہا تو نہ تھا، ایک ہجوم میں تھا۔ اپنے سنگی ساتھیوں میں گھرا ہوا۔ یہ زخم ہے۔ یہ جلن ہے۔ یہ خراش ہے۔ یہ سوجن ہے اور سب سے آگے درد ہے۔ نفیری بجاتا ہوا، اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہوا۔

وہ اسے ایک بار پھر کوٹھری میں پھینک گئے تھے اور اب اپنے بھاری بوٹوں سے کوٹھری کی کھوکھلی چھت پر کود رہے تھے۔ نچلی منزل سے کوٹھری کے کھوکھلے فرش پر ڈنڈے مار رہے تھے۔ دھپ دھپ۔ ٹھک ٹھک، ناقابلِ برداشت شور چھت سے برس رہا تھا۔ فرش سے اُبل رہا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور گٹھڑی بن گیا۔ سوجے ہوئے گھٹنوں نے اس کے کانوں کو ڈھانپ لیا۔ شور اب ایک اور سینٹی میٹر دور ہو گیا تھا۔

بدن کا ہر مسام کان بن جائے اور آواز کا مطلب ہی صرف شور ہو تو ایک سینٹی میٹر کی دوری بھی بہت ہوتی ہے۔ آرام، درد، سناٹا، شور۔ یہ سب اضافی ہیں۔ چھت پر کودنے والے اگر دو منٹ کے لیے اپنے کودنے کی رفتار دھیمی کر دیں تو شور کے تسلسل میں دو منٹ کی یہ کمی سکون کی دو صدیاں ہیں۔

دونوں ہاتھوں کو موڑ کر پشت پر باندھ دیا گیا ہو اور بدن پر چلتے ہوئے کاکروچ کو ہٹانا ممکن نہ ہو۔ ہونٹوں کے کناروں سے بہہ نکلنے والی رال اور خون کو چاٹنے والی مکھیاں اُڑائی نہ جا سکتی ہوں، پھر چوبیس گھنٹوں بعد مڑے ہوئے ہاتھ کھول کر انہیں سامنے کی طرف کر کے ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں تو یہ کتنا بڑا عیش ہے۔ بغلوں کے نرم گوشت میں اور بازوؤں کی مچھلیوں میں رہ رہ کر کیسا آرام بجھتا ہے۔ مکھیاں اُڑائی جا سکتی ہیں۔ لمبی لمبی مونچھوں اور بڑے بڑے ٹانگروں والے کاکروچوں کو انگوٹھے اور مشتری کی اُنگلی کی ہلکی سی چوٹ سے جھٹکا جا سکتا ہے۔

جانے کتنی صدیاں وہ گھٹنوں سے اپنے کان ڈھانپے بیٹھا رہا۔ ریڑھ کی ہڈی کمان ہو گئی تھی، پھر اچانک ہی شور مچاتا ہوا ڈھول صرف اندھیری کوٹھری رہ گیا۔ کھوکھلی چھت پر کودنے والے اور کھوکھلے فرش کو ڈنڈوں سے پیٹنے والے چلے گئے تھے۔ ہر طرف وہ مہیب سناٹا تھا جو کائنات کی تخلیق سے پہلے رہا ہو گا۔

وہ اب ٹھیک تھا۔ مربوط انداز میں سوچ سکتا تھا۔ شور نہ ہو تو بھوک، پیاس اور درد سب سے نمٹا جا سکتا ہے۔

"یہ جو چلے گئے ہیں تو ان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ہو گی۔ تھک گئے ہوں گے کود کود کر، اب اپنے گھروں میں جا کر آرام کریں گے۔"

اسے اپنا گھر یاد آیا۔ نیم کے پیڑ کی چھاؤں سے بھرا ہوا آنگن موگرے، بیلے، مدھو مالتی اور چمپا سے مہکتی ہوئی کیاریاں۔

ذہن پرانی یادوں کے رنگ چھوڑ کر، کسی تتلی کی طرح اس کی پہنچ سے دُور ہو گیا تھا۔ جو چیزیں پہنچ میں نہ رہیں وہ کس قدر قیمتی ہو جاتی ہیں۔ اُس نے گہری سانس لی اور مسکرانا چاہا، لیکن کٹی ہوئی باچھوں میں چڑچڑاہٹ ہونے لگی۔

کچھ دیر بعد دوسرے آ جائیں گے۔ وہ تازہ دم ہوں گے۔ شور بھی تازہ دم ہو جائے گا، مجھے سوچنا چاہیے، ذہن کو کام کرنا چاہیے۔ وہ کہیں سوچنا بھول نہ جائے مجھے مربوط باتیں سوچنا چاہئیں۔ ایک خیال دوسرے خیال سے جڑا ہوا۔ ایک یاد، دوسری یاد سے لپٹی ہوئی۔

وہ ہمت کر کے اٹھا تو پیروں کی بیڑیاں بج اٹھیں۔ اس نے سنبھل سنبھل کر چلنا شروع کیا۔ چار قدم چوڑائی۔ چھ قدم لمبائی۔ اندھیرے میں چلتے ہوئے قدم گننا ضروری ہے، ورنہ سر دیوار سے ٹکرا جاتا ہے۔

بدن کا ایک ایک جوڑ اور گوشت کا ایک ایک ریزہ فریاد کر رہا تھا۔ وہ چند ہی منٹ میں تھک گیا اور پہلو کے بل دراز ہو گیا۔ بدن لیٹ گیا اور ذہن نے جوگیوں کی طرح آسن جمایا۔

وہ بدن کے راستے ذہن کو توڑنا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ جس ذہن میں یقین اور ارادہ رہتا ہو، وہ بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس کا راستہ الگ ہوتا ہے۔

بدن کی اپنی محدودرات ہوتی ہے۔ دن ٹوتھری۔ دن ٹو تھری۔ بدن "Jogging" کرتا ہے۔ تازہ دم رہنے کے لیے، زندہ رہنے کے لیے اور ذہن میں ارتکاز کرتا ہے۔ مربوط خیال۔ ایک دوسرے میں زنجیر کی طرح پرویا ہوا۔

وہ مجھے لائے تھے؟

جانے کب لائے تھے!

اُسے یاد رہتا بھی تو کیسے؟

وہ کہاں کہاں نہیں پھرایا گیا تھا۔ ایک حوالات سے دوسری حوالات۔ ایک کوارٹر گارڈ سے دوسرے کوارٹر گارڈ۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری۔ ایک کوٹھری وہ بھی جو دائرہ نما تھی اور جس میں رہنے کے چند دنوں بعد ہی وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ سیدھا کھڑا ہو سکے۔ کھڑے ہوتے ہی اُسے چکر آنے لگتے تھے اور ایک کوٹھری وہ بھی جو اس کے قد سے آدھی تھی جیسے کوئی سگ خانہ ہو۔ اس میں وہ ہفتوں چاروں ہاتھ پیروں پر چند قدم چلتا تھا اور پھر دیواریں اس کا راستہ روک لیتی تھیں، جو اتنی تنگ تھی کہ اس میں پیر پھیلا کر سویا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ اُسے کہاں کہاں نہیں لے گئے تھے؟

یہ بات تو ان کی سمجھ میں بہت دیر سے آئی تھی کہ وہ "شہزادہ" ہے اور شہزادے محلوں اور قلعوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ محل اب نہیں رہے تھے۔ سو وہ اسے "قلعہ" میں لے آئے تھے کہ یہی اس کے شایانِ شان تھا۔

انہوں نے جب اسے اپنی تحویل میں لیا تو سب سے پہلے اس کی گھڑی اتار لی تھی۔ گھڑی چلتی بھی رہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آمروں کے بنوائے ہوئے قید خانے ہوں یا بادشاہوں کے تعمیر کروائے ہوئے قلعے اور ان قلعوں کے تہہ خانے ہوں، جن میں ہوا تک نہ آتی ہو تو روشنی کی کرن کہاں سے آئے گی کہ دن اور رات کا حساب رکھا جا سکے۔ صبح کے پانچ بجے اور شام کے پانچ بجے میں فرق کیا جا سکے۔

اس قلعے میں خواب نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ یہاں وہ شہزادیاں حاشیۂ خیال میں نہیں آتی تھیں، جن کے اشارۂ ابرو سے ہر زنجیر پگھل جائے اور زیرِ زمین غلام گردشوں میں لگے ہوئے میخوں جڑے دروازے اور آہنی قفل خوابوں میں ہی کھل جائیں۔

یہاں وہ غلام تھے جو آقا بن بیٹھے تھے، وہ خواجہ سرا تھے، جنہیں اس بات پر اصرار تھا کہ وہ آختہ نہیں کیے گئے اور جو کہانیوں کے دم کٹے لومڑ کی طرح ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ خواجہ سراؤں کی تعداد میں اضافہ کیسے ہو۔

بدیسی آقا رخصت ہو چکے تھے اور یہ خواجہ سرا ان کی کمال نیابت کر رہے تھے۔ یہ ان بستیوں کے فاتح تھے جن کی حفاظت ان کا روزگار تھی۔ یہ ان نجتوں کے قاتل تھے جن کا وہ نمک کھاتے تھے۔ نوآبادیات کی تجربہ گاہ میں انہیں سکھا دیا گیا تھا کہ قوموں کے ساتھ زنا بالجبر کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی قوم کو آختہ کرنا ہو تو اس کے بازو، اس کی پنڈلیاں، اس کے شانے کن مفادات کے تسموں سے باندھے جاتے ہیں۔

بدن پر کوئی کاکروچ چلا تو اس نے چٹکی مار کر اسے دوڑا دیا۔ تسموں کے خیال پر اسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے اس نے تسمے نہیں باندھے تھے۔ کس چیز کے تسمے باندھتا؟ اس نے تو جانے کب سے جوتے نہیں پہنے تھے۔ جوتوں کے خیال پر اسے ہنسی آئی اور اس نے پیروں کو جنبش دی۔

اندھیری کوٹھری میں بیڑیوں کی کسمساہٹ گونج گئی۔

بیڑیاں پہننے والے پیروں کو جوتوں کی کیا ضرورت تھی؟

انہوں نے جب اسے پکڑا تب بھی وہ ننگے پیر تھا۔ اس کی آنکھ کسی آواز سے کھلی تھی۔ کوئی بُری طرح دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ وہ نیند کا ماتا بوکھلایا ہوا بستر سے اُٹھا تھا اور ننگے پیر دروازہ کھولنے چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آئے تھے۔

وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے، رائفل کے کندھوں سے پسلیوں، کمر کے نچلے حصے اور پیٹ پر مارتے ہوئے لے گئے تھے۔ اس کی چپلیں وہیں پلنگ کے نیچے رہ گئی تھیں۔ جوتے بھی کمرے میں ہی چھوٹ گئے تھے، جیسے سان تیاگو کے اسٹوڈیونا سینول میں ہزاروں جوتے رہ گئے تھے۔ ان کے پہننے والے چلے گئے تھے۔ ہر سائز کے، ہر رنگ کے جوتے، ان کے پہننے

والوں میں آٹھ اور نو سال کے بچے تھے، بوڑھے کلرک تھے۔ مزدور اور شاعر تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کارکن تھے۔ صحافی اور ادیب وغیرہ بھی شامل تھے اور ہاں ان میں وکٹر جارا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اپنی زخمی اور ٹھٹھری ہوئی انگلیوں کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ وہ ان انگلیوں سے لکھتا تھا اور وکٹر کی انگلیاں گٹار کے تاروں کو زندہ کرتی تھیں، انہیں آواز بخشتی تھیں۔

وکٹر کی بستیوں اور شہروں کی حفاظت کرنے والوں اور اس حفاظت کی کمائی کھانے والوں نے اپنے ہی شہروں اور نہتے شہریوں کو جب فتح کیا تو وہ ہزاروں کو کھدیڑ کر اسٹیڈیم میں لے آئے۔ وہ اسٹیڈیم جس میں کھلاڑیوں کی ہنر مندی دیکھی جاتی تھی اور جہاں فاتحوں پر پھول پھینکے جاتے تھے، اسی میں نہتوں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا، پھر وہ وکٹر جارا کو گھسیٹتے ہوئے اور سنگینیں چبھوتے ہوئے لائے۔

وکٹر کو یوں لے کر آنے والے اس سے اپنی مدح سننا چاہتے تھے تاکہ اُسے معاف کر سکیں، لیکن جب اس کے گلے سے ان کے لیے کوئی آواز نہ نکلی تو انہوں نے اسے مارا۔ اس پر تھوکا، اس کی اُنگلیاں توڑیں اور پھر بھی جب وہ گونگا رہا تو ایک میز لائی گئی جس پر سفید میز پوش پھڑ پھڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اس میز پر رکھے گئے اور ان ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو چاپڑ سے کاٹ دیا گیا، جیسے بڑے ہوٹلوں کے باورچی خانوں میں گاجریں، مولیاں اور ککڑیاں کاٹی جاتی ہیں۔ وہ ککڑیاں نہیں انگلیاں تھیں۔ وکٹر کی انگلیاں کٹ گئیں، لیکن اس کا حلقوم ابھی اس کا تھا۔ تب اس نے لہولہان ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اذیت سے مجروح آواز میں اپنے لوگوں کو آخری نغمہ سنانا۔

سب کی نظروں میں موت منجمد ہے
فوج اپنا کام بہت سلیقے سے کرتی ہے
خون ان کے لیے تمغا ہے
اور قتل عام
مردانگی اور بہادری کا نشان

اس نے جلدی سے اپنی انگلیوں کو ٹٹولا۔ وہ موجود تھیں۔ ابھی انہوں نے اس کی اُنگلیاں نہیں کاٹی تھیں، لیکن کتنے ہی دنوں سے انہوں نے قلم نہیں پکڑا تھا۔ وہ کاٹی نہیں گئی تھیں پھر بھی کٹ گئی تھیں۔

”کہیں میں لکھنا ہی نہ بھول جاؤں۔“ اسے خیال آیا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کی بھوکی انتڑیوں میں گرہ لگ گئی۔ اس نے مشتری کی اُنگلی سے فرش پر اپنا نام لکھنا چاہا، لیکن کھردرا فرش اس کی انگلیوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا، تب اس نے ہَوا میں انگلی گھمائی۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور وہ اپنی انگلی کو ہَوا میں حرکت کرتے اور اپنے نام کے دائرے بناتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ناہید نے اپنی چھنگلیا سے اس کے آنسو پُونچھے۔

”چھی...... مرد کہیں روتے ہیں۔“

”میں رو کب رہا ہوں۔“ اس نے پلکیں پٹپٹائیں۔

”تو کیا ہنس رہے ہو۔؟ اچھا آؤ میرا ہاتھ تھام لو، میں تمہیں لے چلتی ہوں۔“

”لیکن یہاں تو آہنی دروازے ہیں۔ دروازوں پر قفل ہیں اور مقفل دروازوں کے باہر پہرے دار ہیں۔“ اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ ”میں اس اندھیرے گھر میں ہوں جس میں داخل ہونے والا کبھی باہر نہیں نکلتا۔ وہ راستہ جس سے لوٹنے کی کوئی راہ نہیں۔ وہ مکان جس میں روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا اور جہاں دروازوں اور تالوں پر گرد جمی رہتی ہے۔“

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی کے شیرازی کبوتر اندھیری کوٹھری میں پَر مارنے لگے۔ وہ مصریوں کے لیے پرندہ تھی، بونو۔ یونانیوں کے لیے وینس تھی۔ سمیریوں کے لیے عشتار اور فنیقیوں کے لیے عشتروت، اہل فارس اسے ناہید پکارتے تھے۔

میں عشتار ہوں، تم تموز ہو۔ تم پاتال میں قید ہو اور میں تمہیں لینے کے لیے آئی ہوں، ایک روشن ہاتھ اندھیرے میں تیرتا ہوا اس تک آیا اور اس نے روشنی کو تھام لیا۔

ہاں وہ ناہید تھی۔ زہرہ تھی۔ شام کا پہلا تارا تھی۔ ستارۂ سحر تھی۔ وہ سمیری میں زب اور اکادی میں دِلبت تھی۔ آسمانوں کی ملکہ تھی۔ اوشا تھی۔ اناہیت تھی۔ افزائش کی دیوی تھی۔ اشورو عشتر تھی۔ وہ زندگی تھی، وہ صبح

کا اجالا تھی۔

اس کی پُر جلال آواز اندھیرے میں مشعل کی طرح بھڑکی۔ وہ پہرے داروں سے اور ان کے آقاؤں سے مخاطب تھی۔

"پھاٹک کھولو ورنہ میں دروازوں کو توڑ دوں گی
ان کی چولیں اُکھاڑ دوں گی
اور مُردوں کو زندہ کر دوں گی
یہاں تک کہ ان کی تعداد زندوں سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔"

وہ اسے لے کر تیرتی ہوئی چلی۔ بند دروازہ موم کی طرح پگھلنے لگا۔ پگھلتے ہوئے موم کو دیکھ کر وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹھکا، اور اسی لمحے روشنی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ ناہید غروب ہوگئی۔ وہ دیوار سے سر ٹکرانے لگا، ہچکیوں سے رونے لگا۔

کوٹھری کی دیواروں سے شور پھوٹنے لگا۔ اس مرتبہ شور مچانے والے انسان نہیں تھے۔ ان کی بنائی ہوئی مشینیں تھیں۔ دیواریں چیخ رہی تھیں۔ ہذیانی انداز میں ان سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کراہنے والوں کی، مرنے والوں کی، عالمِ وحشت میں ہنسنے والوں کی، شدتِ اذیت سے حیوان بن جانے والوں کی۔

اُس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا چاہیں، لیکن انگلیاں کہاں تھیں؟ اس کے پاس تو بس ٹکڑیاں تھیں۔ شیطان اس کے کانوں کے راستے اس کے ذہن میں ٹھس رہا تھا۔ سوچنے کے عمل کو اپنی ایڑیوں سے کچل رہا تھا۔

وہ شور کے سمندر میں مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں تم سے اونچی آواز میں چیخ سکتا ہوں۔ شور مچا سکتا ہوں، وہ زور زور سے چیخنے لگا، قہقہے مارنے لگا۔ اس کا سوکھا ہوا حلق، ہرن کی دُھوپ کھائی ہوئی کچی کھال کی طرح تڑخنے لگا۔

☆......☆

پہلی ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی اور دوسری اس کی بائیں پنڈلی پر، وہ چونک گیا۔ دیواریں خاموش تھیں اور جانے کب سے خاموش تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کوٹھری میں اس قدر تیز روشنی تھی کہ اس کی آنکھیں جو اب اندھیرے میں رہتی تھیں، اس روشنی میں ٹمٹمانے لگیں۔

"اسے اٹھاؤ، ایک تحکمانہ آواز گونجی۔ یہ ان مہیب سایوں میں سے کسی ایک کی تھی جو دیوار پر بن اور بگڑ رہے تھے۔

اسے اٹھا لیا گیا۔ وہ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹ رہے تھے۔ بیروں میں پڑا ہوا ڈنڈا جو بیڑیوں سے منسلک تھا، اس کے گھسیٹے جانے میں آڑے آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے سُننے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں ایک لفظ نہ آیا۔ وہ اتنے دنوں سے ڈھول کے اندر تھا کہ اس کے کان کُند ہوگئے تھے۔

اس کے دل میں ٹیس اُٹھی۔ "صبح جب آئے گی، جب آئے گی تو کیا میں ناہید کی سرگوشیاں سُن سکوں گا؟" ناہید کے نام نے بے پناہ تنہائی اور خوف کے عالم میں کتنی ہی مرتبہ اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس وقت بھی وہ ذہن کے افق پر ستارے کی طرح دمک رہی تھی۔

وہ اسے گھسیٹتے ہوئے چلتے رہے۔ ان دنوں وہ اس چھوٹی سی عمارت میں تھا جو حال میں تعمیر کی گئی تھی اور جس میں اذیت رسانوں کو وہ تمام جدید سہولتیں فراہم کی گئی تھیں، جن سے پُرانے شہنشاہ نابلد تھے۔

وہ چلتا رہا۔ تازہ ہوا کی خوشبو آہستہ آہستہ قریب آتی رہی۔ اُس نے کسی بھڑکے ہوئے جانور کی طرح چہرہ قدرے اُوپر اُٹھا کر گہری سانسیں لیں۔ نتھنوں پر ہَوا کی خنکی اور سرسراہٹ کو محسوس کیا۔ پو پھٹنے والی تھی۔ ہوا کے بہنے کا یہ انداز اور یہ خنکی پَو پھٹنے سے ذرا ہی پہلے کی تھی۔

انہوں نے اسے ایک بڑے ٹھنڈے، روشن اور پُر آسائش کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ سامنے ایک بڑی میز بچھی تھی۔ جس پر سبز کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ اسے وہ میز یاد آئی جو وکٹر جارا کی اُنگلیوں کے لیے لائی گئی تھی۔ اس پر سفید میز پوش تھا۔ یہ سبز ہے۔ شاید یہ بھی کوئی علامت ہو۔

اس نے میز کو غور سے دیکھا، وہاں چند فائلیں تھیں۔ تھرماس تھا۔ روشنی میں ہیرے کی طرح جگمگاتا ہوا گلاس تھا۔ پیاس اس گلاس میں رہتی تھی یا اس کے حلق میں؟

ذہن میں ہر چیز گڈمڈ ہونے لگی۔

ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے گلاس پر سے اس نے اپنی نگاہوں کو نوچا، ذہن کو سمیٹنے کی کوشش کی اور سامنے دیکھا۔

میز کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اس کے نام سے واقف نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے کہ آج اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا، لیکن اس کے شانے اس کے عہدہ بتا رہے تھے۔ اماں کہتی تھیں کہ کراماً کاتبین تو اسے آج تک نظر نہیں آئے تھے، لیکن شانوں پر کڑھے ہوئے اعمال اس نے پہلے بھی بہت دیکھے تھے۔

اُسے لے کر آنے والوں نے ایڑی سے ایڑی بجائی اور سامنے والے کو سلامی دی۔ اس نے رعونت سے سر ہلایا اور اپنے قیدی کو دیکھنے لگا۔ وہ اسے نگاہوں میں تول رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، جیسے ایک دوسرے کے مقابل آنے والے مکہ باز ایک دوسرے کے بارے میں اندازے لگاتے ہیں، پھر وہ کرسی کھسکاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''پانی پیو گے؟ اس کی آواز ریشم کا لچھا تھی۔

''نہیں۔'' اس کے سوکھے ہوئے، تڑخے ہوئے، ترسے ہوئے حلق سے اور پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی۔ بھاری پھنسی ہوئی۔

وہ مسکرایا۔ ''ایسی بھی کیا ضد۔ پانی نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ تھوڑا سا پی لو۔''

وہ خاموش کھڑا رہا۔

''یقین کرو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تھوڑا سا پانی پی لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔

''نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے تم کب سے پیاسے ہو؟ کتنے وقت سے تم نے کھانا نہیں کھایا؟''

وہ اب میز پر سے اپنا بید اُٹھا کر ہتھیلی پر آہستہ آہستہ مار رہا تھا۔ آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں اور اس کی روح کی کھڑکیوں سے چھوٹے اور بڑے شیطان جھانک رہے تھے۔

''نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔''

''اڑتالیس گھنٹوں سے تم نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ کچھ نہیں پیا ہے۔ اس طرح تم مر جاؤ گے۔ چند گھونٹ پی لو۔'' اس نے اپنے ماتحتوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔

جسے اشارہ کیا گیا تھا، وہ آگے بڑھا۔ اس نے تھرماس کھولا اور صاف شفاف گلاس قلقل کرتے ہوئے پانی سے بھرنے لگا۔

پانی کی یہ آواز کس قدر شیطانی تھی۔ وہ لرز گیا۔ اس نے دیکھا کہ لحظے بھر کے اندر ہی گلاس کی سطح پر خنکی کی نمی اُبھر آئی ہے۔ گرمیوں میں اماں صراحیوں میں کیوڑا ڈالتی تھیں۔ رات بھر کا اوس کھایا ہوا اور خوشبودار ٹھنڈا پانی پینے میں سکون بخشا دیتا تھا۔ پیاس اس کے اندر کسی دیو پیکر لہر کی طرح اُٹھی۔ وہ ''Titanic'' تھا۔ نہیں! وہ ''Titanic'' نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ گلیوں میں اور کھیتوں میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ سر پر اڑتے ہوئے بادل تھے۔ پیروں کے نیچے دھوپ سے جھلسی ہوئی بھوری زمین تھی۔

''میگھا میا پانی دو''

''سیر سوئیا پانی دو''

''میگھا میا پانی دو''

وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس کے حلق میں بگولے اُٹھ رہے تھے۔ گرد اُڑ رہی تھی۔

''شاباش۔ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پی لو عباس۔''

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ آج کتنے دنوں کے بعد اس نے اپنا نام سُنا تھا۔ ورنہ سب ہی اسے ''تم اور تُو کہہ کر پکارتے تھے اور کبھی کبھی تو اسے شک ہونے لگا تھا کہ اس کا پیدائشی نام حرام زادہ ہے۔ کوئی اس کے اندر ''ہنسنے'' لگا۔

''میں موجود ہوں۔''

پانی انڈیلنے والا الحکم کی تعمیل میں گلاس اُس کی طرف لے کر بڑھا۔ عباس نے سر بلند کیا اور کناروں سے چھلکتے ہوئے پانی کو دیکھا، اس کی نگاہوں میں دریا لہریں مارنے لگے۔ وہ ان میں اُترنے لگا۔ انہیں ڈگڈگا کر پینے لگا۔ آنکھیں سایوں سے اور سرابوں سے کھیلنے لگیں۔

''Be a Good Fellow And

"Drink It" ایک غلیظ آواز کا آنکڑا اسے دریاؤں سے اور سیرابیوں سے باہر کھینچ لایا۔

عباس نے کپکپا کر اپنی طرف بڑھتے ہوئے گلاس کو دیکھا۔ پانی کی سطح پر کیچوے تیر رہے تھے۔ کانٹے میں پھنسے ہوئے کیچوے مچھلیوں کو اپنی طرف بلانے کے لیے، لیکن اس کے کسی ساتھی نے کیچوے نہیں نگلے تھے۔ اسے اُبکائی آنے لگی۔ اس نے گلاس بڑھانے والے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ گلاس فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہوگیا اور پانی فرش پر بہنے لگا۔

زخموں سے بھری ہوئی پیٹھ پر بید پڑا تو وہ دُہرا ہوگیا۔ اذیت اس کی پسلیوں کو ڈسنے لگی۔ اس کی کمر میں کن کھجورے اُترنے لگے۔ وہ اپنی حیوانی چیخیں اور کراہیں سُنتا رہا۔

"کتے تو ہمیں جھکانا چاہتا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ تیرا مقدمہ کھلی عدالت میں چلایا جائے۔ تجھے جیل منتقل کیا جائے۔ تجھے اخبار دیے جائیں۔ وکیل فراہم کیے جائیں...... تو ہمارا قیدی ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے؟ سمجھتا ہے کہ ہم تیری بھوک ہڑتال سے ڈر جائیں گے؟" وہ حلق کے بل دھاڑ رہا تھا۔

عباس کراہتا رہا اور گنتا رہا۔ اکیس، بائیس، تیئس جب وہ اسے مارتے تو وہ ہر ضرب کو گنتا تھا۔ چیخیں مارتے ہوئے گنتی بھول جاتا تو پھر سے شروع کر دیتا۔ ذہن ایک مرکز پر رہے، بکھرنے نہ پائے۔

مارنے والا ہاتھ رک گیا۔ اس کی حیوانی آواز شہد میں لتھڑ گئی۔ "دیکھو عباس، ہم نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ تم لکھنے والے تھے، عزت دار تھے، سفید پوش تھے، باذوق تھے، تمہیں تمہاری ضد نے کہاں پہنچا ہے۔ ہم نے تمہیں تمہاری ہی غلاظت میں سلایا ہے۔ ہم نے تمہیں چاروں ہاتھ پیروں پر چلایا ہے۔ ابھی تم کسی جانور کی طرح چیخ رہے تھے۔ کہاں گئی تمہاری وہ سحر انگیز آواز جس سے تم لوگوں پر جادو کیا کرتے تھے۔" اس کی آنکھوں میں رحم تھا۔ عباس اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

چند لمحوں بعد اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ بید سے اپنی ہتھیلی تھپتھپائی۔ "میری مان لو۔ یہ آخری موقع ہے۔ اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتادو، پھر دیکھو میں تمہیں یہاں سے کیسے نکالتا ہوں۔ تم اب ایک چیونٹی مسلنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ تمہارے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے پیر کھلوادوں۔ تب بھی تم میری طرف ایک قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ تم ویجی ٹیبل ہو اور ویجی ٹیبل کسی کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ تازہ ہو تو کھالی جاتی ہے اور تمہاری طرح باسی ہو جائے تو کوڑے میں پھینک دی جاتی ہے۔" وہ ہنسا۔

عباس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کیسا تڑخا ہوا۔ ٹوٹا ہوا اور مضحکہ خیز چہرہ تھا۔

بچپن میں وہ ایک مرتبہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ وہاں ایک "آئینہ خانہ" تھا۔ لکڑی کے چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف بہت سے چھوٹے اور بڑے آئینے لگے ہوئے تھے۔ اس نے جب ایک میں اپنا چہرہ دیکھا تھا تو ڈر گیا تھا۔ وہاں لگا ہوا آئینہ ایسا ہی تھا۔ خوب صورت سے خوب صورت چہرہ ان میں اس طرح مسخ ہو جاتا تھا کہ شدید خوف کا احساس ہوتا تھا یا پھر چہرے کی مضحکہ خیزی پر ہنسی آنے لگتی تھی۔

اس کے سامنے والے کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ شیطانی، مسخ، برباد شدہ، مضحکہ خیز، شدید اذیت کے عالم میں بھی اسے ہنسی آ گئی۔ اُسے "Dictionary Of Devils" یاد آئی جس میں کہا گیا تھا کہ سرکس وہ جگہ ہے، جہاں گھوڑوں، خچروں اور ہاتھیوں کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو احمقوں کا کردار ادا کرتے ہوئے دیکھ سکیں، لیکن یہ تو "Circus Of Terror" تھا۔

"حرام زادے اس عالم میں بھی ہنستا ہے۔" سامنے والا چیخا۔ "میں ابھی بتاتا ہوں کہ مجھ پر ہنسنے کا، میرے دیے ہوئے پانی کو گرا دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔" وہ مڑا پھر اس نے اپنے ماتحتوں میں سے ایک کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

"یس سر، ماتحت چند قدم آگے بڑھ آیا۔

"Open Your Fly" کمرے میں ایک غیر انسانی آواز گونجی، اور عباس کا سارا بدن تن گیا۔

"جی...... جی سر......" آگے آنے والا ہکلانے لگا۔

"I Have Ordered You To Open Your Fly" اس کی کریہہ آواز کمرے

میں چیخنے لگی۔
"But Sir" ماتحت کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔
"You Bastard! Open Your Fly"
"یس سر۔" ماتحت نے تھوک نگلا اور اس کی لرزتی ہوئی انگلیاں زپ سے اُلجھنے لگیں۔
"لٹادو حرام زادے کو۔"
اُس نے مزاحمت کرنی چاہی، لیکن انہوں نے اسے پلک جھپکتے میں زمین پر گرالیا۔ وہ اس کا منہ چیرنا چاہ رہے تھے، اور وہ ان کی انگلیوں کو، ان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔
"یہ ہمارا دیا ہوا پانی نہیں پیتا۔" عباس کے کانوں میں تحقیر آمیز آواز آئی، پھر ایک کم منصب والے خواجہ سرا کے بدن کا گرم گندا پانی، اس کے چہرے پر، اس کی گردن پر، اس کے سینے پر گرنے لگا۔ اسے پکڑنے والے بدک کر دُور ہٹ گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔ سوکھے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے اور سانس روک لی۔
"میں ویجی ٹیبل ہوں۔ کوڑے پر پڑی ہوئی سبزی کتے اپنی ٹانگ اٹھا کر مجھ پر پیشاب کرتے ہیں اور میں کچھ نہیں کرسکتا۔" اس کے ذہن میں فلیتے سلگ رہے تھے۔ اس کے پکڑنے والے اب اس سے دُور تھے، لیکن پھر بھی اس نے حرکت نہیں کی۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح پڑا رہا۔
اس کا بدن چیخنے لگا۔ "تم ویجی ٹیبل ہو۔ پھر بتانے سے یا نہ بتانے سے، پانی پینے سے یا نہ پینے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔"
وہ لڑکھڑاتا اور جھومتا ہوا اُٹھا۔ "میں ویجی ٹیبل نہیں ہوں۔ انسان ہوں شعور اور ارادہ رکھنے والا۔" اس نے اپنے ذہن کو سمجھایا اور اپنے بدن کو جھڑک دیا۔
فرش پر بہنے والے صاف پانی اور پیشاب نے ایک بڑا سا دھبہ بنادیا تھا۔ عباس نے اس دھبے کو غور سے دیکھا، پھر بڑے خواجہ سرا سے نگاہیں چار کیں۔
"بتاتا ہوں۔ ابھی بتاتا ہوں۔" اس کی آواز بے جان تھی۔

عظیم باکسر محمد علی کلے

25 فروری 1964ء کو میامی بیچ کے مقام پر عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن سونی لسٹن نے ایک نسبتاً نئے باکسر کیشس کلے سے اپنے اعزاز کے دفاع کے لیے مقابلہ کیا۔ سونی لسٹن گزشتہ دو برس سے باکسنگ کا عالمی چیمپئن تھا جبکہ کیشس کلے کی عمر فقط 21 برس تھی اور ابھی تک اس نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے فقط 20 مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔ مقابلہ جب شروع ہوا تو کیشس کلے نے ابتدا ہی سے سونی لسٹن پر غلبہ پانا شروع کردیا۔ چھٹے راؤنڈ کے اختتام تک سونی لسٹن اتنا زخمی اور نحیف ہوچکا تھا کہ اس نے ساتویں راؤنڈ میں مقابلے کے لیے رنگ میں آنے سے انکار کردیا اور یوں کیشس کلے کو نیا عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن قرار دے دیا گیا۔ یہ مقابلہ جیتنے کے بعد کیشس کلے نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کردیا۔ یہ عظیم باکسر محمد علی کلے کے نام سے آج ساری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔

احکامات دینے والے نے غرور سے اٹھا کر ماتحتوں کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ان سب کے لیے تحقیر تھی۔
"Shit" تمہیں لوگوں کو توڑنا نہیں آتا۔ مڈل کلاس کے یہ خود ساختہ دانشور سزاؤں اور بھوک پیاس سے نہیں ٹوٹے۔ ان کی عزت نفس پر چوٹ لگاؤ۔ یہ تنکے کی طرح دو ٹکڑے ہوجائیں گے۔" وہ ہنسا اور عباس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسیں عباس کے چہرے کو چھونے لگیں۔
"تم سب ٹوٹ جاتے ہو، پھر نخریلی لونڈیوں کی طرح اتنا بھید بھاؤ کیوں دکھاتے ہو۔" اس کے بید نے عباس کے ناف سے نچلے حصے کو چھیڑا پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔
عباس نے اس بڑے خواجہ سرا کی بید کو اپنی رانوں کے درمیان محسوس کیا، پھر اپنے بدن کی پوری قوت سے اس کے قہقہہ مارتے ہوئے چہرے پر تھوک دیا۔

☆......☆

دوسرا شعلہ

واحد حل

حمیرا خان

نوسربازی کا انوکھا واقعہ، حمیرا خان کے قلم سے

شام کے ڈھلتے سائے میں وہ سڑک پر نظریں جمائے اردگرد سے مکمل طور پر بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔ اتنے میں ایک موٹر سائیکل زور سے ہارن بجاتی تیزی سے اس کے پاس سے گزری، وہ جو اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا ہارن کی آواز پر بُری طرح بدک کر پیچھے ہٹا تو موٹر سائیکل پر سوار دونوں نوعمر لڑکے اپنی اس شرارت پر کھلکھلا کر ہنس دیے، کچھ لمحے وہ دور جاتی موٹر سائیکل کو غصے سے دیکھتا رہا، پھر بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹک کر اپنی سوچوں میں گم ہوگیا۔ وہ بہت افسردہ تھا۔ آج اس کی زندگی کا بہت بُرا دن تھا، کیوں کہ آج وہ اپنی بیوی کا وہ زیور بھی گروی رکھ آیا تھا جو اب تک بکنے سے رہ گیا تھا۔ اس بات کو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سود اور قرض کی رقم ادا کر کے زیور واپس لانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔

"کچھ دن تک تو گزارا ہو جائے گا اور اس کے بعد کا انتظام میں کر ہی لوں گا۔" خود کو تسلی دیتے ہوئے اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے شاپر کو بائیں ہاتھ میں کچھ اس مضبوطی سے تھام لیا جیسے کہ وہ اس کی متاع حیات ہو اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ سوچنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

شاپر میں موجود فصلوں کی ادویات اس کے لیے اس وقت بہت اہمیت رکھتی تھیں، جن کی مدد سے وہ زمین پر اچھی فصل حاصل کر سکتا تھا اور اس فصل سے حاصل ہونے والی رقم سے آنے والے کچھ دن اچھے گزرنے کی امید تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے باپ دادا نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو اس کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا اور اتنے پیسے تھے، جن سے وہ اس زمین پر کھیتی باڑی کر کے زندگی اچھے طریقے سے گزار سکتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر میں دو اچھی نسل کی بھینسیں بھی موجود تھیں۔ اس کے ماں باپ اپنی زندگی میں ہی اس کی شادی کروا گئے تھے۔ زہرہ بہت خیال رکھنے والی سیدھی سادی عورت تھی۔ شادی کے پانچ سالوں میں اس نے سلیم کو دو بیٹوں کا تحفہ دے کر اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ ہر باشعور انسان کی طرح سلیم بھی اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ وہ خود صرف میٹرک تک پڑھ سکا تھا، لیکن تعلیم کی اہمیت کو سمجھتا تھا، ان ہی سب باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے شہر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ زہرہ بھی شہر آ کر بہت خوش تھی۔ اس کے خاندان میں وہ پہلی لڑکی تھی جو شہر میں بسنے جا رہی تھی۔ چھوٹی سی بستی میں بسنے والے زہرہ کے رشتے داروں کے لیے یہ بات ہی زہرہ کی خوش نصیبی کی دلیل تھی۔ شہر

آنے سے کچھ دن پہلے سے ہی خاندان والوں نے ان کی دعوتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ اتنی پذیرائی نے زہرہ اور سلیم کے انداز میں ہلکا سا احساس برتری پیدا کر دیا تھا اور جس دن وہ اپنے ماں باپ کے ہاں دعوت پر گئی تھی۔ جہاں انہوں نے بیٹی اور داماد کے ساتھ ساتھ قریبی رشتے داروں کو بھی جمع کر رکھا تھا، تو اس دن زہرہ نے خاص طور سے چن کر اپنا سرخ ریشمی سوٹ نکالا تھا جو اس کا سب سے قیمتی سوٹ تھا۔ اس پر سنہرے رنگ کا گوٹا لگا تھا۔ سلیم نے میلے سے اسے سنہرے رنگ کا پراندہ بھی لا دیا تھا۔ اس روز زہرہ کی ٹور دیکھنے لائق تھی۔ فخر سے گردن اٹھائے وہ خود کو کہیں کی مہارانی محسوس کر رہی تھی۔ جب وہ ایک ادا سے سر ہلا کر بات کا جواب دیتی تو اس کے کانوں میں پڑے سونے کی خوب صورت جھمکے ہل ہل کر خوشی سے گلابی ہوتے اس کے سفید گالوں کو چومنے لگتے۔ اس دن کا تصور کر کے سلیم آج بھی بے ساختہ مسکرا دیا۔ "زہرہ کے کانوں میں وہ جھمکے کس قدر حسین لگتے تھے اور آج وہی جھمکے......" جھمکوں کا خیال آتے ہی وہ حال میں پلٹا، گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے وہ حال کی تلخیوں کو بھول گیا تھا۔ اب سب باتیں سارے مسائل ایک بار، پھر اس کے دماغ میں چکرانے لگے۔ اسی وقت ایک بس اسٹاپ پر آ کر رکی، مگر وہ اس کی مطلوبہ بس نہیں تھی، اس لیے وہ اپنی جگہ کھڑا لوگوں کو بس سے اترتے چڑھتے دیکھتا رہا۔ بس کے روانہ ہوتے ہی اسٹاپ ایک بار پھر کسی حد تک ویران دکھائی دینے لگا۔ ایک تو وہ علاقہ کچھ زیادہ گنجان نہ تھا اور پھر سردیوں میں رات کے اس وقت لوگ گھروں کو لوٹ چکے



ہوتے ہیں۔ ''نہ جانے میری بس کب آئے گی زہرہ اور بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ مڑ کر دائیں طرف دیکھنے لگا جہاں سے اس کی مطلوبہ آنے والی تھی۔ اسے وہاں کھڑے آدھا گھنٹہ ہونے کو تھا اور وہ جانتا تھا کہ اسے تقریباً اتنا ہی وقت اور انتظار کرنا پڑے گا، کیوں کہ پہلی بس اس کے اسٹاپ پر آنے سے کچھ دیر پہلے ہی نکل گئی تھی۔ ''امجد کو تو صبح سے بخار بھی آ رہا ہے، کتنی بار سمجھایا ہے زہرہ کو کہ سردیاں ہیں بچوں کو کمرے میں رکھا کر مگر......

وہ بے چاری بھی کیا کرے، گھر کے کام، دو جڑواں بچے اور وہ خود بھی تو کتنی بیمار رہنے لگی ہے۔'' وہ خود ہی زہرہ سے خفا ہو رہا تھا اور خود ہی اس کی طرف سے صفائی بھی پیش کر رہا تھا، کیوں کہ یہ سب کچھ اتنا غلط بھی نہ تھا۔

زہرہ ہر طرح سے ایک اچھی شریک حیات ثابت ہوئی تھی۔ شہر آ کر رہنا ان کے لیے کوئی خوش گوار تجربہ نہیں رہا تھا۔ گاؤں سے آتے ہی مسائل کچھ اس تسلسل سے ان کے سامنے آئے کہ وہ دونوں بوکھلا کر رہ گئے۔ ابھی وہ دونوں خوشی خوشی اپنا نیا گھر سجانے میں لگے ہوئے تھے کہ اس کی پیاری بھینس، جسے وہ پیار سے بھوری کہتے تھے، بیمار پڑ گئی۔ علاج اور دیکھ بھال کے باوجود وہ تیسرے ہی دن مر گئی۔ دیہات میں کسی کی بھینس مر جائے تو اس گھر میں ایسا ہی ماحول ہو جایا کرتا ہے، جیسے اس گھر میں کسی انسان کی موت ہوگئی ہو۔ مالی نقصان یک طرف، مگر گھر میں رکھے جانوروں سے انسان کو انس ہو ہی جایا کرتا ہے۔ بھوری کے مرنے کے بعد سلیم نے دلبرداشتہ ہو کر دوسری بھینس بیچ دی اور کریانے کی دکان کھولنے کا فیصلہ کیا، لیکن ابھی وہ دکان کے لیے جگہ اور سامان وغیرہ لینے کے بارے میں سوچ بچار ہی کر رہا تھا کہ بیماریوں نے جیسے اس کے گھر کا رستہ دیکھ لیا۔ پیسے تیزی سے ختم ہونے لگے اور آخر نوبت زیورات بیچنے تک آ پہنچی۔ ''بھائی صاحب چار نمبر کی بس نکل تو نہیں گئی؟'' سوچوں میں ڈوبے سلیم کو یہ آواز ماضی سے حال میں کھینچ لائی۔

''جی...... جی نہیں میں بھی اسی کا انتظار کر رہا ہوں، کچھ دیر میں آنے ہی والی ہے۔'' کلائی پر بندھی چمڑے کی سستی سی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے سلیم نے اس شخص کو جواب دیا جو نہ جانے کب اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔ ''ہوں'' وہ شخص ہلکی سی آواز کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتا ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سلیم کو وہ کچھ بے چین سا لگا، لیکن اس وقت اس کا دل کسی سے بھی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے وہ خاموش رہتے ہوئے اس شخص کا جائزہ لینے لگا۔ سانولے رنگ، گٹھے ہوئے جسم اور چھوٹے قد کا وہ شخص عام سے کپڑوں میں ملبوس تھا، جس سے اس کی مالی حالت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا تھا، اس کی آنکھیں کافی چھوٹی تھیں اور ناک اس قدر پھیلی ہوئی تھی جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے اس پر کسی نے زور سے مکا یا ہتھوڑا مارا ہو، جس کے باعث وہ پچک گئی ہو، مگر اس پر چوٹ کا کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی ناک ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔

''آج موسم کچھ زیادہ ہی سرد ہے۔'' کالے رنگ کی چادر کو اور اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے یہ بات ایسے کی جیسے کہ اپنے آپ سے بات کر رہا ہو، مگر وہ پوری طرح سلیم کی طرف متوجہ تھا۔ سلیم جو اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھا، اس کے اس طرح اچانک متوجہ ہونے پر جھجک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''ان بادلوں کو دیکھ کر لگتا ہے آج رات بارش بھی ضرور ہی ہوگی۔'' اس نے سلیم کے گڑبڑانے کا کوئی نوٹس نہ لیا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر شمال کی جانب سے اُمڈتے گہرے سیاہ بادلوں کو دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' اس بار سلیم نے بھی کچھ بولنا ضروری سمجھا۔

''تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو دوست خیریت تو ہے؟'' وہ بہت جلد آپ سے تم پر آتے ہوئے بے تکلفی اور اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ سلیم کا دل چاہا کہ اس سے کہے ''مجھے تم بہت بے چین لگ رہے ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' سلیم نے نہ تو اس کے سوال کا جواب دیا نہ اپنے ذہن میں اُبھرتا سوال اس سے پوچھا۔

''میرا نام'' وہ ایک لمحے کو رُکا۔ ''میرا نام شاکر ہے اور تم؟''

''میں سلیم ہوں۔''

"شہزادہ سلیم......" شاکر نے بے تکے انداز میں ہنستے ہوئے سلیم کے نام کے ساتھ شہزادے کا اضافہ کیا۔ سلیم کو سمجھ نہ آئی کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔ "شہزادہ سلیم روڈیز" وہ ایک بار پھر اسی بے تکے انداز میں ہنسا۔ سلیم نے اس بار بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی ہنسی کا ساتھ دینے لگا۔ "آپ لوگوں نے یہاں کہیں میرا پرس تو نہیں دیکھا؟" اسی لمحے ایک پریشان صورت شخص نے ان کے پاس آ کر پوچھا۔

"پرس...... نہیں تو، میں نے تو کوئی پرس نہیں دیکھا۔" سلیم کے کہنے پر وہ سوالیہ انداز میں شاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں بھائی صاحب ہم نے کوئی پرس نہیں دیکھا۔" شاکر کے جواب پر اس آدمی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ "اس میں پچاس ہزار روپے تھے نہ جانے کہاں گر گیا ہے میرا پرس" وہ اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھ گیا۔ "اب تو بس کو آ ہی جانا چاہیے، اب تو ٹانگیں بھی درد کرنے لگی ہیں۔" سلیم نے بے چینی سے دائیں ٹانگ سے اپنا وزن بائیں ٹانگ پر منتقل کیا۔ "تمہیں ایک بات بتاؤں؟" سلیم کے قریب ہوتے ہوئے وہ سرگوشی میں بولا۔ "اس آدمی کا پرس میرے پاس ہے۔"

"کیا...... تمہارے پاس، اس کا پرس تمہارے پاس کیسے آیا اور تم نے اسے لوٹایا کیوں نہیں؟" سلیم کے اس سوال پر وہ یوں مسکرایا، جیسے کسی بچے کی بے وقوفانہ بات سن کر کوئی بڑا مسکرا دیتا ہے۔ "غریبی بہت بڑی لعنت ہے دوست، انسان سے جانے کیا کیا کروا لیتی ہے۔" دوسرے ہی لمحے سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ ناصحانہ انداز میں کہنے لگا۔ "ویسے میں نے چوری نہیں کی ہے۔ بس اتنا ہے کہ بس سے اترتے ہوئے اس کا پرس اس کی جیب سے نکل کر نیچے جا گرا اور میں نے پرس گرتے دیکھ لیا۔ میں پرس اسے دینے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر اس میں موجود پچاس ہزار کی رقم نے مجھے رک کر سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی، مجھے بھی ہے، بہت ضرورت ہے مجھے ان پیسوں کی، اب تم ہی بتاؤ ایسے میں، میں یہ رقم اسے واپس کر دوں یا اپنی زندگی کے اندھیرے دور کروں۔" اس نے فیصلے کا سارا اختیار سلیم کو دے دیا۔

"مم...... میں...... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" سلیم گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کے سامنے اپنے مسائل کا اونچا پہاڑ آ کھڑا ہوا تھا۔ "میں بہت کشمکش میں ہوں، تمہیں دیکھ کر لگا تمہارے حالات بھی مجھ سے کچھ خاص مختلف نہیں ہیں، اسی لیے تمہیں سب بتا بیٹھا، تم میری حالت کو بہتر سمجھ سکتے ہو۔" شاکر جانے کس رو میں سلیم کو سب بتا تو بیٹھا تھا، لیکن اب اس کے چہرے پر پچھتاوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی بے چینی میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ "چلو دوست ایک کام کرتے ہیں، اس میں سے آدھے پیسے تم رکھ لو آدھے میں رکھ لیتا ہوں۔" سلیم خاموش تھا اور اس کی مسلسل خاموشی شاکر کو ہولا رہی تھی، اسی پریشانی میں اسے یہی بہتر لگا کہ سلیم کو اس کا حصہ دے کر اپنے لیے آنے والے خطرے کو ختم کیا جائے۔ سلیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں کھڑے کھڑے اچانک اسے اتنے روپے مل سکتے ہیں، اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "ان پیسوں میں، میں زہرہ کے گروی رکھے جھمکے واپس لا سکتا ہوں، بچوں اور زہرہ کا علاج کروا سکتا ہوں، پھر زمین پر محنت کر کے آنے والی فصل کے پیسوں سے دکان لے کر اس میں سامان ڈال سکتا ہوں...... وہ رقم سلیم کو جادو کی چھڑی لگ رہی تھی جو اس کا ہر مسئلہ حل کر دینے والی تھی۔ اسے لگا وہ رقم لے لینا ہی اس کے تمام مسائل کا واحد حل ہے، مگر یہ پیسا مجھ پر حرام ہے، وہ شخص نہ جانے کس کام سے جا رہا ہوگا، نہ جانے اس کے کیا مسائل ہوں گے...... مگر میں بھی تو بری طرح مسائل میں گھرا ہوا ہوں اور میں نے چوری تو نہیں کی ہے اور نہ ہی میں شاکر سے اپنا حصہ مانگ رہا ہوں وہ تو خود ہی مجھے دے رہا ہے اور اگر بنا مانگے میرے مسائل کا حل مل رہا ہے تو انکار کیوں کروں؟؟" اس کے اندر کی کشمکش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"میرے باپ دادا نے مجھے ہمیشہ حلال کا نوالہ کھلایا ہے...... یہ رقم میرے لیے جائز نہیں اور......"

"یہ لو دوست تمہارا حصہ، سنبھال لو۔" شاکر نے آہستہ سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ سلیم کی سامنے والی جیب میں ڈال دیا سلیم نے جیب میں رکھے پیسوں کی موجودگی کو محسوس کیا اور اس کے اندر کی کشمکش دم توڑ گئی۔ شاکر اب تھوڑا فاصلے پر ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کچھ اور چھوٹی

محسوس ہو رہی تھیں اور وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔۔ یقیناً سلیم کو اتنی بڑی رقم میں سے آدھا حصہ دینا اسے بہت ناگوار گزرا تھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سلیم سے مزید کوئی بات تک نہیں کرنا چاہ رہا، مگر سلیم کو اس سے بات کرنے کا خیال ہی کب تھا وہ تو دھڑکتے دل کے ساتھ آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب وہ زہرہ کو یہ خوش خبری سنانے والا تھا، کچھ اور مسافر بھی ان کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ چار نمبر کی بس بھی آنے ہی والی تھی۔ اتنے میں سامنے سے وہی شخص آتا دکھائی دیا، وہ اب بھی اِدھر اُدھر دیکھتا کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس بار اس کی نظر زمین پر نہیں تھی۔ اسے اپنی سمت آتا دیکھ کر سلیم غیر ارادی طور پر دوسرے مسافروں کی اوٹ میں ہو گیا، شاکر بھی اسے آتا دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی سائیڈ میں کھسک گیا، مگر اتنے میں اس شخص کی نظر بھی ان دونوں پر پڑ چکی تھی۔ وہ تیر کی مانند ان کی سمت آیا۔ ’’مجھے تم دونوں کی تلاشی چاہیے۔‘‘ اس شخص کی بات سنتے ہی سلیم کے پسینے چھوٹ گئے، شاکر بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ ’’ہماری تلاشی...... مگر کیوں؟ ہم نے کیا کیا ہے؟‘‘ شاکر نے تھوڑا غصہ دکھانے کی کوشش کی، مگر سامنے والا اس وقت کسی بھی بات کو اہمیت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ’’پہلے تم ہی اپنی تلاشی دو۔‘‘ شاکر کے احتجاج پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ’’تلاشی دو ورنہ میں ابھی پولیس کو بلوالوں گا۔‘‘ اس کی دھمکی خاصی کار آمد ثابت ہوئی تھی۔ سلیم کی تو حالت خراب تھی ہی مگر پولیس کے نام پر شاکر کا احتجاج بھی دم توڑ گیا۔ ’’وہ...... بات یہ ہے کہ...... دراصل...... دراصل آپ کے پیسے ہمارے پاس ہی ہیں...... ہا...... ہم آپ کے پیسے واپس کر دیتے ہیں، لیکن مہربانی کریں ہمیں پولیس کے پاس نہ لے جائیں۔‘‘ پولیس کے نام پر شاکر کا ریکارڈ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ ’’دل تو یہ کر رہا ہے کہ تمہیں سزا دلواؤں لیکن میں بھی کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا، ویسے بھی میں یہاں پردیسی ہوں اور مجھے صرف اپنی رقم چاہیے۔‘‘ اس شخص نے باری باری شاکر اور سلیم کی جیبوں سے رقم برآمد کرتے ہوئے کہا۔

’’زیور گروی رکھ کر ملنے والی رقم سے کیڑے مار ادویات لینے کے بعد سلیم کے پاس ساڑھے تین ہزار ہی بچے تھے۔ وہ اس کی جیب میں تھے۔ اس شخص نے اپنے پیسوں کے ساتھ ساتھ وہ ساڑھے تین ہزار روپے بھی اپنے قبضے میں کر لیے۔ سلیم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر اس شخص کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کوئی ہنگامہ بھی کھڑا کر سکتا ہے۔ اِرد گرد کھڑے مسافروں پر چور نظر ڈالتے ہوئے اس نے بے بسی سے دور جاتے اس شخص کی طرف دیکھا اور پھر شاکر کی طرف دیکھنے لگا جو خود بہت مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ اسی لمحے چار نمبر بس اسٹاپ پر آ کر رُکی، سلیم تھکے تھکے قدموں سے بس میں سوار ہو گیا۔ اس نے ایک بار مڑ کر بس میں شاکر کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ سلیم نہیں جانتا تھا کہ شاکر کسی نئے شکار کی تلاش میں جا چکا ہے۔

شاکر اور وہ شخص ایک کمرے میں بیٹھے پیسے گننے میں مصروف تھے۔ ’’صرف ساڑھے تین ہزار روپے‘‘ اس شخص نے حقارت سے کہا۔ ’’اتنا بڑا ڈراما کیا، اتنی محنت کی اور ہاتھ کیا لگا صرف ساڑھے تین ہزار روپے۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے ذرا بندہ تو دیکھ لیا کر تین کنگلوں کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے تو بھی۔‘‘ اس کے لہجے میں بیزاری جھلکنے لگی۔ ’’ہاں پیسے کچھ زیادہ ہی کم ہیں، مجھے ان سے زیادہ کی امید تھی، لیکن استاد یہ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے نا کہ زیادہ لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں جیل کی ہوا نہ کھانی پڑ جائے، اب ہر کوئی اتنا بے وقوف تو نہیں ہوتا ہے نا جو میری باتوں میں آ جائے۔‘‘ شاکر کا لہجہ خوشامدی تھا، شاید وہ شخص اس کے باس کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن شاکر کی اس وضاحت سے بھی سامنے بیٹھے شخص کی تیوری پر پڑے بل کم نہ ہوئے۔ ’’چل اگلی باری ذرا دیکھ بھال کر کام کروں گا، اب ذرا جلدی چل کھانا کھا آئیں۔ میرے پیٹ میں تو چوہے قلا بازیاں کھا رہے ہیں۔‘‘ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنے باس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔ ’’ہاں اتنے پیسوں میں ایک ٹائم اچھا کھانا تو کھا ہی سکتے ہیں۔‘‘ باس دکھائی دینے والا وہ شخص ہنستے ہوئے بولا تو شاکر کی خوشامدانہ ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

☆......☆

کارِ جہاں دراز ہے

سرفروشی ہے زندگی



محمد اقبال زمان

مانسہرہ کے گاؤں ڈھنڈیال میں جنم لینے والے ایس پی محمد اسلم یوسف زئی المعروف چوہدری اسلم

اور ہنگو کے کم عمر اعتزاز حسن کی شہادت، لازوال کہانی کی صورت

پاکستان میں ہونے والے آئے روز کے بم دھماکوں، فائرنگ اور دہشت گردی کے حملوں نے ہمیں بدترین حالات کا عادی بنادیا ہے، اس کے باوجود کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو بعض اوقات ہمیں دھچکا پہنچا کر



دہشت گردوں سے پکڑے جانے والے اسلحے کے ساتھ چوہدری اسلم کا ایک یادگار فوٹو



ایس پی چوہدری اسلم دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کے لیے اپنی گاڑی سے اترتے ہوئے

احساس دلاتے ہیں کہ ہم بے حس نہیں، بلکہ سکتے میں ہیں۔ دل شکستہ، افسردہ اور نوحہ کناں ضرور ہیں، پر مایوس نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے محافظ بلند حوصلہ اور مضبوط ارادوں کے مالک ہیں اور وہ ہمت کے ساتھ اندرونی و بیرونی خطرات سے نمٹنے اور ہماری حفاظت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ بہادری سے لڑنے والے بے شمار افسران نے اپنی ہمت اور شجاعت سے عوام کے دلوں میں نہ صرف گھر بنایا، بلکہ وقت آنے پر دہشت گردوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔

چوہدری محمد اسلم (شہید) کا شمار کراچی پولیس کے بہادر ترین افسر میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے کام کے ماہر اور جرائم کی بیخ کنی کے سرخیل جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی سپاہیانہ ملازمت کے دوران بے شمار مجرموں کو بے نقاب کیا اور کئی گروہوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جو ملک اور عوام دشمن سازشوں کے سردار مانے جاتے تھے۔ خطرناک سے خطرناک مجرم ان کی بہادری، ثابت قدمی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے خوف کھاتا تھا۔ وہ کاؤنٹر ٹیررازم سیل کے سربراہ تھے اور ان کے پیشہ ورانہ کردار میں یہ بات خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے کہ وہ تن تنہا مجرموں سے مقابلہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

چوہدری صاحب کا اپنا ایک خاص اسٹائل تھا جو نہ صرف ان کی حیات کا غماز تھا، بلکہ وہ اپنے حلیے کے سبب ہی جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ کاٹن کے سفید



شلوار قمیص میں ملبوس رہتے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بہترین قسم کی گھڑی اور انگلی میں ایک سونے کی

رِنگ جس پر مخصوص پتھر جڑا ہوتا تھا، ان کی زندگی کا خاصہ تھی۔ وہ ہمیشہ مسلح رہتے تھے اور اپنے ذاتی اسلحے میں GLOCK رکھتے تھے۔ سگریٹ نوشی میں ان کا، یہ بھی ان کی زندگی کی ایک خاص علامت تھی۔ وہ اپنے حلقے میں چین اسموکر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کی داڑھی اور بالوں کا بھی اسٹائل بہت مختلف تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی نے ان کے چہرے کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ ان کا طرز زندگی گو کہ شاہانہ نہیں تھا لیکن ان کے بعض انداز واطوار نے انہیں ایک خاص پہچان عطا کی تھی، جس نے انہیں یوسف زئی سے چوہدری بنا دیا تھا۔

ایس پی محمد اسلم خان یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ اپنی جرأت و بہادری اور بے باکی کے سبب عوام میں بالخصوص اپنے حلقۂ احباب میں ''چوہدری'' کے نام سے مشہور تھے اور پھر یہ لاحقہ ان کے نام کے ساتھ ایسا جڑا کہ وہ اسلم یوسف زئی سے چوہدری اسلم خان ہو گئے۔ وہ پولیس میں ایک چھوٹے سے عہدے پر بھرتی ہوئے تھے، لیکن اپنی صلاحیتوں کے سبب جلد ہی ترقی کر کے وہ ڈی ایس پی اور پھر ایس پی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

وہ اپنے دوستوں اور سپاہیوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ چوہدری اسلم خان ضلع مانسہرہ سے ایک گاؤں ڈھڈیال میں پیدا ہوئے۔ ان کا یہ علاقہ ملک کے خوب صورت مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ ہر طرف فلک بوس پہاڑ، ندیاں نالے اور ہریالی سیاحوں کا دل موہ لیتی ہے۔ ان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ ان کے والد اکرم ایڈووکیٹ کا شمار معروف وکلاء میں ہوتا ہے۔ چوہدری صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے ایک بھائی کراچی میں، جبکہ دوسرے بھائی گاؤں میں ہی مقیم ہیں۔

چوہدری اسلم نے اپنی تمام تعلیم کراچی سے حاصل کی۔ وہ ابتدا میں ریتی لائن میں مقیم رہے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنی رہائش گاہ تبدیل کر لی اور شہر کے متمول علاقے ڈیفنس میں رہائش اختیار کر لی۔ چوہدری صاحب کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، جو ابھی زیر تعلیم ہیں۔ وقوعہ والے روز بھی انہیں اپنے بچوں کو کوچنگ سینٹر چھوڑنے جانا تھا، لیکن وہ مصروفیات کے سبب بچوں کے



ایس پی چوہدری اسلم ایک خودکش حملہ آور کی بارود سے بھری جیکٹ صحافیوں کو دکھا رہے ہیں



ایس پی چوہدری اسلم دہشت گردوں سے مقابلے کے بعد دستی بموں کے ساتھ جبکہ اُن کے دستِ راست ڈی ایس پی ملک محمد عادل بھی تصویر میں نمایاں ہیں

ہمراہ نہ جاسکے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے اپنے بچوں سے جدا ہوگئے، شاید قدرت کی طرف سے بچوں سے آخری اور الوداعی ملاقات ان کے نصیب میں نہ تھی۔ چوہدری اسلم خان کا قتل کراچی کے شہریوں کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں، کیونکہ وہ دہشت گردوں' بھتہ خوروں، ٹارگٹ کلرز اور عوام دشمن گروہوں کے لیے پیغام اجل اور شہریوں کے لیے ڈھال تھے۔ انہوں نے بارہا کراچی کے عوام کو بڑے سانحات سے بچایا اور قبل از وقت ملزمان کو جادھرا۔ ان کی انہی صلاحیتوں اور خوبیوں نے انہیں عوام کا ہیرو بنادیا تھا، لیکن افسوس کہ ہمارے صاحبان اقتدار عوام کی جانوں کی حفاظت کرنے والے کو تحفظ فراہم نہ کرسکے اور چوہدری اسلم بھی دیگر پولیس افسران کی طرح جو مخلص، سچے، ایمان دار اور جان ہتھیلی پر رکھ کر شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے والے تھے، ایک نڈر اور بہادر افسر سے محروم ہوگئے۔

چند روز قبل میں ٹی وی چینل پر خبریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک شام ساڑھے چار بجے ایک بریکنگ نیوز اسکرین پر نمایاں ہوئی، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ عیسیٰ نگری کے علاقے میں ایک زبردست بم دھماکہ ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ جزئیات کے ساتھ جب تفصیلی خبر آنا شروع ہوئی تو پتا چلا کہ کراچی پولیس اپنے ایک نہایت ہی جری اور قوی افسر سے محروم ہوگئی ہے اور چوہدری اسلم خان اس بم دھماکے میں، جو کہ ٹارگٹ کلنگ تھا، شہید ہوگئے ہیں قافلے پر ہونے والے بم حملے کے نتیجے میں ان کے دو ساتھی یعنی ان کا ڈرائیور اور محافظ بھی شہید ہوگئے۔

شہید اسلم کا نام دہشت گردوں کے لیے خوف کی علامت تھا۔ سندھ پولیس کا نام تاریخ میں سنہری حروف میں اگر لکھا جائے گا تو اسی سپر ہیرو کی وجہ ہے جس کے بارے میں 2011ء میں سوشل میڈیا میں ایک شخص نے کہا تھا یہ کسی معجزے سے کم نہیں کہ چوہدری اسلم زندہ ہیں۔ اسے لیاری سے وزیرستان تک بہت سے لوگ مردہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ شخص جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں موبائل میں



ایس پی چوہدری اسلم کے آبائی گاؤں ڈھڈیال میں ان کی رہائش گاہ پر علاقہ مکین فاتحہ خوانی کر رہے ہیں

نمبر فیڈ کرنا نہیں آتا تھا، لیکن جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائی میں بڑا نام رکھتے تھے۔ پاکستانی تاریخ میں کسی بھی پولیس افسر کو ملکی اور عالمی میڈیا نے اتنی کوریج نہ دی ہوگی جتنی چوہدری اسلم کے حصے میں آئی۔

ان کے قریبی دوست اور اعلیٰ افسر ڈی ایس پی ملک محمد عادل نے بتایا کہ کراچی پولیس کے جان باز



ہنگو کے کم عمر شہید اعتزاز حسن کی یادگار تصویر

چوہدری اسلم (شہید) دہشت گردوں کے لیے خوف کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن دہشت گردی کے خوف کے خلاف جان کا نذرانہ پیش کرنے والے ساتھیوں کے لیے ان کی شخصیت بالکل برعکس تھی۔ اپریل 2012ء میں ہونے والے لیاری آپریشن میں شہید چوہدری اسلم اپنی بہادر ٹیم کے ہمراہ فرنٹ لائن میں ملزمان کا مقابلہ کرتے نظر آئے، وہ اس ٹیم کا حصہ تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل الطاف حسین جو 28 سال سے پولیس کے شعبے سے وابستہ تھے، 26 اپریل کو دوران آپریشن دہشت گردوں کی گولی لگنے سے شہید ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت پر چوہدری اسلم کا کہنا تھا کہ پولیس نے نہ صرف ایک بہادر افسر کو کھویا ہے بلکہ میں نے اپنے بھائی کو بھی کھو دیا ہے۔

پولیس لائن کے ایک کوارٹر میں ایک شہید کی بیوہ اور سات بچے اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل شہید الطاف حسین کی صاحب زادیوں کا کہنا ہے کہ چوہدری اسلم نے ان کے والد کی وفات کے بعد ہر موقع پر بھرپور مدد کی اور لگتا ہے کہ وہ آج ایک بار پھر یتیم ہو گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل الطاف کی شہادت کے بعد چوہدری اسلم نے اس خاندان کو ہر تہوار پر یاد رکھا۔ اس کی کفالت کی ذمہ داری اس طرح اٹھائی کہ کسی کو کان و کان خبر نہ

چوہدری اسلم کے ساتھ شہید ہونے والے پولیس اہلکار کامران خان نے اپنے ننھے منے بیٹے ہادی خان کی دو روز قبل پہلی سالگرہ منائی، دو روز پہلے جب اس کی پہلی سالگرہ کا تحفہ پاپا نے دیا تو کسی کو خبر نہ تھی کہ یہ بچہ اب پوری زندگی باپ کے بغیر گزارے گا۔



ہادی کے دادا کہتے ہیں کہ ان کا پوتا بھی بڑا ہو کر وطن کا سپاہی بنے گا شہید پولیس اہلکار کامران کے دو بیٹے ہیں۔ ہادی ابھی ایک سال کا ہے جبکہ اس کا چھوٹا بیٹا صرف چار دن کا ہے۔ بیوہ شدتِ غم سے نڈھال ہے۔ کامران کے باپ کا عزم سندھ پولیس کے اہلکاروں کو حوصلہ دے رہا ہے۔ چوہدری اسلم کی بہادری اور جواں مردی کو آج دنیا یاد کر رہی ہے، لیکن ان کے ساتھ شہید ہونے والے بہادر اہلکاروں کی قربانیاں بھی اتنی ہی خراجِ عقیدت کی مستحق ہیں جنہوں نے آخری وقت تک اپنے افسر کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ ہی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

ہونے دی۔ کراچی پولیس کے شہید افسر جہاں مجرموں اور دہشت گردوں پر قہر بن کر ٹوٹے تھے وہیں وہ ضرورت مند خاندانوں کی نہایت خاموشی سے مدد بھی کیا کرتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ایسے کئی خاندان اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہے ہیں۔

جبکہ دوسری طرف ہنگو میں ایک طالب علم اعتزاز حسن اسکول جا رہا تھا تو راستے میں اسکول یونیفارم پہنے ہوئے ایک لڑکے نے اس سے سرکاری ہائی اسکول ابراہیم زئی کا پتا دریافت کیا۔ اعتزاز نے کہا کہ آپ تو ہمارے اسکول کے نہیں ہو جس پر اس نے کہا کہ وہ اسی اسکول کا طالب علم ہے۔ اعتزاز کے دوستوں نے اسے خبردار کیا کہ یہ خودکش بمبار بھی ہو سکتا ہے پیچھے ہٹو، لیکن اس نے انہیں کہا کہ آپ پیچھے ہٹ جائیں میں اس کو قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ورنہ یہ اسکول کے اندر جا کر تباہی مچا دے گا۔ جب 15 سالہ اعتزاز بمبار کو روکنے جا رہا تھا اس وقت اسکول میں اسمبلی ہو رہی تھی جس میں ایک ہزار کے قریب بچے موجود تھے۔ بمبار کا ٹارگٹ اسمبلی تھی لیکن اعتزاز نے اسے روک لیا۔ اعتزاز حسن کے والد ابوظہبی میں کام کرتے ہیں۔ اعتزاز کے والد لوگوں کو کہتے ہیں کہ اس سے کوئی تعزیت کے لیے بھی نہیں آیا بلکہ شہادت کی مبارکباد دینا آیا ہے وہ اپنی ماں کو رلا کر سیکڑوں ماؤں کو رونے سے بچا گیا۔ 12 سال سے جاری دہشت گردی کے خلاف جنگ میں 50 ہزار پاکستانیوں کی جان چلی گئی جہاں دہشت گرد اپنی مذموم کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں وہیں وطن پر جان قربان کرنے والوں کی کمی نہیں۔ جب تک اعتزاز جیسے بہادر اور چوہدری اسلم جیسے ہیرو جنم لیتے رہیں گے، ملک دشمن عناصر کی کمر ٹوٹتی رہے گی۔ ہمیں بہادری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چوہدری اسلم کی شہادت کے بعد وہ اپنے اگلے ہدف میں کامیابی حاصل کر لیں تو پھر ہم ہوش میں آئیں اور اپنے قومی ہیرو کو پھر سپردِ خاک کریں۔

اس مٹی کا قرض مجھ پہ
میں نے اپنا فرض نبھایا
کیا نہیں احسان کسی پہ
میں نے اپنا فرض نبھایا
اب تم دن کا سورج دیکھو
اپنی ہوگئی رات
اپنی ہوگئی رات

☆☆......☆☆

سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ،
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

سرِ آئینہ، پسِ آئینہ

مقبول جلیس

مقبول جلیس کے سفاک قلم سے، سب کچھ عیاں کرتی، ایک مرد کہانی

مشرقی پاکستان کی رحلت کا دُکھ اور صدمہ یا زخم ایسا ہے جس پر نہ صرف ہم بلکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی آہ وفغاں کرتی رہیں گی اور کیوں نہ کریں کہ یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے لیکن جس ''زچہ خانے'' میں بنگلہ دیش کی ''ولادت'' ہوئی ہے وہ اب اس نومولود کو گود لے کر پچھتاوؤں کی کس منزل میں ہے۔ اسے عوامی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہو تو مقبول جلیس کے سفار قلم سے ایک یادگار آئینہ تحریر جس سے سب کچھ عیاں ہے آسام کی حالیہ خوں ریزی، بمبئی کے فٹ پاتھ اور بھارت میں بھک منگوں کی یلغار ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے بہت سے تعلیم یافتہ افراد کو جن میں ادیب وصحافی اور تاجر و سرکاری ملازم بھی شامل ہیں، یہ کہتے سنا ہے کہ جن طاقتوں نے بھی بھارت کو اکسا کر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنوایا ہے، انہوں نے بھارتی اقتصادیات کی شہ رگ پر ایک ناسور پیدا کر دیا ہے۔ جس سے ہمیشہ فاسد مادّہ بہتا رہے گا اور یہ ہمیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔

تقسیم ہند سے پہلے بھی بھارت میں گھروں میں کام کرنے والے نوکروں کا کبھی قحط نہیں رہا شاید ہی کوئی متوسط خاندان ایسا ہو جس میں حسب اوقات ایک دو ملازمین نہ ہوتے ہوں۔ زمینداروں، جاگیرداروں، اعلیٰ افسران اور صنعت کاروں کی تو ویسے ہی بڑی بات تھی۔ ان گھرانوں میں نوکر کی نسل نوکر ہی پیدا کرتی تھی اور کئی کئی نسلیں ایک ہی خاندان کی غلامی اور چاکری کرتے کرتے مر جاتی تھیں۔ وہ بھی دور جہالت نہ تھا، مگر نوکر بکتے تھے، خیرات ہوتے تھے اور بیٹیوں کے جہیز میں جاتے تھے، اس کے باوجود ان پر غلاموں کی خرید و فروخت کا الزام کبھی نہیں لگا حالاں کہ ہوتا وہی کچھ تھا۔

اب جب کہ انسانی بیداری کا دَور ہے، اپنے حق کے لیے لڑنے اور اپنی شناخت کرانے کا زمانہ ہے، بھارت میں گھریلو ملازمین کی اوقات میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ اُن کے حق میں حالات مزید بدتر ہو گئے ہیں اس لیے کہ لاکھوں نو دولتیوں کو آداب خواجگی نہیں آتے۔ وہ گھرانے اُجڑ گئے جو نوکر کو پاؤں کی جوتی تو ضرور سمجھتے تھے مگر ان کی ناز برداریاں بھی کرتے تھے اور جہاں ظلم کرتے تھے وہاں عطا اور بخشش بھی ان کا وتیرہ تھا۔

بھارت میں گھریلو نوکر اس قدر بے اوقات، بے آواز اور ذلتوں کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایسی بھیانک روزگاری شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ مانا کہ بھارت ایک بہت بڑا صنعتی اور زرعی ملک ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ''ٹائمز آف انڈیا'' کی

رپورٹ کے مطابق ہر ماہ تقریباً بیس ہزار افرادی قوت مختلف ممالک میں ایکسپورٹ کرتا رہتا ہے اور اس وقت لاکھوں بھارتی باشندے [illegible] ملک [illegible] ہیں۔ اس کے باوجود بھارت میں بے روزگاری کا مسئلہ ختم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے اور کیوں نہ بڑھے جب کہ ہر نئے سورج کی طلوع ہوتی کرن یہ



دیکھتی ہے کہ اگر دس ہزار آدمی مرے ہیں تو تیس ہزار بچے بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ بھارت کی اتنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی مستقبل میں کیا رنگ لائے گی۔ اس کا تصور ہی وحشت ناک ہے۔

بمبئی میں میرے قیام کو ایک مہینہ گیارہ دن ہو چکے ہیں اور میری نوٹ بک کا یہ حکم ہے کہ میں کسی بھارتی گھریلو نوکر سے ملاقات کروں۔ سوال یہ تھا کہ وہ نوکر کون ہو؟

کسی بڑے صنعت کار کی کوٹھی کا ملازم ہو؟

کسی نامور اداکار یا اور اداکارہ کا چاکر ہو؟؟

یا کسی متوسط گھرانے میں کام کرنے والا ہو جو جملہ مراعات سے محروم رہتا ہے اور جو یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ آنے والا دن اس کی قسمت کے لیے کیا پیغام لے کر آئے گا۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ گھروں میں کام کرنے والے کئی صوبوں اور علاقوں کے مرد اور عورتیں ہیں۔ ہر ایک کی افتادِ طبع الگ ہوتی ہے۔ سوچ کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے اور خواہشوں کے پیمانے بھی جدا ہوتے ہیں۔ کوکن کا رہنے والا بنگالیوں کی طرح مچھلی کا شیدائی بھی ہوتا ہے اور بلا کا چکر باز بھی۔ گوا کا رہنے والا چاہے گندی نالیاں صاف کر رہا ہو یا گھر میں جھاڑو دے رہا ہو اور اس کے تن پر لنگوٹی ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے ذہن میں یہ خناس اب بھی موجود ہے کہ وہ ''رائل فیملی'' کا آدمی ہے۔ دو روپے کا ٹھرا اور سڑا ہوا سگار مل جائے تو وہ اسی کو اپنی معراج سمجھ لیتا ہے۔ الغرض بھارت کے جتنے صوبے ہیں، ہر صوبے کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اپنی ایک سوچ ہے۔

بہر حال میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بمبئی کے ''پوش'' علاقے میں گھومنے کی بجائے بھنڈی بازار کے پہلو میں واقع ''نل بازار'' جاؤں جو گوشت، مچھلی، سبزی اور فروٹ کی منڈی ہے۔ جہاں صبح کے وقت ہر گھر کا نوکر سودا سلف لینے آتا ہے، میری دوسری منزل کرافورڈ مارکیٹ ہو سکتی تھی۔ اس مارکیٹ میں بظاہر تو سبزیاں، گوشت وغیرہ بکتا ہے۔ مگر خریدار ہو تو وہ کون سی شے ہے جو یہاں نہیں بکتی؟ ڈالر، ریال، پونڈ اور پرندوں سے لے کر زمانے بھر کی شرابوں تک کے سودے ہوتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں بھی صبح سے شام تک گاہکوں اور گھریلو ملازمین کی ریل پیل رہتی ہے، ایک عام گاہک اور گھریلو ملازم کی پہچان زیادہ مشکل نہیں ہے کیوں کہ نوکر کے چہرے پر اس کی نوکری تو نیون سائن کے اشتہار کی طرح روشن رہتی ہے۔

خیر قصہ مختصر! ''فلسفے توں مارو بندوک'' میرا مطلوب بالآخر مجھے کرافورڈ مارکیٹ ہی میں ایک پرندے فروش حاجی احمد سیٹھ کی دکان پر چرس کے دم لگاتا ہوا مل گیا۔ یہ حاجی احمد سیٹھ شب دیجور سے زیادہ کالے، دن بھر پرندے بیچتے اور ٹھرا پیتے رہتے ہیں۔ ان کے کالے چہرے پر لال انگارا آنکھیں ان کی خاص پہچان ہے۔

کرافورڈ مارکیٹ ہی میں ایک گوشہ ایسا ہے جس میں بندر، چڑیا، طوطے اور الو بکتے ہیں۔ اسی میں سے ایک دکان ان کی بھی ہے احمد سیٹھ حاجی یوں ہیں کہ ان کے دادا یا پردادا شاید حج کر آئے تھے۔ بس اس کے بعد یہ ایک حج ہی ان کا ورثہ بن گیا۔ ان موروثی حاجی صاحب سے میری ملاقات کسی مسجد میں نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ہم تبلیغی سلسلے میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ اسی لیے ایک حمام کے دو ننگے جلد ہی ایک دوسرے کے دوست ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مجھے چرس سے سخت نفرت ہے۔ اس لیے کہ آدمی کو اگر اپنی ''مت'' ہی مارنی ہو تو وہ ''شیر کا دودھ'' کیوں نہ پیے۔

میرا مطلوب میری خوش بختی سے کوکنی ہی نکلا۔ عمر اس کی بہ مشکل بیس پچیس کے درمیان ہوگی مگر چرس پی پی کر اس نے اپنی عمر کو آٹھ دس سال بڑھا لیا تھا۔ جسم عام کوکنیوں کی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ رنگ صاف، چہرہ لمبوترا، لباس ملباریوں کی طرح اڑسی ہوئی لنگی کے اوپر میلی سی قمیص، پاؤں میں اکڑی ہوئی پلاسٹک کی رنگ اڑی مٹی اور کیچڑ میں سنی چپل، نام محمد شاکر۔ یہ ایک میمن سیٹھ کے ہاں نوکر ہے جو کھٹاؤ ٹیکسٹائل مل کا ایجنٹ ہے اور ڈونگری کے علاقے میں رہتا ہے۔ محمد شاکر سے میری ملاقات دن میں ہوئی وہ سودا خریدنے اور دم لگانے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ''میرا سیٹھ سات بجے شام کو اپنے دھندے سے آتا ہے، پھر آٹھ بجے گھر سے نکل جاتا ہے

تو میری ڈیوٹی بھی خلاص ہو جاتی ہے۔ پھر سالا صبح تک پھر ست ہے۔"

"تمہارا سیٹھ صبح کو نکلتا ہے شام کو آتا ہے پھر نکل جاتا ہے، یہ کیا؟"

"تم سمجھا نہیں باپ۔ ابھی وہ سٹہ بھی کھیلتا ہے نا۔ گیارہ بجے اوپننگ کھلتا ہے، پھر ایک ڈیڑھ بجے تک کلوزنگ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ گپ شپ کر کے تین ایک بجے تک گھر کو آتا ہے، یہ سالے کا روٹین ہے۔ ابھی میری سیٹھانی ہے نا۔ وہ بھی بیسی ڈالتی ہے نی۔ سٹہ کھیلتی ہے۔ دونوں اُلو کے ماپھک رات بھر جاگتے رہتے ہیں؟"

"تو تم مجھ سے کب ملو گے؟"

"آج ہی رات کو سیٹھ۔ اپنا حاجی کا دکان جند اباد۔ اپن روج رات میں ادھر اچ ہوتا ہے"

"حاجی رات کو گھر نہیں جاتا کیا؟"

"اس کا اصلی گھر تو ورلی میں ہے سیٹھ، مگر سالا دس بارہ روج میں ایک دن جاتا ہے۔ اس نے اِدھر میں ایک رانڈ رکھیلا ہے۔ وہ شام کو آ جاتی ہے۔ حاجی کو دارو پلاتی ہے پھر دکان کا پردہ گرا دیتی ہے۔ ہی ہی ہی۔ اپنا حاجی بھی امریکن سٹے کا بیٹ لیتا ہے نا۔ یہ بھی اُلو کے ماپھک رات کو جاتا اور اس رانڈ کے ساتھ ٹیم گزارتا ہے۔ ہی ہی ہی۔"

حاجی سیٹھ نے شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے بڑے لاڈ سے شاکر کی گردن پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے ایک لذیذ سی گالی دی اور بولے۔ "یہ بھی کچھ کم نہیں اے سالا۔ شام کو بولوں گا یہ کیا ہے۔ ابھی تم آنا جرور، کیا۔"

اتنے میں چند عرب مارکیٹ میں داخل ہو گئے تو ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔

"یا اخی۔ اہلاً۔ اہلاً۔"

کوئی طوطا لے دوڑا تو کوئی بندر۔

آج کل کیا بمبئی، لندن اور پیرس، ہانگ کانگ، ملائیشیا اور سری لنکا، عرب جس مارکیٹ یا بازار میں چلے جاتے ہیں ان کی آؤ بھگت ایسی ہی ہوتی ہے کیوں کہ وہ ہر قسم کی شاپنگ کرنے میں بڑی شہرت حاصل کر گئے ہیں اور انہوں نے اپنی کردار سے ایک محاورے میں ترمیم کر دی ہے، پہلے لوگ کہتے تھے۔

"بھیجنے کوئی گانٹھ کا پورا عقل کا اندھا۔"

اب کہا جاتا ہے۔

"بھیجنے کوئی ریگستان کا شیخ۔"

اللہ ان لٹیرے دکانداروں کی دعائیں قبول کر رہا ہے اور ہر بازار میں یہ "علی بابے" منڈلاتے، لٹتے اور ہنستے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاپنگ کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے۔ ضرورت شیونگ بلیڈ کی ہو گی تو بندر خرید لیں گے۔ اناس کے ٹوکروں کا سودا کریں گے اور اپنی منزل پر پہنچ کر پھر انہیں یاد آئے گا کہ بلیڈ بھی لینا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ کسی چیز کے دام چکانا تو بڑی بات ہے دام پوچھنا بھی یہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ جنہیں خریدنا خواہ بلیڈ ہو یا کمائی پورہ کی عورت، انہیں اس کی دھار اور نئے پن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بس چیز ہونی چاہیے۔

بمبئی میں صبح سے شام یا شام سے صبح کرنا قطعی جوئے شیر لانے کے برابر نہیں ہے، دل ہوس پسند اور نگاہوں کی بلکاری کے ہزاروں تماشے موجود ہوتے ہیں اور ہر تماشا ایسا کہ بقول شاعر

پھر نگاہ لوٹ کر نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

دن گزرا، سورج غروب ہوا، ایک نیا بمبئی انگڑائی لے کر جاگا تو میں حاجی سیٹھ کی دکان پر پہنچ گیا۔ انہوں نے پرندوں کے پنجروں پر گندے ٹاٹ اور کڑوے تیل کی بدبودار گودڑیاں ڈال دی تھیں تا کہ راتوں کو آوارہ کتے اور شکاری بلّیاں انہیں تنگ نہ کریں اور نہ دوڑائیں۔ شاکر اور حاجی سیٹھ میرے انتظار میں چرس کے نہ جانے کتنے سگریٹ پھونک چکے تھے۔ البتہ وہسکی کی بوتل اور ان کی فربہ جسم رانڈ کے جسموں پر لباس موجود تھے۔ فربہ جسم عورت کیسی تھی اس کا نقشہ میں کیا کھینچوں بالکل سکھوں کے سفری بستر کی طرح کہ کہیں سے گودڑ جھانک رہا ہے تو کہیں لوٹا اٹکا ہوا ہے۔ بندھی ایک جانب سے ہے تو کھلی کئی جانب سے۔ ہاتھ پیروں کی اتنی مضبوط کہ پنجرے میں ہوتی تو بن مانس لگتی مگر تھی زندہ دل۔ جس سے بھی مخاطب ہوتی اس کی ران پر ایک دھپ ضرور

ماری اور ''پیوٹ'' اتنی کہ سگریٹ چرس اور وہسکی کسی پر بند نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس میں کیا خوبیاں تھیں، یہ حاجی سیٹھ جانیں مجھے تو شاکر کو کنی سے انٹرویو کرنا تھا۔ لہٰذا ساری توجہ اور گفتگو کا مرکز وہی رہا۔ اس نے بتایا کہ ''میں نو دس سال کا تھا کہ اپنے باپ کے ساتھ کوکن کی ایک اسٹیٹ جنجیرہ سے بمبئی آ گیا۔ میرا باپ کار گوشپ میں خلاصی تھا۔ میری ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ میرے باپ سالے نے دوسری شادی کر لی۔ یہ نئی ماں میرے پر بڑا جلم کرتی تھی۔ بمبئی میں میرے کو ایک گجراتی سیٹھ نے اوپری کام کے لیے دو روپے مہینہ پر نوکر رکھ لیا۔ ادھر میں، میں نے چار سال کام کیا۔ سیٹھ تو سالا دو لوٹے پانی سے اشنان کر کے اور مندر کا گھنٹہ بجا کر دھندے پر چلا جاتا تھا۔ سیٹھانی میرے کو لے کر آٹھ دس کوس دور حاجی علی کی درگاہ کے سامنے وشنو کے مندر میں پاٹ کرنے جاتی تھی۔ ادھر میں اس کا پتا چل گیا تو میری پگار ڈبل ہو گئی۔ سیٹھ دو روپے دیتا تھا اور سیٹھانی دو روپے الگ۔ ہم ادھر میں بڑے مجے کیا پھر اوپر کے کام کے ساتھ ساتھ سیٹھانی کے پاؤں دبانے کی ڈیوٹی بھی لگی تو پگار پھر ڈبل ہو گئی۔ یہ چرس پہلی بار اسی نے پلایا تھا۔''

اس پر حاجی سیٹھ کی بن مانس محبوبہ نے شاکر کی ران پر ایک دھپ مار کر بازاری عورتوں کی طرح آنکھ بھی ماری اور ہنستے ہوئے بولی۔ ''تو سیٹھ کو یہ بھی بتا نا کہ میں کھالی پاؤں نہیں دباتا تھا۔''

''چپ چھنال۔ تیرے کو بڑا مجا آتا ہے۔'' یہ ڈانٹ حاجی سیٹھ کی تھی۔

پھر شاکر نے بتایا کہ اس گھر میں نوکری کے دوران اُسے سٹہ کھیلنے کی عادت بھی پڑ گئی۔ ''سالا اپنی ساری کمائی اس میں چلا جاتا تھا۔ سال کا سال میرا باپ بمبئی آتا تھا۔ دو چار دن کے لیے۔ معلوم نہیں کس...... نے اس سے میری شکایت کر دی تو اس نے یہ نوکری چھڑا کر گودی میں کام دلا دیا۔ بارہ آنے روج پر۔ ابھی اپن نے ادھر میں آٹھ مہینہ کام کیا مگر بالکل مجا نہیں آیا۔''

''تیرے کو کاہے کا مجا آنے لگا۔ ادھر کون سا سیٹھانی تھا۔ جس کی تو ٹانگیں دباتا۔''

اس شب میں نے لاکھ کوشش کی کہ شاکر کو اپنے ڈھب پر لا کر کچھ کام کی باتیں کروں کیوں کہ جن باتوں کا وہ انکشاف کر رہا تھا میرے لیے قطعی نئی نہیں تھیں، بمبئی کے بیس فیصد گھرانوں کی سیٹھانیاں گھریلو نوکروں سے جن میں ڈرائیور، چوکیدار یا سودا سلف لانے والے کم عمر لڑکے ہوتے ہیں، کچھ ذاتی کام بھی لیا کرتی ہیں اور جن نوکروں کو ایسے گھرانے مل جائیں وہ پھر دُنیا کے کسی اور کام کاج کے نہیں رہتے۔ لہٰذا میں نے مناسب یہ سمجھا کہ یہ شام تو خرافات میں گزار دو اور دن کی روشنی میں شاکر کا تنہائی میں گھیراؤ کرو۔

دوسرے دن شاکر اپنے سیٹھ اور سیٹھانی کو جھانسا دے کر میرے ہوٹل آ گیا۔ اس وقت وہ ذرا سو بر تھا۔ میں نے اس وقت کو غنیمت جان کر جلدی جلدی سوالات کرنے شروع کر دیے۔

''اب گھروں میں پہلے کی طرح آسانی سے نوکری مل جاتی ہے؟''

''نہیں سیٹھ۔ اس واسطے کہ اب تو ہندوستان بھر کا بے کار اور بھوکا بمبئی آتا ہے۔ وہ تو پگار بھی نہیں پوچھتا۔ کھالی روٹی کپڑا دے دو وہ خوش ہو کے کام کرے گا۔ سالا لوگوں نے ہمارا بھی ویلیو کھراب کرایا ہے اور یہ کیرالہ والا۔ بنگلہ دیش والا، ان لوگوں نے تو سب کا ستیاناس مار دیا ہے یہ بھوکے سالے ہر شہر میں بھیک مانگتے ہیں یا بغیر پگار کے نوکری کرتے ہیں۔''

''تم لوگ اپنے سیٹھوں کے ہاں چوریاں بھی تو کرتے ہو نا؟''

''ہاں سیٹھ۔ نشے پانی کی عادت ہوئے نا تو تھوڑا بہت چکر چلانا پڑتا ہے۔ ابھی اپن نے کبھی بڑا چوری نہیں کیا۔ اس واسطے کہ بدنامی ہو جائے گا تو پھر لفڑا پڑ جائے گا۔ ہاں وہ لوگ لمبا ہاتھ مارتا ہے جو بمبئی آ کر جلدی سے ملک واپس جانے مانگتا ہے۔ اپنا تو کوئی ملک ہی نہیں ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ۔ تم کو کیا تنخواہ ملتا ہے۔''

''سیٹھ ابھی تیرہ چودہ سال سے ایک ہی جگہ کام کرتا ہوں۔ ساٹھ روپے پگار لیتا ہوں۔ سال میں ایک جوڑا کپڑا بھی۔''

''اور اوپر سے کتنا مارتے ہو؟''

''کبھی دو روپے، کبھی تین روپے۔ جیادہ نہیں ملتا۔

سیٹھانی پائی پائی کا حساب لیتی ہے۔"

"پھر کیسے مارتے ہو؟"

"کیا بولے باپ ابھی۔ سیٹھ نے چار کلو گوشت منگایا۔ ہم نے پاؤ کلو کا ڈنڈی مارا۔ وہ سالا کدھر ترا جو لے کر بیٹھتا ہے۔"

"گھر کے نوکر تو گھر کے بھیدی ہوتے ہیں۔ تم لوگ اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہو؟"

"سیٹھ ہم تو ایسا نہیں کرتا۔ بھلا جس کا نمک آدمی کھاوے۔ اس کو کیا بولے لیکن سب ماں کے جنے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ سالے گھر کی ایک ایک رپورٹ باجار میں دیتے ہیں۔ سیٹھ یہ بُری بات ہے نا؟"

"ہاں شاکر۔ تم سچ کہتے ہو۔ یہ بتاؤ تم نے جس گھر کا بھی نمک کھایا۔ اس کے لیے کوئی قربانی دی یا اس کی آرزو ہے؟"

"آرزو نہیں سیٹھ۔ ابھی حاجی سیٹھ سے پوچھو۔ ہم نے اس کو پکڑے جانے سے بچایا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارا سیٹھ دھندا تو کپڑے کا کرتا ہے لیکن ساتھ میں دو نمبر کا کام بھی کرتا ہے۔ گودی میں اس کا بڑا جان پہچان ہے۔ ایک مرتبہ اس کا چالیس باٹلی اسکاچ کا پکڑا گیا۔ جب گھر میں دھاڑ پڑی تو سیٹھ گھر میں نہیں تھا۔ ماں کسم ہم آگے بڑھا اور بولا۔ یہ مال ہمارا ہے، ہم ادھر میں چھپا کے رکھے لا ہے۔ سیٹھ کو کھبر نہیں ہے۔ یہ دھندا ہم کرتا ہے۔ آبکاری والوں نے ہم کو پکڑ کر اندر کر دیا۔ تین مہینے جیل میں رکھا۔ سیٹھ نے ہماری بڑی مدد کی۔ ابھی تک وہ سالا احسان مانتا ہے میرا۔ دس روپے پگار بھی بڑھا دیا تھا اس نے۔"

"ہاں شاکر نوکر کو نمک حلال تو ہونا ہی چاہیے۔ تم نے کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے۔ کچھ بننے کی خواہش کچھ کرنے کی آرزو یا اسی نوکری میں خوش ہو؟"

"سیٹھ ابھی تم انڈیا میں نہیں رہتا۔ ادھر میں ایک وقت کا روٹی مل جاوے نا، تو بہت ہے۔ ابھی ہم کیا سوچے سالا۔ ہمارا باپ بڈھا ہو گیا۔ ساری جندگی مجوری کی۔ کیا ہے اس کے پاس؟ خلاصی کو تو کمپنی پینشن بھی نہیں دیتا۔"

انسان کی فضا میں پہلی پرواز

4 جون 1783ء کو فرانس کے دو سگے بھائیوں جوزف گوفیئر (1810-1740) اور ایسٹین گوفیئر (1799-1745) نے گرم ہوا کے غباروں کو فضا میں بلند کر کے ہوا بازی کی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ ستمبر 1783 میں انہوں نے ورسائی میں غبارے کے ذریعے تین جاندار بھی فضا میں اڑانے کا تجربہ کیا، یہ تین جاندار ایک بھیڑ، ایک بطخ اور ایک مرغا تھے۔ اسی ماہ 21 ستمبر کو انہوں نے اسی غبارے کے ذریعے دو انسانوں کو بھی پرواز کروانے کا تجربہ کیا یوں انسان کا فضا میں پرواز کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔

"پینشن تو تم کو بھی نہیں ملے گی۔ پھر تمہارا بڑھاپا کیسے گزرے گا؟ اس کے متعلق سوچا ہے تم نے؟"

"نہیں سیٹھ۔ ابھی یہ بات مت کرو۔ اپن سالا سوچنا اچ نہیں مانگتا۔ خواہ مخواہ مستک کھراب ہوتا ہے۔"

اور میں نے دیکھا کہ واقعی اس کا موڈ ایک دم بگڑ گیا تھا۔ شاکر میرے سامنے بیٹھا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں بے روزگار خانہ زاد، ملازمین اور فیکٹریوں کے مزدور میرے اس سوال پر جھنجلا اٹھے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی ہے۔ ان کے چہرے مزید زرد پڑ گئے ہیں اور ایسا ہونا بھی لازمی تھا۔ آنے والے دنوں کے متعلق تو وہ سوچتے ہیں جن کو آج گردش، آج کی بھوک اور آج کی عریانی اس کی مہلت دے اور آج کے "مہذب انسان" کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک طبقہ اپنی بدہضمی کے لیے چورن کھا رہا ہے اور دوسرا طبقہ بھوک سے نڈھال توندیل سیٹھوں کے لیے چورن کوٹ رہا ہے۔ عالیشان محل تعمیر کرنے والا راج ساری عمر چھت کو ترستا ہے اور گھر کے کام کاج کرنے والا گھریلو ملازم کسی گھر کو اپنا گھر نہیں کہہ سکتا۔

"یہ کیسا نیائے ہے داتا یہ کیسا انیائے۔"

☆......☆

دوسری مرد کہانی

عمر کی نقدی



محمد شہزاد کنول

ایک معصوم پھول، قضا کی بے رحم آندھی کی نذر ہو گیا

شارجہ، دبئی سے ایک دل سوز مرد کہانی

عاشر میری پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ پہلی اولاد، پہلا بیٹا۔ جب پہلی بار میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں لیا تو اپنا آپ معتبر لگنے لگا۔ اس کے وجود کی گرمی ململ کو چیرتی ہوئی میرے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی تھی اور مجھے سرشار



کررہی تھی۔ کیسا سرخ وسفید چہرہ تھا۔ میں اپنی ہی نظر سے پریشان ہونے لگا کہ کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔ جلدی سے توجہ کہیں اور مرکوز کی۔ مسہری پر لیٹی رابعہ مسکراتی آنکھوں سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ زچگی کے عمل سے گزرنے والی تکلیف ابھی تک اس کے چہرے پر نقش چھوڑے ہوئے تھی۔

''رابعہ، یہ ہمارا بیٹا ہے! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس قسم کا ردِعمل دکھاؤں۔'' اپنی آواز کی لرزش کو میں خود بھی محسوس کررہا تھا۔

''خوشی تو آپ کے ہر عضو سے جھلک رہی ہے توصیف'' یہ کہتے ہوئے رابعہ کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہوچکی تھی۔

بچوں سے تو یوں بھی مجھے لگاؤ تھا، اب جب میرا اپنا بیٹا تھا تو میں اس کے ناز کیونکر نہ اٹھاتا۔

میں ان مردوں میں سے نہیں جو بچوں کی پرورش کو سراسر عورت کی ذمے داری سمجھتے ہیں۔ بچے کی پرورش میں مرد کا حصہ بلاشبہ عورت کی نسبت کم سہی لیکن اسے نظر انداز کرنا، یا معمولی سمجھنا اچھی روایت نہیں۔ آفس سے واپسی پر عاشر کو گود میں لے کر بیٹھنا، اسے بہلانا، اس کے ساتھ خود کھیلنا، ضرورت پڑنے پر اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا۔ میں یہ سب کرکے خوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہ باتیں مجھے طمانیت کا احساس دیتی ہیں۔

اور جب عاشر تین ماہ کا ہوا تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اُسے ڈاکٹر بنالوں گا۔ کس قدر عزت ہوتی ہے ڈاکٹر کی اور معاشرے کی خدمت کا کام ہے۔ ڈاکٹر سے بڑا مسیحا کون ہوسکتا ہے۔ رابعہ میری باتیں سنتی تو ہنس دیتی۔

''ابھی سے تو یہ باتیں مت سوچیں۔''

''لو بھئی ابھی سے سوچنے میں کیا حرج ہے۔ ابھی سے سوچوں گا اسپتال تو میرے دل کی خواہش میرے بیٹے کے سینے میں منتقل ہوگی۔'' میری بات سن کر رابعہ کی ہنسی کھلکھلاہٹ میں بدل جاتی۔

''آپ بھی نا'' رابعہ پھر سے اپنے کام میں مشغول ہوجاتی۔

☆......☆

دو تین مہینے گزرے تو عاشر کی طبیعت تھوڑی خراب رہنے لگی۔ میں سمجھا شاید موسم کا اثر ہے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرا سرخ وسفید سا عاشر، ہلدی جیسا پیلا ہوگیا۔ کھانسی بھی کتنے دنوں سے اُس کا پیچھا نہ چھوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس چکر لگایا۔ معائنہ کرتے ہوئے اور لیبارٹری ٹیسٹ لکھتے ہوئے جانے کیوں مجھے ڈاکٹر کی سنجیدگی ہولائے جارہی تھی۔

''سب کچھ ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر۔''

''جی بس اب یہ رپورٹس آجائیں۔'' ڈاکٹر کا جواب سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ خدا خدا کرکے رپورٹس آگئیں۔

''عاشر آپ کی اکلوتی اولاد ہے؟'' رپورٹس دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے پوچھا تھا۔

''جی'' مجھے اپنی آواز گلے میں پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔

''دیکھیے توصیف صاحب، جو بات میں اب آپ کو بتانے جارہا ہوں، یہ بات آپ کے لیے شاید بہت تکلیف دہ ثابت ہو۔ عاشر کو ایک جینیاتی بیماری تھیلیسیمیا ہے۔ یہ بچے عام بچوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں، ان میں خون بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ زندہ رکھنے کے لیے انہیں ہر تین ماہ بعد انتقالِ خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ انتقالِ خون سے بھی حد سے حد ان کی عمر تیسرے عشرے تک ہی پہنچتی ہے، کیوں کہ انتقالِ خون ایک پیچیدہ عمل ہے۔ جس کی پیچیدگیاں......''

''تیسرے عشرے تک، آپ کا کہنا ہے میرا عاشر تیس سال کی عمر تک پہنچتے تک مرجائے گا۔ یہ کیسی بات ہے ڈاکٹر صاحب، طب تو خوب ترقی کرچکی ہے......''

''طب کی ترقی اپنی جگہ لیکن وہ بھی بعض مقامات پر بے بس ہوجاتی ہے۔ آپ دل چھوٹا مت کریں۔ یہ تو بہت دور کی باتیں ہیں، مجھے ہی شاید آپ کو یہ باتیں پھر کبھی بتانی چاہیے تھیں۔ ابھی صرف بیماری کی نوعیت کے بارے میں بتاتا۔ ابھی تو یہ سوچنا قبل از وقت ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے مجھے ڈھارس بندھانا شروع کی، لیکن یہ ڈھارس میرے کسی کام کی نہ تھی۔

عاشر کو اسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ انتقالِ خون،

مختلف ادویات ایک ہفتے اسپتال میں گزارنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اگلے مہینے دوبارہ چیک اپ کی تاکید کے ساتھ چھٹی دی۔

☆......☆

عاشر کی صحت کا خیال رکھنا تھا، اچھا ماحول میسر کرنا تھا۔ میں نے اور رابعہ نے مل کر اپنے بیٹے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔ خوب خیال رکھا، ڈاکٹر اور اسپتال بدلے، لیکن ہر ڈاکٹر یہی کہتا کہ انتقالِ خون علاج ہے اور دعا کریں خدا آپ کے بیٹے کو لمبی عمر دے، ویسے وقت پر انتقالِ خون اور تجویز کردہ ادویات کا استعمال ان بچوں کی عمر کافی بڑھا دیتا ہے۔

میرا عاشر پھر کبھی سرخ و سفید نہ ہوا، ہلدی جیسا پیلا ہی رہا۔ بیمار ہی رہا۔ وہ عاشر جسے میں ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھتا تھا، زندگی کا ایک چوتھائی حصہ اسپتال میں گزارنے لگا۔

سال پر سال گزرتے گئے، رابعہ نے مجھے دو اور بیٹوں کا تحفہ دیا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ممکن ہے کہ آپ کے دیگر بچوں کو بھی یہ مسئلہ ہو، لیکن خدا کا شکر کہ وہ بالکل تندرست تھے۔

عاشر سے میری محبت کبھی کم نہ ہوئی۔ وہ میری پہلی اولاد تھی اُس سے بھلا کیسے محبت کم ہو سکتی تھی۔ وہ میرا عکس ہی تو تھا، بیمار رہتا تھا تو کیا ہوا، تھا تو میرا بیٹا۔

وقت نے میرے بیٹے کو پندرہ سال کا کر دیا۔ دیکھنے میں وہ اب بھی دس سال سے کم لگتا۔ جلد کچھ ایسی چمکدار تھی کہ لگتا تانبے سے رگڑا گیا ہے۔ ناک کی ہڈی تو تھی ہی نہیں۔ ذہنی طور پر بھی کچھ کمزور تھا۔ اسی لیے ساتویں کلاس کے بعد دوبارہ اسکول نہ بھیجا۔

ابھی عمر پندرہ سال سے کچھ دن ہی اوپر ہوئی تھی کہ ایک دن مقعد کے راستے خون بہنے لگا، کثیر مقدار میں۔ میں پریشان سا بیٹے کو اسپتال لے آیا۔ رابعہ بھی میرے بعد منجھلے بیٹے کو لے کر آ گئی۔ میرا عاشر اندر ایمرجنسی روم میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی ٹیم کے ساتھ بند تھا اور باہر بنچ پر بیٹھے ہم میاں بیوی ایک دوسرے کو ڈھارس دے رہے تھے۔

''میرا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا نا۔'' آنسو پونچھتے ہوئے رابعہ نے پوچھا تھا۔

''ہاں، ہاں ہمارا بیٹا بالکل ٹھیک ہو جائے گا، بالکل صحت مند، میں اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناؤں گا۔'' میں نے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ بھی نا۔'' رابعہ کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

''ایمرجنسی روم سے ایک جونیئر ڈاکٹر آیا، مجھ سے مخاطب ہوا۔

''عاشر آپ کا پیشنٹ ہے۔''

''جی''

''ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے بیٹے کو ہم......'' ڈاکٹر کے منہ سے مزید لفظ سننے سے پہلے میرا دل چاہا کہ میں سماعت سے محروم ہو جاؤں لیکن......

''بڑے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ عاشر تیس سال تک زندہ رہے گا۔''

جونیئر ڈاکٹر نے سر جھکالیا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' ڈاکٹر میرا کندھا تھپتھپا کر تھکے قدموں سے مڑ گیا اور میں زار و قطار رونے لگ گیا، رونے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

☆......☆

تیسری مرد کہانی

بازاور ابابیل

دستگیر شہزاد

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ایک آزاد خیال نوجوان

کی یادوں کی پٹاری سے ایک چنگاری

آپ چھانگا مانگا تو ضرور گئے ہوں گے، لیکن اگر آپ جنگل کی سیر کرکے ہی لوٹ آئے ہیں تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھانگا مانگا میں صرف جنگل ہی نہیں، آبی جھیل بھی ہے اور صبح کی ہلکی دھوپ میں جھیل میں بوٹنگ کرنے کا جو لطف ہے، وہ جنگل کو دیکھنے کا نہیں۔ یہ راز کچھ ہم جیسے قدردان ہی سمجھ سکتے ہیں جو دور دراز علاقوں سے اس آبی جھیل پر آتے ہیں اور آتے بھی ذرا فرصت سے ہیں۔ میرا مطلب ہے روزگار کے کالے دھندوں سے بے فکر ہوکر آتے ہیں۔ آج میں آپ سے بھی وہ سچا واقعہ بیان کرنے جارہا ہوں جو میری محبوبہ سارہ سے وابستہ ہے۔ پہلی بار جب میں جھیل دیکھنے گیا تو میرے ساتھ میری منی ٹیوٹا کرولا کار تھی اور اس میں تین لڑکیاں تھیں۔ میری محبوبہ سارہ جو اگلی سیٹ پر اپنا سر میرے کندھوں سے لگائے بیٹھی تھی اور اپنے کٹے ہوئے بال بار بار میرے منہ پر جھٹکتی تھی اور پچھلی سیٹ پر اس کی دو سہیلیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چھانگا مانگا چیک پوسٹ پر ہمیں رُکنا پڑا۔ جہاں سے دو کلومیٹر لمبی ٹوٹی پھوٹی سڑک جھیل کو جاتی ہے۔ رُکنا اس لیے پڑا کیوں کہ وہ ٹوٹی پھوٹی سڑک زیرِ تعمیر تھی اور جھیل کو جانے والا راستہ بیریئر سے بند تھا اور جو سنتری وہاں کھڑا تھا وہ بیریئر اٹھانے کے موڈ میں بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ہارن بجایا، پھر میری رفیقوں نے کار میں سے اپنی گوری گوری مرمریں بانہیں زور زور سے ہلائیں۔ ایسی بانہیں جنہیں دیکھ کر خود فرشتے بیریئر اٹھانے آجائیں، لیکن یہ سنتری کسی بہت ہی گھٹیا مٹی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا، آخر تھک ہار کر میں باہر نکلا اور چوہدرانہ چال چلتا چیک پوسٹ کے بیریئر تک گیا۔ بڑے رعب سے میں نے کہا۔ ”ابے تم بیریئر کیوں نہیں اٹھاتے؟“

سنتری بولا۔ ”آپ وی آئی پی ہیں کیا؟“

میں نے کہا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“ سنتری بادشاہ میری ناسمجھی پر پہلے تو ہنسا، پھر بولا۔ ”آپ منسٹر ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

”اسمبلی کے ممبر ہیں؟“

”نہیں۔“

”بڑا صاحب ہیں؟“

ابھی تو نہیں۔

سنتری بولا۔ ”تم منسٹر نہیں، اسمبلی کا ممبر نہیں، بڑا صاحب نہیں تو تم کیا چیز ہے؟“

سنتری کا اس طرح آپ سے تم پر اترنا میری

غیرت کو چیلنج تھا۔ ٹائی کا زاویہ درست کر کے اور، کوٹ کو کھینچ کر سنوارتے اور اپنی چھاتی پھیلاتے ہوئے زہر آلود نظروں سے سنتری کو چھیدتے ہوئے میں نے کہا۔

"میں وسطی پنجاب کے ایک بڑے زمیندار کا صاحبزادہ ہوں اور یہ میری منی ٹیوٹا کرولا کار ہے۔" میرا یہ خیال کہ سنتری گھٹنے ٹیک دے گا، غلط نکلا۔ وہ برعکس اس کے ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے مسکرایا۔ وہ ایسی مسکراہٹ سے اس وقت مسکراتا تھا جب کوئی وی آئی پی نہ ہوتا ہو، لیکن وہ خود کو وی آئی پی ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اس بات کو جاننے کے بعد کار وہیں چھوڑ کے نہر کے ساتھ ساتھ باقی راستہ پیدل چلنا ہوگا، لڑکیوں کی طرف سے کوئی پرجوش رسپانس نہ ملا۔ سیب جیسے ہونٹوں کو اپنی سب سے دل کش ادا سے کھولتی ہوئی سارہ بولی۔ "ہائے میں مرگئی۔"

میں نے کہا۔ "ڈارلنگ! یہ ہائے وائے بعد میں کرنا اور مرنی بھی بعد میں رہنا، پہلے یہ کھانے پینے کا سامان اُٹھا کر وہ دو کلومیٹر پیدل چلنے کے لیے کمر باندھو۔" سارہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"تو کیا واقعی جھیل تک پہنچنے کے لیے کوئی اور متبادل راستہ موجود نہیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر یہ سنتری کا بچہ آپ تینوں میں سے کسی ایک پر عاشق ہوجائے تو الگ بات ہے۔ یوں کوئی چارہ نہیں۔"

وہ تینوں ایک ساتھ بولیں۔ "یوشٹ اپ۔"

"چلو ڈارلنگ۔ واپس چلیں۔ آج پھر جنگل ہی دیکھ لیتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانا کھا کر واپس چلے جائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے دوسری دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ جس کا نام فاریہ تھا۔ اس کے انداز میں فلسفیوں جیسی بے پروائی تھی کہ "کار ہے تو ہے نہیں تو نہ سہی، کرولا نہیں تو پیدل ہی سہی۔" لیکن وہ دوسری لڑکی جو گول مٹول اور گدگدی سی تھی اور جس کا نام عروسہ تھا۔ وہ اسکارف سنوارتی ہوئی اور پرس میں سے گاگلز نکال کر لگاتے ہوئے بڑے جوش سے بولی۔

"میں کہتی ہوں یہ تو اچھا ہوا۔ وہ پکنک ہی کیا جہاں چار قدم پیدل نہ چلنا پڑے۔" اور پھر سارہ کے



بجھے ہوئے انداز دیکھ کر بولی۔ "لائف میں کچھ ایڈونچر بھی ہونا چاہیے۔" ایک ایک تھرماس اپنے کندھوں سے لٹکائے اور پرس اٹھائے وہ تینوں آگے پیچھے جارہی تھیں اور ایک لدے ہوئے خچر کی طرح میں ان کے پیچھے ہانپتا کانپتا اور لڑھکتا ہوا جارہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں کراکری اور دوسرے میں کھانے پینے

کے سامان کے ڈبے، اسٹوو اور ساس پین تھے۔ دو تھرماس میرے کندھوں پر لٹک رہے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں ہینڈل والی دو بید کی ٹوکریاں تھیں اور میری پیٹھ پر گول کی ہوئی دو چٹائیاں تھیں۔ میں ان تینوں مس صاحبان کی تفریح کے سامان سے لدا پھندا ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ ہم ابھی بمشکل دو فرلانگ گئے ہوں گے کہ میری قمیض اور اوورکوٹ پسینے میں تر ہو کر میری پشت کے ساتھ چپک گئے اور مجھے ان مزدوروں سے حسد ہونے لگا جو منوں بوجھ اٹھائے آسانی سے سیدھی سپاٹ چڑھائیاں چڑھ جاتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے کوٹ اور پتلون نہیں پہنا ہوتا۔ پیٹھ عام طور پر ننگی ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھسا ہوا کرتہ پہنا ہوتا ہے، اس طرح کون بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ کبھی وہ کوٹ پتلون پہن کر یہ سامان اٹھا کر دکھائیں، دن میں تارے نظر آ جائیں گے اور مجھے واقعی دن میں تارے نظر آ رہے تھے۔ تیزابی پسینہ جو میرے بالوں سے بہ نکلا تھا، میرے منہ کا ذائقہ بگاڑ رہا تھا۔ جو چیز مجھے سب سے زیادہ ستا رہی تھی وہ عروسہ کی گوری اور سڈول پنڈلیاں، گلابی رنگت تھیں جو غضب ڈھا رہی تھیں۔

اب مجھے سمجھ آئی کہ عروسہ نے پیدل چلنے کے لیے کیوں اتنا جوش دکھایا تھا۔ وہ میرے دل کو جلانا چاہتی تھی اور آخر وہ دو کلومیٹر میرا مطلب ہے دو ہزار کلومیٹر کا سفر ختم ہو گیا تھا۔ مجھے اس دن پتا چلا تھا کہ دو ہزار کلومیٹر کا مطلب دو کلومیٹر ہے۔ یہ نہیں کہ ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھا، ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی اور دو کلومیٹر گزر گیا۔ رومال نکال کر ذرا سا منہ پر پھیرا ایک کلومیٹر اور گزر گیا۔ ہاتھ سارہ کی کمر میں ڈالے اور بیک وقت کتنے کلومیٹر یک لخت گزر گئے۔ جھیل پر پہنچ کر کوئی آدھا گھنٹہ مجھے پکنک کے موڈ میں آنے میں لگے لگا۔

ٹائی اور بوٹ میں نے کھول دیے، کوٹ اور قمیض اُتار کر دور پھینکی، پتلون کے پائنچے چڑھا کر پیر جھیل کے پانی میں لٹکا دیے اور جھیل کی جانب سے آتی ٹھنڈی ہوا کی کنگھی اپنے پسینے میں شرابور بالوں میں چلنے دی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں کرائے کا قطعی نہیں، بلکہ صاحب زادہ ہوں تو میں نے جھیل کے چاروں طرف اچھی طرح سے دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہمارے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔

چاروں طرف تنہائی تھی، یا ہم تھے۔ اگر جہاز بحرالکاہل میں ڈوب گیا ہوتا اور مسافروں میں سے صرف ہم چاروں کسی ویران جزیرے میں یوں پہنچ گئے ہوتے تو بھی اس سے زیادہ تنہائی ہمیں نصیب نہ ہوتی۔ تین خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اس قدر مکمل تنہائی کا احساس میرے دل میں گدگدی کرنے لگا اور میرا جی چاہا کہ انسانی خاصہ چھوڑ کے زور زور سے ہنہناؤں اور دولتی جھاڑوں، لیکن میں نے صرف منہ سے سیٹی بجانے پر ہی قناعت کی۔ سیٹی میں تب ہی بجاتا ہوں جب بے حد خوش ہوتا ہوں۔ سارہ بھی بے حد خوش تھی، کیوں کہ وہ میری محبوبہ تھی۔ فاریہ اور عروسہ بھی بے حد خوش تھیں، کیوں کہ جیسا کہ ظاہر تھا، گو ان کو چاہنے والے ابھی تک نہیں ملے تھے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ لڑکیاں اپنی سہیلیوں کے عاشقوں کے ساتھ ہی ہنس کھیل کر اپنے دل کے ارمان پورے کر لیتی ہیں۔

بڑی دیر تک ہم بوٹنگ کرتے رہے۔ جھیل کا پانی ایک دوسرے پر اچھالتے رہے اور آسمان پر اُڑتی ہوئی مرغابیوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کی شرطیں لگاتے رہے۔ جب جھیل کے شفاف اور بے کنار پس منظر میں میں نے پہلی بار فاریہ کو مسکراتے دیکھا تو میں نے کہا، یہ مسکراہٹ ہے یا معجزہ، ایسی مسکراہٹ کو دیکھ کر تو اچھا بھلا آدمی بھی شاعر بن جائے۔ ایسی مسکراہٹ کا سہارا مل جائے تو ساری زندگی اسی کے سہارے کٹ سکتی ہے۔ اس لڑکی کی خوبصورتی ایک جیتی جاگتی خوبصورتی تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے دھوپ اور اُجلی ہو گئی ہو اور جھیل کے بلوری پانی میں مسکراہٹیں جھلک رہی ہوں۔ اس کے برعکس سارہ کی مسکراہٹ اتنی بے جان تھی جیسے وہ مسکرا نہ رہی ہو کسی ڈینٹسٹ کو اپنے دانت دکھلا رہی ہو۔

لڑکیوں کے پاس تو چھٹی حس ہوتی ہے، لیکن اگر نہ بھی ہوتی تو بھی فاریہ جان گئی ہوتی کہ میں اس کی مسکراہٹ پر مرمٹ گیا ہوں۔ وہ بہانے بن بہانے

مسکرائے جارہی تھی اور عروسہ بار بار انگڑائیاں لے رہی تھی اور پہلو بدل رہی تھی، تاکہ اس کے سڈول جسم کی ایک ایک گولائی میری آنکھوں کو بھا جائے۔ میں سوچ رہا تھا کہ عروسہ جیسی لڑکی کو اکیلے ملنا کتنا ناقابل فراموش تجربہ ہوگا، پھر مجھے سارہ پر ترس آنے لگا جو بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ سہیلیوں کے روپ میں وہ دو ناگنیں اپنے ساتھ لے آئی ہے۔

کشتی چلاتے ہوئے کافی دیر تک ان تینوں کی خوبصورتی کا موازنہ کرتا رہا۔ اگر خوبصورتی کا پلس سائیڈ ہوتا اور ہر ایک کو ووٹ ڈالنے کا حق ہوتا ہے تو سنہرے بالوں، بھوری آنکھوں اور گورے شفاف رنگ والی سارہ بھاری اکثریت سے اپنی دونوں سہیلیوں کو شکست دے دیتی، لیکن کوئی بین الاقوامی مقابلہ ہوتا جہاں پنڈلیاں، رانیں ناپتے ہیں، تو خوبصورتی کی ملکہ کا تاج یقیناً عروسہ کے سر پر زیب دیتا۔ فاریہ کسی مقابلے میں کامیاب نہ ہوتی، کیوں کہ اس کی خوبصورتی ایسی تھی جس کی قدر و قیمت کوئی گھائل عاشق ہی جان سکتا تھا۔

دو گھنٹے پیدل مارچ اور ایک گھنٹہ بوٹنگ کرنے سے بھوک چمک اٹھی تھی۔ فاریہ نے جب چٹائیوں پر پلیٹیں لگا کر ٹوماٹو ساس کی بوتل رکھی تو وہ مجھے بے حد پیاری لگی تھی۔ عروسہ نے اسٹوو جلا کر اوپر ساس پین رکھ دیا۔ سارہ نے ٹوکری میں سے کھانے پینے کے سامان کے ڈبے نکالنے شروع کیے، چکن فرنچ فش، مکھن، سوپ اور بھی بہت سارے ڈبے تھے۔ منہ میں آئے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے فاریہ اور عروسہ کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"بند ڈبوں والے لنچ کا آئیڈیا سارہ کا اپنا ہے۔ بھئی واہ یہ تو ایک طرح کا بین الاقوامی لنچ ہوگیا۔ یہ ساری شاپنگ سارہ نے خود کی تھی۔ کسی نوکر چاکر پر بھروسا نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ میری محبوبہ کوئی پھینک دینے والی چیز نہیں ہے۔"

عروسہ بولی۔ "اور پھینکنے کو کون کہتا ہے آپ سے؟" عروسہ کی بات اَن سنی کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "بھئی بند ڈبوں کا لنچ بھی کیا چیز ہے، یعنی ڈبا کاٹا، ساس پین میں الٹا اور لنچ تیار ہوگیا۔ یہ نہیں کہ آلو کاٹے جارہے ہیں، پیاز چھیلی جارہی ہے، میدہ گوندھا جارہا ہے، کڑاہی میں تیل ڈالا جارہا ہے، لہسن پیاز کی بو سے قے آرہی ہے اور جب کہیں دو پہر ڈھلے پوریاں، آلو کا سالن اور پودینے کی چٹنی تیار ہوتی ہے تو کھانے والوں کی بھوک مر چکی ہوتی ہے۔"

عروسہ بولی۔ "آپ پاکستان کے مرد سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی عورتیں بس میمیں بن گئی ہیں۔ لیکن آج آپ دیکھیں گے کہ ہم تعلیم یافتہ خواتین بھی باورچی خانے کی قدیم روایات نہیں بھولیں۔ آج آپ کو وہ لنچ کھلانا ہے کہ آپ انگلیاں نہ کاٹ کھائیں تو میرا نام عروسہ نہیں۔" انگڑائی لے کر عروسہ نے میری طرف اس طرح دیکھا کہ میرا جی چاہا کہ سر سے لے کر پاؤں تک اسے اپنی آنکھوں سے نگل جاؤں۔ ایک دل کش ادا سے وہ بولی۔

"آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھتے ہو؟"

ذرا جھینپ کر میں نے کہا۔ "کچھ نہیں بس سوچ رہا تھا کہ لنچ کو کیا ترتیب دی جائے۔" "میرے خیال میں، میں سب سے پہلے سوپ پھر فرائیڈ فش پہلے لوں گی۔" اور پھر ایک بار پھر کن انکھیوں سے اس نے مجھے یوں دیکھا کہ میں نے اپنے دل میں کہا۔ "میری جان تجھے تو میں اپنی ران کی فش فرائی کر کے کھلا دوں۔" اچانک سارہ بولی۔ "وہ ٹن کٹر کہاں گیا؟"

"ٹن کٹر؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ بولی۔ "وہ کہاں گیا؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو بتانا مشکل ہے کہ ٹن کٹر کہاں جاتے ہیں اور کیا کرنے جاتے ہیں۔" سارہ کہتی گئی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اسے بیگ میں ڈالا تھا۔" میرا دل معدے کے اندھے غار میں غرق ہوگیا۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیری ہونے لگی۔ اور بند ڈبے بے راستہ چکروں میں گھومنے لگے۔

"بکواس بند کرو" میں نے کہا اور پھر سارا کی طرف منہ پھیرتے ہوئے کہتا چلا گیا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ بند ڈبوں کے لنچ کا تھرڈ کلاس آئیڈیا کس مغفل کے دشمن نے تیرے دماغ میں بھرا تھا؟ کیا کوئی آلو پوریوں کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا؟ کیا ایک آدھ نوکر ساتھ

نہیں لایا جا سکتا تھا؟ سارا دن بیس بیس نوکر بیکار گھر میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔" سارہ بولی۔ "خود تو آپ نے کہا تھا کہ نوکروں کے سامنے پکنک میں وہ کیا کہتے ہیں بے تکلفی نہیں رہتی۔ ہاں!" میں نے کہا۔ "تھوپ دے سارا قصور میرے سر! یہ بھی میں نے کہا تھا کہ اس سالے ٹن کٹر کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا ماتھا مار کر ڈبے توڑ لیں گے۔" فاریہ نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے فلسفیوں کی سی لاپروائی سے کہا۔

"چلو لنچ نہ سہی، چائے ہی سہی۔" اور وہ مسکرائے تھرماس میں سے چائے پیالیوں میں بھرنے لگی۔ جو پیالہ فاریہ نے میرے ساتھ رکھا۔ وہ میں نے گھما کر دور پھینک دیا اور چیخ کر کہا۔ "مجھے نہیں چاہیے چائے، بھوک سے میری جان نکل رہی ہے۔ خالی پیٹ پی ہوئی چائے میرے کلیجے کو لگے گی۔" عروسہ بولی۔

"خالی پیٹ کیوں پیتے ہیں ساتھ میں ٹوماٹو ساس کھائیے۔"

میں نے کہا۔ "بکواس بند کر" اور اٹھ کر چائے کے تھرماس کو ٹھوکر مارتے ہوئے میں نے کہا۔ "اٹھاؤ یہ سارا کباڑ، باز آئے ایسی محبت سے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ واپسی پر بھی میں یہ سارا سامان اٹھائے حکم کا غلام بنا تمہارے پیچھے پیچھے چلتا جاؤں گا تو یہ تمہارا وہم ہے۔ یہ سب کچھ تم خود اٹھاؤ، نہیں تو میں ابھی یہ سارا کباڑ خانہ جھیل میں پھینکتا ہوں۔" سارہ بولی۔ "ہاں ......ہاں پھینک دو جھیل میں۔ ان چیزوں پر میرے باپ کے گاڑھے پسینہ کی کمائی جو خرچ ہوئی ہے۔ کون سے تمہارے ڈیڈی کے پیسے لگے ہیں۔" بہت لال پیلا ہو کر میں نے کہا۔ "تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ میرے ڈیڈی کی کمائی گاڑھے پسینے کی نہیں۔" وہ بولی۔ "زمیندار کو جو پسینا آتا ہے وہ کتنا گاڑھا ہوتا ہے۔" یہ میں دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا جواب دینا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ بس یہی جواب دیا کہ وہ "ڈبے، وہ اسٹوو، وہ ساس پین، وہ چٹائیاں، وہ پیالیاں سب اٹھا کر جھیل میں پھینک دیں۔" واپسی کا پیدل دو کلومیٹر راستہ غصے غصے میں کٹ گیا۔ عروسہ کسی ہوئی گلابی جینز میں مٹکاتی رہی اور میں نے سوچا۔

"یہ لڑکی کتنی موٹی اور بھدّی ہے اسے ضرور ڈائٹنگ کرنی چاہیے۔" فاریہ بات بے بات مسکراتی رہی۔ مانا کہ اس کی یہ مسکراہٹ اتنی بری نہیں تھی، لیکن یہ لڑکی حماقت کی حد تک اس مسکراہٹ میں پیاری لگ رہی تھی۔ سارہ کی طرف میں نے بالکل توجہ نہ دی۔ بڑی اپنے آپ کو میری محبوبہ سمجھتی تھی۔ بھوک کا طوفان میرے اندر اُٹھ رہا تھا۔ تاہم کار میں ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھنے کے بعد جب کلومیٹر اُڑنے لگے تو میں نے ایک کڑی کوشش سے اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ ہم سب کیفے سنگیت چلیں، آج میں تمہیں ایک یادگار لنچ کھلاؤں گا۔" سارہ نے پھولے ہوئے منہ سے کہا۔

"ہمیں بھوک نہیں۔ آپ براہ مہربانی ہم تینوں کو میری کوٹھی پر اُتار دیجیے۔"

میرے دل نے کہا۔ "یہ لڑکی منہ پھلا کر بالکل بھیڑ جیسی لگتی ہے۔ آخر میں نے اس میں کیا دیکھا کہ اسے کار میں بٹھا کر ڈرائیو کر رہا ہوں۔"

ان تینوں کو سارہ کی کوٹھی پر پہنچ کر اور سارہ سے طنز آمیز تھینکس وصول کر کے میں کیفے سنگیت پہنچا۔ بیرے نے مینو سامنے لا کر رکھا تو میں نے بغیر کچھ سمجھے سنے حاشیے میں ایک لمبی لکیر کھینچ دی۔ جب میز پلیٹوں سے بھر گیا اور بیرے نے منہ پھیرا تو میں نے یہ نہیں سوچا کہ پہلے کون سی پلیٹ صاف کروں، بلکہ بیک وقت سبھی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ جیسے بھوکا باز مرغابیوں اور ابابیلوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ پھر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے چھلے کیفے سنگیت کے ایئر کنڈیشنڈ ڈائنگ ہال میں پھینکتے ہوئے میں نے سوچا کہ سارہ کے ساتھ بگاڑنے میں کوئی عقل مندی نہیں، کیوں کہ سوال سارہ کا نہیں فاریہ اور عروسہ کا بھی ہے۔ اس تصور نے میرا رواں رواں جھنجھنا دیا اور میں نے کہا کہ میں ابھی جا کر سارہ کو منا لوں گا۔ لڑکیوں کو منانے کا کیا ہے دو میٹھے بول۔ سوری ڈارلنگ!" اور لڑکی یوں ہی پگھل جاتی ہے۔

کار کی چابی اپنی انگلی میں گھماتا ہوا ایک مستی سی میں ہوٹل سے باہر نکلا تو میں سوچ رہا تھا کہ عشق کرنے

کے لیے لنچ کتنا ضروری ہے۔ کیفے سنگیت کے باہر مجھے ایک بھکاری مل گیا۔ میں نے سوچا۔

"ایسے شخص کو روٹی کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے کون سا عشق کرنا ہے۔ عشق آدمی کرتے ہیں۔ ہڈیوں کے پنجر نہیں کر سکتے۔ ان بخار جلی آنکھوں اور پپڑی جمے ہونٹوں سے عشق کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور اگر عشق کرنے کا سوال نہیں اٹھتا تو روٹی کا سوال بالکل نہیں اٹھتا اور میرا دل ایسے سب لوگوں کے لیے حسد سے بھر گیا، جنہیں نہ عشق کی مجبوری تھی اور نہ روٹی کی لاچاری تھی۔" پھر اس بھکاری کا خیال مجھے بالکل بھول گیا اور میرے شعور کے اسٹیج پر گولائیاں، مسکراہٹیں اور سنہری بالوں کے لچھے ابھر آئے۔ عروسہ، فاریہ، سارہ اور میں سوچ نہ سکا کہ پہلے کس کو کھاؤں، میں ایک ہی بار تینوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا، جیسے بھوکا باز ابابیلوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

واپس آتے ہی میرے سامنے سارہ تھی۔ اور میں نے باز بن کر اُس ابابیل کو شکار کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہماری واپسی پر میں سارہ سے شادی کا وعدہ کر کے ملک سے باہر چلا گیا۔

پورے سات برس ملک سے باہر رہا۔ امریکہ میں، میں نے باز بن کر بہت رنگین وقت گزارا اور پھر جب میں واپس وطن آیا تو پھر سے اپنے مشغلوں میں ڈوب گیا۔ آج جب چھانگا مانگا اپنے ساتھ ایک ابابیل لیے رواں دواں تھا تو راستے میں ایک کار پنکچر والے کے پاس از راہِ ہمدردی کو رک گیا کیونکہ اُس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت ابابیل کھڑی تھی اور اُسے دیکھ کر بے اختیار مجھے سارہ یاد آئی تھی۔

پوچھنے پر پتا چلا وہ سارہ کی بہن عمارہ ہے اور سارہ......

سارہ کو خودکشی کیے سات برس ہو چکے تھے۔

اب میرا سفر چھانگا مانگا کے بجائے گھر کی جانب تھا۔ ابابیل کو میں نے راستے ہی میں پیسے دے کر اُڑا دیا تھا۔

☆☆......☆☆☆

مکھنی



ارشد علی ارشد

لہو ٹپکی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز، ناقابل فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم، اسرار بھری عجوبہ داستان

قسط نمبر 11

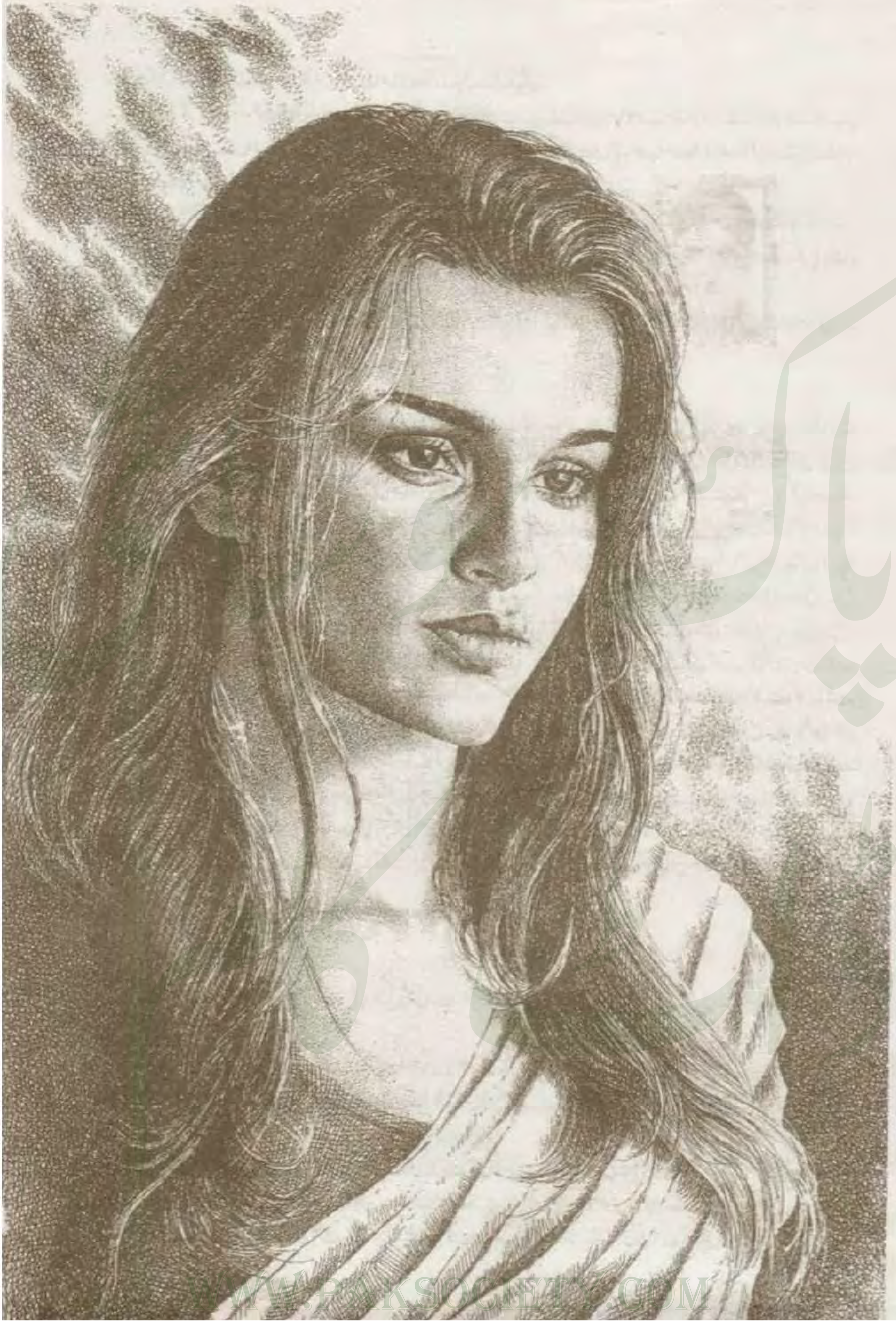
گزشتہ قسط کا خلاصہ

ایک روز نورالدین زنگی کو خواب میں رسول ﷺ کی زیارت ہوئی۔ جواب میں رسول ﷺ نے سلطان کو یہودیوں کی کھودی جانے والی سرنگ کے بارے میں بتایا۔ تین دن مستقل دکھائی دینے والے خواب نے سلطان کو پریشان کر دیا۔ وہ مدینہ منورہ جا پہنچے۔ آنحضرت ﷺ نے سلطان کو یہودیوں کی شکلیں ذہن نشین کرا دیں۔ سلطان نورالدین زنگی مدینہ والوں کی دعوت کا اہتمام کرتا ہے، مگر دعوت میں شیطان صفت یہودی نہیں آتے۔ سلطان کو معلوم ہوتا ہے تو وہ خود ان کے حجرے میں پہنچتا ہے اور انہیں پہچان کر روضۂ اطہر ﷺ تک پہنچنے کی ناپاک سازش کرنے والے یہودیوں کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

مکھنی کا ذہن ایک اور کروٹ لیتا ہے تو وہ خود کو ایسی جگہ پاتی ہے جہاں سلور کی چار بڑی کڑاہیاں انگاروں سے بھری پڑی تھیں۔ تمیں کے قریب موجود لوگ انگاروں سے پندرہ بیس میٹر دور کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مکھنی انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے اور ان کی پریشانی کا سبب پوچھتی ہے۔ ایک بوڑھا شخص بتاتا ہے کہ ان کا تعلق چترال کے خوب صورت اور مذہبی گاؤں جلال آباد سے ہے۔ جلال آباد کے تمام لوگوں کا ذریعۂ معاش ان کے چھوٹے بڑے پھلوں کے باغات ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے پیداوار میں کمی ہو گئی ہے اور اس سال تو ان پر ایسا عذاب اترا کہ صرف ایک حصہ ملا، باقی تین حصے زہریلے کیڑوں کی نذر ہو گئے۔ پوری بستی میں ایک ہی خستہ حال مسجد ہے، جس میں بہ مشکل چار پانچ آدمی نماز پڑھتے ہیں۔ بستی کے اکثر لوگ بے نمازی ہیں، بلکہ بہت سوں کو تو نماز پڑھنا بھی نہیں آتی۔ ان کی بات سن کر مکھنی غصے میں آ جاتی ہے، وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتی ہے اور انگاروں کی کڑاہی میں اتر جاتی ہے اور انگاروں کو کوٹ کر سرمہ بنا دیتی ہے۔ تینوں کڑاہیوں کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور لوگ خوشی سے بھنگڑے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب وہ انہیں جمع کرتی ہے اور ایمان مفصل یاد کرنے کی تلقین کرتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ لوگ اپنا مقصد حیات پہچانو، جب تم لوگ اپنا مقصد حیات پہچان لو گے تو پھر تمہیں کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔

ذہن کی اگلی جست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی، اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر روک لیے، گھر والے ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوڑتے بلاول نے مکھنی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مکھنی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔'' مکھنی کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے سوچا، مکھنی تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہوں۔ مکھنی حیران تھی کہ امی ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ تھک نہیں رہے۔ گاڑیوں، رکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

''میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟'' یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نیزہ اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھب گیا۔ اس کی آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے



سے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ لڑکھڑائی، اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔
جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈ روم میں پاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے نہ جانے یہ کون سی دنیا کا خوب صورت کمرا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔
''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' مکھنی خود سے سوال کرتی ہے، پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مکھنی کے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلتے جاتے ہیں۔
(اور اب آگے پڑھیے)

وہ جس طرح آئے، اسی طرح باہر نکل گئے۔
''یہ سب کیا تھا، میں کہاں پہنچ گئی ہوں؟'' سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ''میں کون ہوں؟'' سوالوں کی بوچھاڑ اور سوچ کے گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔

☆......☆

شہر ذات کی پہچان ایک مشکل ترین کام ہے۔ اس شہر کے بے شمار دروازے ہیں، مگر ایک بھی نہیں۔ یہاں داخلے کے لیے جس طرف دل چاہے چلے جاؤ، واپسی کے لیے سارے راستے سارے دروازے بند ملتے ہیں، ایسی صورت میں دل پر ایک انوکھا عذاب اُترتا ہے۔ اس عذاب میں ساری خوشبوئیں، مسکراہٹیں، گلاب رُتوں کے سارے موسم، جاگتی اور بند آنکھوں کے خواب ناتمام! سب دل کی دہلیز پر آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ حیرت اور آگہی کا کوئی ایک لمحہ شہر ذات میں اُترتا ہے تو ایک طوفان مچا دیتا ہے۔ ذلت کے شہر کی ساری فصیلیں تنگ جاتی ہیں اور اپنی جستجو کی طلب بڑھ جاتی ہے، مگر اس طلب میں اپنے آپ کو گم کر دینے کے سوا کوئی دوسرا کنارہ ہاتھ نہیں آتا۔ جب اپنا آپ گم ہو جائے تو پھر سوال در سوال اور سوچ در سوچ دماغ کی پکی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے اسے لہولہان کر دیتے ہیں۔ کبھی جواب پا لیتے ہیں اور کبھی یوں ہی پہنچتے پہنچتے جام زہر پی لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، میں کون ہوں...... کتنا انوکھا مگر بامعنی سوال ہے۔ اس کا جواب پانے کے لیے محبوب کی گلیوں کی نہیں، بلکہ جہانوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ ہمہ گیر جدوجہد کے ساتھ جسم و جاں سے ماورا ہو کر کھوجنا اور سوچنا پڑتا ہے، گویا ذات کے شہر کو پانے کے لیے دانتوں پسینہ آ جاتا ہے، چہ کہ تکمیل ذات کا دعویٰ کیا جائے۔ ورنہ ذات وہ چیز ہے جس کے ساتھ اسماء صفات کو منتھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح ذات اور صفات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ جب ذات اور صفات کا فرق مٹ جائے تو اندر طوفان مچل جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو، کیوں کہ بات وجود محض اور وجود مطلق پر چلی جاتی ہے۔ تکمیل ذات کی صرف کوشش ہو سکتی ہے، دعویٰ ہرگز نہیں۔ ہاں شہر ذات کی آگہی ممکن ہے...... خوب صورت سجے ہوئے کمرے میں شہر ذات کے بارے میں سوچنا میرے لیے کسی اذیت سے کم نہیں۔ ذات کی صنف تک پہنچتے پہنچتے میرے پاؤں لہولہان اور جسم زخموں سے چُور چُور ہو گیا۔

میں دنیا کی کون سی مخلوق میں شمار ہوتی ہوں؟

☆......☆

ٹھک، ٹھک، ٹھک۔ ذہن میں ایک ذیلی کھڑکی کھلتی ہے۔ ایک نامانوس، انجان اور ناآشنا مخلوق کھڑکی سے جھانک کر مجھ سے فن گویائی کو چھین کر کہتی ہے۔
''تیری سوچ کس قدر بلند اڑان بھرتی ہے کہ وہ انتہائی وسعتوں میں پہنچ جاتی ہے، جہاں بلندیوں پر یہ رُکتی ہے، وہیں سے شہر ذات کی پہچان کا آغاز ہوتا ہے، مگر افسوس صد افسوس کے آغاز میں ہی تیرے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور تُو دھڑام سے پستی میں آ گرتی ہے۔''
''پہیلیاں نہ بجھا...... میرا دماغ اور سوچ پہلے ہی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مجھے میری پہچان کروا، تاکہ میں اس خوب صورت کمرے اور کمرے میں آئے ہوئے صاف ستھرے، خوب صورت چہروں کی پہچان کر سکوں۔ ان کے عمل کو جان سکوں۔ وہ سوٹ بوٹ میں ملبوس چمکدار لوگ کتنی زبان رکھتے تھے، مگر خاموش رہے، کچھ کہا نہ سنا۔ میں ان کی اس ناقابلِ فہم حرکتوں کو حتمی جامہ

کیسے پہناؤں؟"

"تو کیا چاہتی ہے؟شہر ذات کی آگہی، یا صنفی پہچان؟"

صنفی پہچان کے عقب میں شہر ذات کی آگہی چھپی رہتی ہے جب میں صنفی پہچان ہی نہیں رکھتی تو پھر شہر ذات میں کیسے جھانکوں؟ زمین میں چند لمحے پُراسرار خاموشی رہی۔ کھڑکی کے پٹ ہلے، پھر آواز گونجی۔

"تیرا شخصی وجود چار ارتقائی مراحل کے بعد پروان چڑھا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس ارتقائی عمل نے 98 لاکھ سال کا عرصہ لیا ہے۔"

"98 لاکھ سال......" حیرت سے میری زبان گنگ ہوگئی۔ اس لیے یہ الفاظ میں نے فقط دل کی گہرائیوں میں ادا کیے، مگر دماغ کی کھڑکی سے دل کے تاروں سے روابط تھے، اس لیے کھڑکی والے نے میرے الفاظ سن لیے اور بولا۔

"ہاں 98 سال۔" چند لمحے کے لیے پھر سے پراسرار خاموشی چھا گئی۔ سکوت کی یہ چند ساعتیں میرے دل پر گراں گزرنے لگیں۔ میں نے نرم بستر پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس وقت دماغ سے آواز آئی۔

ایک الہامی کتاب (قرآن مجید) میں بتایا گیا ہے۔

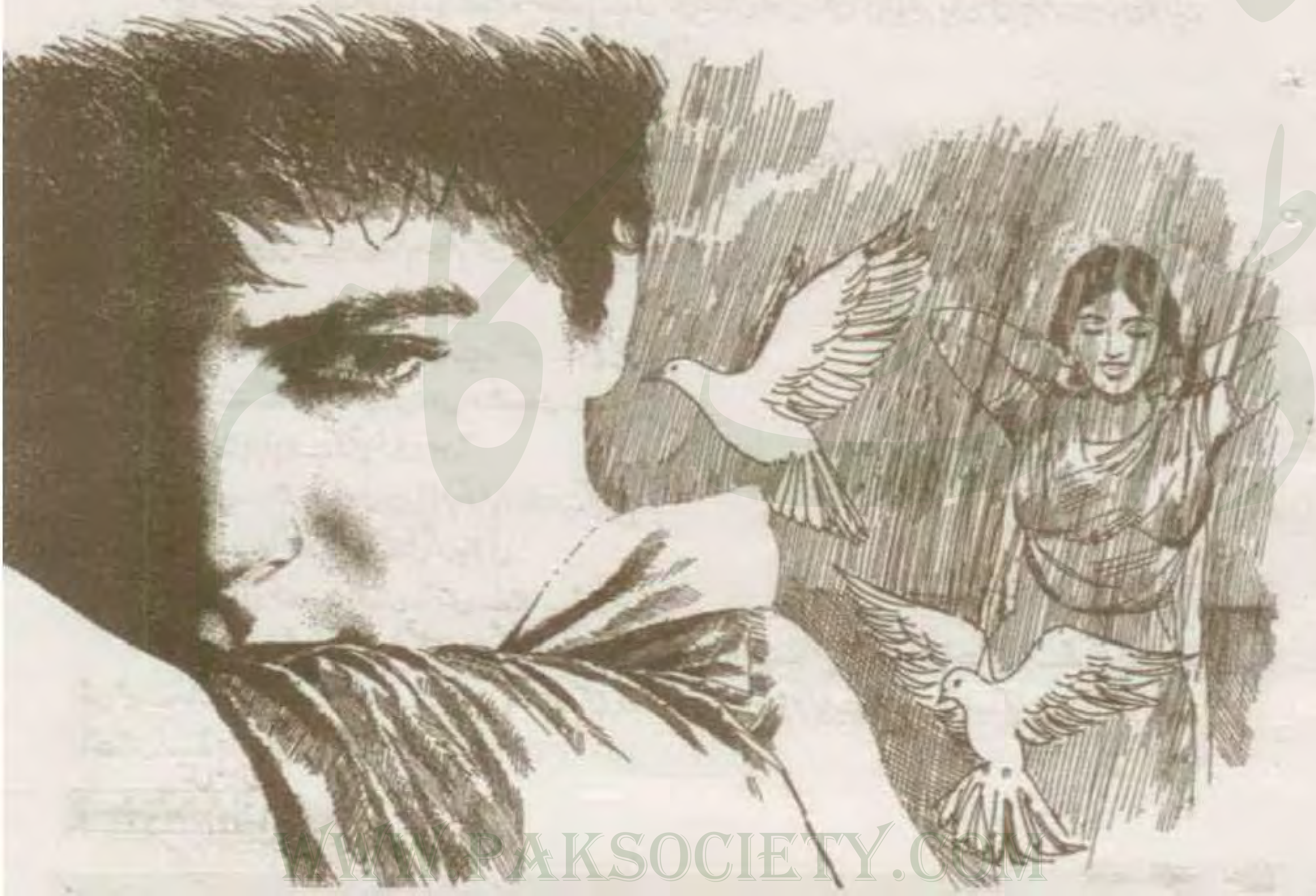
کیا انسان نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو ٹپکایا جاتا ہے، پھر وہ لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کردے۔

☆......☆

میں خوشی سے جھوم اٹھی۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی، مگر وہ 98 لاکھ سال والی بات سمجھ میں نہیں سمائی، جس کا میں نے فوراً اظہار کردیا۔ جواب ملا۔

اس دور میں یہ سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ جدید سائنس نے اس ارتقائی عمل کو ادوار میں تقسیم کردیا ہے۔

"آؤ...... جس آسمانی کتاب (قرآن مجید) کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں، اس کے چار ارتقائی عمل بتاؤں؟"



''ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں......'' میں نے عجلت میں کہا۔

وہ بشر ہے...... یہ پہلا عمل ہے، دوسرا اس کے بعد آتا ہے۔ ماخلقت الجن والانس...... الخ۔ اس حمل میں وہ انس بنتا ہے، تیسرے عمل میں وہ انسان بنا۔ ولقد خلقنا الانسان...... من طین الخ۔ اب چوتھا مرحلہ بتاؤں۔

''جی...... جی، ضرور بتائیں......''

''وعلم آدم الاسماء کلھا۔ یعنی آدم ہے، کون؟ جانتی ہو۔''

''جان گئی ہوں، میں آدم ہوں۔'' میری بات پر کھڑکی سے جھانکنے والی مخلوق زور زور سے ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا۔ اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔''

''تو آدم نہیں رے پگلی...... بلکہ آدم کی اولاد میں سے ہے، جسے اوپر والے نے اعلیٰ وارفع پیدا کیا ہے۔''

''تو کیا میں اعلیٰ وارفع صنف میں سے ہوں۔''

''ہاں! تجھے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے، کیوں کہ تیرا دنیا میں ایک نصب العین ہے، تو خدا کا نائب ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، میں شعورِ آگہی سے تکمیل ذات تک پہنچ سکتی ہوں۔''

''صنف جان گئی ہو تو شعورِ ذات کی آگہی بھی پا ہی لوگی، مگر تکمیل ذات......'' خاموشی پراسرار اور گہری۔

''خاموش کیوں ہو...... آگے بولو نا۔''

''تکمیل ذات یعنی انسانِ کامل۔''

''ہاں! انسانِ کامل بھی کہہ سکتے ہو۔''

''اگر انسانِ کامل کی بات ہو تو، یہ جہاں ہو کہ وہ جہاں، صرف ایک ہی انسانِ کامل ہے۔ (حضرت محمد ﷺ)''

''کون۔'' میری بے چینی بڑھ گئی تھی، مگر ذہن میں گونجنے والی آواز ہی خاموش ہوگئی۔ میں ہمہ تن گوش، ہوں...... ٹھک...... ٹھک...... میں نے خود ہی دماغ کی کھڑکی پر دستک دی۔ آواز آئی۔

''اس بارے میں خود ہی سوچنا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ایک سوال بار بار دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے کہ ''میں انسان ہوں، مان بھی لیا اور جان بھی لیا، مگر ہر انسان کا ایک خاندان، قوم اور مذہب ہوتا ہے، میرا خاندان، قوم اور مذہب کیا ہے؟''

''مجھے نہیں پتا......'' روکھا سا جواب میری سماعت میں تھپڑ مارنے لگا۔

''مجھے پتا تو چلے میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے والے یہ لوگ کون ہیں، کیا میں انہی میں سے ہوں؟''

''یہ سوال بھی انہی سے پوچھنا۔'' جواب ملتے ہی کھٹک سے کھڑکی بند ہوگئی اور میں مکمل اندھیرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر میں یونہی بے سدھ نرم و ملائم کمبل میں نیم دراز رہی۔ اس کے بعد دماغ کی ایک اور کھڑکی پر میں نے خود دستک دی۔

''ٹھک...... ٹھک...... کون ہے۔'' اندر سے پوچھا گیا۔

''یہی جاننے کے لیے کہ میں کون ہوں، دستک دی ہے۔''

''یہ تمہیں بتایا جا چکا ہے کہ تم انسان ہو۔''

''نہیں نہیں...... میں فوراً بولی، میرا نام، قوم اور مذہب کیا ہے۔''

''اتنا تیز مت بھاگو ورنہ منہ کے بل گر جاؤ گی۔''

''گر کر اٹھنے کی سکت ہے مجھ میں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تھوڑا صبر کرلو۔ جن لوگوں نے تمہیں زندگی کی سہولتیں دے رکھی ہیں، تیرے احترام میں باآثم بات نہیں کرتے، تیری عزت میں تیرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، وہ خود تمہیں بتائیں گے۔ تیرا نام کیا ہے، قوم اور مذہب کیا ہے، جو احترام میں بات نہیں کرتے، وہ بھلا کیسے بتا پائیں گے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے تمہیں؟''

''اپنی صنف سے آگہی مل چکی ہے مجھے، اعلیٰ وارفع مخلوق ہوں میں۔ اس لیے اب مجھے زیب نہیں دیتا کہ اندھیرے میں رہوں۔''

''اب شہر ذات کا بھید پانا ضروری ہوگیا ہے۔ میں پہلے ہی اس تگ و دو میں بہت دور سے بھاگ کر آئی ہوں، اب تھک گئی ہوں۔''

''ایک بات پلّو سے باندھ لو، تھک جانے والے مسافر کبھی منزل تک نہیں پہنچتے۔ اس لیے مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ میں جانتی ہوں، مایوسی کفر ہے اور میں...... میرے لب خاموش ہوگئے۔ کفر کے لفظ پر اچانک میرے اندر تیز جھکڑ چلنے لگے تھے۔ تیز ہوائیں چلتی ہیں تو کھلی کھڑکیوں کے پٹ بری طرح آپس میں ٹکراتے ہیں، درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں اور گرد و غبار اُڑنے لگتا ہے، ایسا ہی کچھ میرے اندر بھی انتشار بپا ہوگیا۔'' اسی ٹھراٹھری میں آواز اُبھری۔

''یہ بتاؤ کفر کیا ہوتا ہے......؟'' سوال پر میں چپ ہوگئی، پھر ایک اور کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک آواز سنائی دی۔

''ایمان کا معنی ہے، قبول کرنا، مان لینا یا تسلیم کرنا۔ کفر ایمان کے مقابلے میں کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا۔ نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد کے لیے کسی کو ہمعصر بنانا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو رَد کرنا، قرآن مجید کو نبی کریم ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھنا اور آخرت کا انکار کرنا، سب کفر ہے۔''

☆......☆

اس پر میں بُری طرح چونک پڑی۔ وجہ اس کی پہلی بات تھی۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔ تو کیا ایسے بھی انسان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسری ذات کی عبادت کرتے ہیں، یا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں یا پھر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ میری حیرت اس قدر شدید تھی کہ میں ایک ہی سانس میں کئی سوال کر بیٹھی۔

ذہن میں ایک اور کھڑکی کھلی، کھڑکی سے جھانکنے والی مخلوق سابقہ مخلوق کی طرح ناآشنا اور اجنبی تھی۔ مجھ سے کہا گیا۔

''ہم تمہیں ماضی بعید میں لے چلتے ہیں...... چلوگی؟''

''ماضی بعید...... مطلب زمانہ قدیم؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! بالکل زمانہ قدیم، جہاں مُردہ انسانوں کی پوجا کی جاتی تھی۔''

''میں چلوں گی...... کیوں کہ یہ بات میرے لیے نئی ہے کہ مردہ انسانوں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔''

''ہم حیران ہیں تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم تو ایسی نہ تھیں، مردہ انسانوں کی پوجا تو آج کے جدید دور میں بھی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا...... ''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو۔''

''تم موضوع سے ہٹنے لگی ہو۔ پہلے زمانہ قدیم کی سنو، جہاں انسان کے آگے سر جھکانا اور اسے رازق سمجھنا عام بات تھی۔'' قدیم انسانوں کا ایک اور جاہلانہ عقیدہ روح کو ہر چیز پر قادر سمجھتا تھا۔ روح جب چاہے جسم میں واپس آسکتی ہے۔ اس خوف سے وہ مُردے کے ساتھ ضروریاتِ زندگی بھی قبروں میں رکھ دیتے تھے، یہی نہیں بلکہ کوئی سربراہِ خاندان یا سردار فوت ہو جائے تو اس کی مادّی ضروریات کے پیشِ نظر اس کی بیوی اور غلاموں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار کر ان کے ساتھ ہی دفن کیا جاتا تھا۔ مُردے مافوق الفطرت مخلوق سمجھے جانے لگے۔ زمانے ایک نے ہلکی سی جست لی اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر یہ احساس انہیں مُردوں سے زندوں کی طرف راغب کرے گا۔ زندہ انسانوں میں سب سے زیادہ طاقتور، بہادر، جنگجو اور سردار قسم کے لوگوں کو، فوق الفطرت قوتوں کا مالک سمجھا جانے لگا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بلکہ نوبت جادوگروں، اور کاہنوں کی پرستش جا پہنچی۔ یہ پرستش اور احترام اس حد تک ترقی کر چکا کہ ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا یا چلنا، ان کی طرف نظر بھر کے دیکھنا اور ان کی نشست پر بیٹھنا بے ادبی اور جرم کے زمرے میں آتا تھا۔

''رُک جاؤ، مجھے اعتراض ہے، تم بنا کسی ثبوت کے بات کو کہاں سے کہاں لے گئے ہو۔''

''تیرا ذہن بہت چھوٹا ہے، اس میں فرضی گھوڑے نہیں دوڑائے جا سکتے، جو کہا جا رہا ہے سچ اور حقیقت پر مبنی ہے، کبھی فرصت

ملے تو انسان کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لینا۔ ٹھوس اور پُراعتماد لہجے کا جواب مجھے چپ رہنے پر مجبور کر دے گا۔"

"اچھا آگے بولو۔" میں نے فوراً ہار مان لی۔

"انسان پرستی کا آغاز مصر سے ہوا۔ مردہ پرستی اور دیوتاؤں کو پوجتے پوجتے یہ زندہ انسان کی پرستش کی طرف جا نکلے۔ بادشاہ خود کو دیوتا سمجھنے لگتے اور رعایات انہیں دیوتا ماننے لگی۔ لوگوں کی جہالت اور بدعقیدگی کی یہ حالت تھی کہ بادشاہ کو خدا کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ خود کو خدا سمجھنے اور لوگوں سے اپنی پرستش کروانے میں مصر کا فراعنہ خاندان سب سے آگے تھا۔ اسی خاندان میں فرعون پیدا ہوا، جس نے خدائی دعویٰ کیا تھا۔ خود کو خدا سمجھنے کی ریت بابل کے بادشاہوں میں بھی بکثرت پائی جاتی تھی۔ انہی بادشاہوں میں نمرود بھی شامل تھا۔ کیا نمرود اور فرعون کے بعد انسانی پرستش کا باب بند ہو گیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"انتہائی احمقانہ سوال ہے" جواب میں کہا گیا..... "پوری بات سن لو گی تو سب کچھ جان لو گی۔"

"ٹھیک ہے بتاؤ۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"انسان پرستی میں یونان اور جاپان بھی بہت آگے ہیں، یونانیوں کا عقیدہ تو اس سطح پر پہنچ گیا تھا کہ وہ بادشاہ کی موت کے بعد اسے باقاعدہ دیوتا کا مقام دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ فانی نہیں، بلکہ لافانی ہوتے ہیں اور یہ موت کے بعد بھی جب چاہیں، دنیا میں واپس آ سکتے ہیں۔ نہ معلوم یونانیوں کی انسان پرستی کہاں تک پہنچ جاتی کہ ان پر یونانی فلسفے نے ٹھیک ٹھیک ضربیں لگانا شروع کر دیں اور انسانوں کو دیوتا کے مقام سے کھینچ لیا۔ بہت سے مشہور فلسفیوں نے انسان پرستی کے عقیدے میں کارآمد دراڑیں پیدا کیں۔"

"فلسفی....." میں نے زیرِ لب اس لفظ کو دہرایا..... "یونانیوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔"

"ہاں..... ارسطو، افلاطون، سقراط اور فیثا غورث نے اپنے فلسفے میں انسان پرستی کے عقیدے کو رد کر دیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم یونان کے بعد اس عقیدے کا خاتمہ ہو گیا تھا۔" میری اس بات پر ذہن کی چاروں کھڑکیاں کھل گئیں اور ان سے زور سے ہنسنے کی آوازیں باہر آنے لگیں۔ مجھے ایک بار پھر سبکی کا سامنا کرنا پڑا۔

"تم پھر بچوں جیسی باتیں کرنے لگی ہو..... ارے یہ عقیدہ تو آج تک قائم ہے۔"

"آج تک....." اس بار مجھے اپنی زبان پر جلتے ہوئے کوئلے دہکتے محسوس ہوئے۔

"آگے سننا چاہو گی یا ہم جائیں۔ ویسے بھی اب تمہیں آرام چاہیے ہو گا۔"

"نہیں بولو۔ میں سننا چاہتی ہوں۔" میں نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

"یونانیوں سے یہ عقیدہ رومیوں کی طرف منتقل ہوا۔ روم میں سکندرِ اعظم کے باپ فلپ مقدونی کی پرستش اس کی زندگی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ جس نے بادشاہ کی پوجا سے انکار کیا، وہیں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہاں سے بادشاہوں کے مجسمے بنانے کا باقاعدہ رواج پروان چڑھا۔"

"اوہ....." میرے اندر کچھ باتیں، کچھ یادیں اُتار چڑھاؤ کا شکار ہونے لگیں، موجودہ زمانے میں بھی انسانوں کی مجسمہ سازی بھی زور شور سے جاری ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر خاموش رہی، باتیں بڑی قیمتی تھیں جو مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ جاپانیوں نے انسان پرستی میں حد کر دی ہے، جاپانی بادشاہ جیمو ٹینو سے شروع ہونے والی پوجا اس نہج پر جا پہنچی کہ بادشاہ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا گیا۔ یہ بات آج سے ڈھائی ہزار سال قبل شروع ہوئی تھی اور آج تک اسی عقیدے کے ساتھ قائم و دائم ہے، بدھ مت کے پجاری بھی عجیب لوگ ہیں۔

ممکن ہے آج ایسا نہ ہو، کیوں کہ آج کا دور سائنسی ہے۔ یہ ایجادات و اختراعات کا دور ہے۔ اب دنیا بہت آگے نکل چکی ہے، اس لیے آگہی کے اس دور میں انسان کو انسان نہیں پوج سکتا۔ انسانی پرستی گئے وقتوں کی بات لگتی ہے۔ میری اس بات پر ایک بلند قہقہہ گونجا۔

"ہاہاہا....."

"لگتا ہے تم آج کے انسانوں سے ابھی تک ملی نہیں ہو۔"

"میں انسان ہوں اور انسانوں سے ملی بھی ہوں۔"

"تو پھر ہندوؤں سے نہیں ملی ہو گی، ہندوؤں کے ہاں بھگوان کے جو بھی اوتار ہوئے ہیں، وہ سب انسانی روپ میں ہوئے ہیں۔

وشنو، نرسنگھ کرشن اور رام وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ یہ سب انسان ہی تو تھے۔ ان کی مورتیوں کی آج بھی پرستش کی جاتی ہے، کروڑوں انسان انہیں اپنا خدا، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ یہ ایسی مدلل اور نا قابل تردید حقیقت تھی کہ میری زبان کو چپ لگ گئی۔"

☆......☆

ٹھک......ٹھک...... چوتھی کھڑکی پر دستک ہونے لگی، مجھے تو ایسی چپ لگی کہ بولنے کی ہمت نہ ہوئی، چند ساعتیں بالکل خاموش اور ساکت گزر گئیں...... پھر آواز آئی۔

"افسوس صد افسوس...... دنیا کے سب سے کھرے اور سچے مذہب اسلام میں بھی یہ رجحان بڑی شدومد کے ساتھ پروان چڑھ چکا ہے۔"

"اسلام تو اپنی بنیاد توحید پر کھڑا ہے۔"

"ہاں! مگر ایک انتہائی خطرناک بات مسلمانوں میں داخل ہو چکی ہے۔ برصغیر میں بہت سی رسم و رواج ہندوؤں سے مسلمانوں میں راسخ ہو چکی ہیں۔ برصغیر میں عجیب و غریب رسمیں بنائی گئی تھی۔ یہ فرسودہ رسمیں دھیرے دھیرے باقاعدہ مذہب کا حصہ بن چکی ہیں۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور ملنگوں کی پرستش کا رجحان اس قدر بڑھا کہ یہ آہستہ آہستہ مسلمانوں میں منتقل ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بھنگیوں، ملنگوں، ننگوں، چرسیوں، موالیوں کو بھی مشکل کشا سمجھا جانے لگا۔"

"اوہ......" میں بُری طرح چونک پڑی۔ "تو کیا میں کوئی فقیر یا ملنگ ہوں، کچھ دیر پہلے بہت سے لوگ میرے سامنے تعظیم سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور میرے پاؤں بھی چھوئے تھے۔" میری اس بات پر ذہن میں قہقہہ پھر سے بلند ہوا، "تجھے تو ابھی شعور ذات کی ہی آگہی نہیں ملی، چہ جائے کہ تو اس مقام پر پہنچے۔"

"تو پھر وہ سب کیا تھا اور کیوں کیا گیا......؟" مجھے کوئی جواب نہیں ملا، کیوں کہ کمرے کا دروازہ کھلنے سے میرا ارتکاز ٹوٹ چکا تھا۔

اس بار بھی کمرے میں داخل ہونے والا لمبے قد کا خوب صورت نوجوان تھا۔ میں مزید لوگوں کی توقع کر رہی تھی، مگر وہ اکیلا ہی تھا۔ اس بار اس نے بادامی رنگ کا کلف لگا کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا، باقی تراش خراش سج دھج حسب سابق تھی۔ وہ آہستگی سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے انداز میں احترام کی جھلک بالکل واضح تھی۔ وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، شاید وہ بیٹھنا چاہتا تھا، مگر کوئی چیز مانع آرہی تھی۔

"بیٹھ جائیے۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بیٹھ گیا، ہماری نظریں ملیں تو اس نے فوراً نگاہیں جھکا لیں، مجھے اس کی خاموشی گراں گزر رہی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میرے سوال پر اس نے بُری طرح چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے چونکنے پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ یہ کوئی ایسا اچنبھا سوال تو نہیں تھا، جس پر اس قدر حیران ہوتا، میں نے پوچھا۔

"آپ اس قدر حیران کیوں ہیں؟"

"میں حیران اس لیے ہوں کہ آج پورے تیرہ مہینے اور دس دنوں بعد آپ نے مکمل ہوش و حواس میں بات کی ہے۔" اس نے کہا۔

"تیرہ مہینے دس دن......" ذہن کی کھڑکی پر دستک ہوئی، مگر کھڑکی کھلی نہیں، کیوں کہ ایک اور اہم بات میرے علم میں آئی۔

"مہک......" میں نے پوچھا...... "یہ مہک کون ہے؟"

"مہک آپ کا نام ہے۔"

"اوہ...... تو مجھے میرا نام پتا چل ہی گیا۔" میرے دل میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ اگر اندر ظلوق ہوتی تو بہت سارے خوشی کے گانے گائے جاتے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میرا نام امن چند دوتانی ہے۔" اس نے برجستہ مجھے جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میں انسانوں میں رہ رہی ہوں۔" میری بات پر امن ایک بار پھر چونک پڑا۔ اس بار میں نے اس کے چونکنے کا سبب پوچھا تو وہ بولا۔ "آپ کی اس بات پر میرے بابا کی بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

''آپ کو بھجنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو سمجھانے والی ہیں نہ کہ بھجنے والی۔''
''یہ بات بھی میں سمجھ نہ پائی۔'' مگر میرے کسی دوسرے سوال سے پیش تر وہ بولا۔
''میرے یہاں بیٹھنے یا آپ سے باتیں کرنے میں، آپ کو کوئی پریشانی یا تکلیف تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔''
''مجھے پریشانی نہیں بلکہ خوشی ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔
''میرے ذہن میں بہت سے سوالات اُٹھتے ہیں، جن کا مجھے جواب چاہیے۔''
''یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے کہ جواب دینے والی اچانک سوال پوچھنے لگی ہے۔''
''اس لیے کہ میرے اندر سوچوں کا بے تحاشہ بوجھ ہے، اب آپ نے ایک اور بوجھ بڑھا دیا ہے۔'' میری اُلجھن واقعی بڑھ گئی تھی، یہ تیرہ مہینے دس دنوں کا کیا چکر ہے۔
''اگر آپ کو میری وجہ سے کوئی اُلجھن ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔'' وہ کرسی سے اُٹھنے لگا تو میں نے فوراً اسے منع کیا۔
''نہیں...... نہیں...... آپ مت جائیں۔'' آپ کی ذات سے مجھے کوئی اُلجھن نہیں۔ میں نے کمبل اُٹھا کر بیڈ سے اُترنے کی کوشش کی تاکہ اسے جانے سے روکوں، مگر وہ مجھ سے زیادہ عجلت میں بولا۔
''اچھا، اچھا ٹھیک ہے میں نہیں جاتا۔ آپ پلیز نیچے مت اُتریں۔ آپ آرام سے بیٹھی رہیے۔'' انتہائی مؤدبانہ لہجے میرے لیے باعث حیرت بنا ہوا تھا۔ میں نے پھر سے کمبل سینے تک اوڑھ کر تکیے سے ٹیک لگالیا۔ آپ مجھ سے انتہائی ادب سے کیوں بات کرتے ہیں، حالاں کہ قد اور عمر دونوں میں آپ مجھ سے بڑے ہیں۔''
''آپ کیسی عجیب باتیں کرنے لگی ہیں۔ آپ کا احترام مجھ سمیت میرے تمام گھر والوں پر لازم ٹھہرتا ہے۔''
''اچھا وہ تیرہ مہینے دس دنوں والی بات بیچ میں رہ گئی ہے۔'' مزید اُلجھنے سے بہتر تھا کہ میں اپنے مطلب کے جوابات پالوں۔
''آپ تیرہ مہینے دس دنوں بعد مکمل ہوش و حواس میں باتیں کر رہی ہیں۔''
''یہ بات تو آپ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔'' تیرہ مہینے دس دن میں کیسے بولتی تھی۔
''آپ نے جو بھی کہا اشاروں میں کہا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے گفتگو میں ہمیشہ استعارات استعمال کیے ہیں۔ آپ کے بہت سے استعارے، ہم سمجھ نہ پائے اور نا قابلِ تلافی نقصان اٹھایا ہے۔''
''استعارے......؟'' یہ ایک اور اُلجھن تھی، ''میں جلد اشاروں میں بات کیوں کرنے لگی اور وہ استعارے تھے کون سے۔''
''اچھا یہ بتایئے ہم اس وقت کہاں ہیں؟''
''ہمارے گھر میں...... ہمارا گھر ضلع گھوٹکی کے نواحی گاؤں گوٹھ چندھن میں ہے۔''
''ضلع گھوٹکی...... گوٹھ چندھن......'' میں نے زیرِلب دہرایا۔ یہ نام میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ علاقہ کہاں واقع ہے۔
صوبہ سندھ میں۔ گھوٹکی، سکھر ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ اس ڈویژن میں گھوٹکی کے علاوہ چار دیگر اضلاع سکھر، خیر پور، نواب شاہ اور نوشہرو فیروز بھی شامل ہیں۔
اس کی بات میں سرے سے سمجھ ہی نہیں پائی۔ یہ سارے کے سارے نام میرے لیے نئے اور اجنبی تھے۔ ایک دوسرا خیال میرے ذہن میں لپکا۔
''آپ کچھ دیر پہلے بہت سے لوگوں کے ساتھ یہاں آئے تھے، اتنے لوگوں کی بھیڑ کیسی تھی؟''
''چوبیس گھنٹوں میں دو بار تمام گھر والے مل کر آپ کے پاس آتے ہیں، یہ بابا کا حکم ہے۔''
''تمام گھر والے۔'' میں حیران رہ گئی۔ ''تو کیا سب آپ کے گھر کے افراد ہیں۔''
''جی ہاں۔ ہمارا گھر بہت بڑا ہے، آپ گھوم تو چکی ہیں، تقریباً تین کنال پر بنا ہوا ہے۔ اس میں چار فیملیاں قیام پذیر ہیں۔''
''میرے تین چچا ہیں، ہم سب جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔''
میری حیرانگی بڑھ گئی تھی۔ ''میں آپ لوگوں کے بیچ میں کب سے ہوں۔''
''یہی کوئی تیرہ مہینے دس دنوں سے۔''

''اس سے پہلے میں کہاں تھی۔'' اگلے سوال پر امن خاموش ہوگیا۔ ''آپ نے جواب نہیں دیا۔''
''جتنا میں آپ کو بتا چکا ہوں، اس کی بھی مجھے اجازت نہیں ہے۔'' اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔
''آپ کو کس نے منع کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''بابا اور تایا جان نے۔'' اس نے جھٹ جواب دیا۔
''مگر کیوں......'' میں یہ کہتی ہوئی بیٹھ گئی، میرا تیز لہجہ دیکھ کر وہ حیرت انگیز طور پر گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔
''کیا ہوا؟''
''کک۔ کچھ نہیں۔ میں چلتا ہوں۔'' اس کی گھبراہٹ عجیب معنی رکھتی تھی۔ وہ چھ فٹ کا لمبا چوڑا نوجوان تھا۔ حلیے سے کھاتے پیتے گھرانے کا مرد لگتا تھا، پھر مجھ سے اس قدر دب کیوں رہا تھا۔ میرے ذرا سے تیز لہجے پر اس کا سفید خوب صورت چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔
''آپ اتنے گھبرا کیوں جاتے ہیں۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔
''آپ...... آپ ناراض تو نہیں ہیں۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''تو میرا جی چاہا کہ شدت سے میں اپنے بال نوچ لوں۔''
''میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی۔'' میں نے کڑک کر کہا۔
''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، پلیز اگر بابا آئیں تو میری آمد کا ذکر ان سے مت کیجیے گا۔'' امن یہ کہتے ہوئے فوراً باہر نکل گیا۔

☆......☆

میرے دماغ کی کھڑکی پر پھر سے دستک ہونے لگی۔ ٹھک...... ٹھک...... ایک سوال پوری طاقت سے اُٹھا۔
''اگر میں یہاں تیرہ مہینے اور دس دنوں سے ہوں تو ان کا حال واحوال مجھے یاد کیوں نہیں، پھر یہ کہ ان تیرہ مہینے دس دنوں سے پہلے میں کہاں تھی۔'' میں نے کمبل ہٹا کر اپنا جائزہ لیا۔ ''نہیں میں تیرہ مہینے پہلے دنیا میں نہیں آئی۔ میری عمر یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے۔'' پھر...... سوچیں الجھاؤ کا شکار ہونے لگیں۔ ایک سوال پھر میرے ذہن میں اُبھرا۔ ''امن سے میرا کیا رشتہ ہے۔ تین کنال کے اس گھر میں بسنے والے لوگوں سے میرا کیا رشتہ ہے۔'' سوالات کا در دروازے کی دستک سے بند ہوگیا۔
''آ جاؤ......'' دستک کے جواب میں، میں نے بلند آواز میں کہا۔ دروازہ کھلا اور پچاس پچپن برس کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی شکل وصورت اور جسامت امن سے مشابہت رکھتی تھی۔ میرے خیال میں یہ امن کا بابا تھا۔ اس کے ہمراہ ساڑھی میں ملبوس اس سے پانچ چھ سال چھوٹی عمر کی ایک عورت بھی داخل ہوئی۔ دونوں کے کپڑے اور سج دھج امیروں جیسی تھی۔ دونوں انتہائی ادب سے اندر داخل ہوئے۔ شانے سے شانہ ملا کر میرے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لیے۔ آنکھیں بند کر کے ایک منٹ دل ہی دل میں کچھ بڑا بڑائے اور پھر میری جانب بڑھے۔ میں سمجھی کہ اب میرے پاؤں چھوئے جائیں گے، اس لیے میں نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔
مگر...... وہ میرے سرہانے چلے آئے۔
''آپ امن کے بابا ہیں۔'' میں نے آپ سے پوچھا۔
''جی مہک جی۔ میں امن کا بابا ہوں۔ اور یہ اس کی مما ہیں۔''
''جی۔ جی۔'' عورت نے انتہائی ادب سے جواب دیا۔
''آپ لوگوں کے نام کیا ہیں؟''
مہک سب کچھ تو آپ جانتی ہیں۔'' پتا نہیں میرے بارے میں ان کے دماغوں میں ایسا کیا گھسا ہوا تھا۔
''مجھے پتا ہے، مگر میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں، میرا یہ حربہ کارآمد ثابت ہوا۔''
''میرا نام قدم چند دولتانی ہے۔''
''اور میرا نام چندھن دولتانی۔''
''کیا اس گاؤں کا نام، آپ کے نام پر رکھا گیا تھا۔''
''نہیں جی، بلکہ میرا نام گاؤں کے نام پر رکھا گیا تھا۔''
''مہک، ہمیں لان تک جانا ہوگا۔'' امن کی ماں خوب صورت عورت تھی۔ ان کے لہجے میں شائستگی اور اپنا پن تھا۔ اس عمر میں بھی

ہلکا۔میک اپ کیے ہوئے تھی۔کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور کانوں میں سونے کی بالیاں پہن رکھی تھیں۔

''مہک! آپ کو لان تک جانے میں کوئی دقت تو نہیں۔'' امن کے بابا نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں مجھے کوئی دقت یا قباحت نہیں ہے۔میں خود باہر کی تازہ ہوا لینا چاہتی تھی۔کمرے میں ٹھنڈک کے باوجود مجھے حبس کا احساس ہونے لگا تھا۔'' میں نے جیسے ہی ہامی بھری تو دونوں میاں بیوی میرے دائیں بائیں چلے آئے۔مجھے کسی دلہن کی طرح دائیں بائیں سے پکڑ کر وہ باہر لے جانے لگے۔مجھے یوں لگا جیسے آج میری مہندی ہے اور مجھے باہر مہندی کی رسم کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

لان میں وہ سارے لوگ موجود تھے، جو کمرے میں آئے تھے۔وہاں ایک کرسی رکھی ہوئی تھی، جس پر مجھے بٹھا دیا گیا، باقی سب لوگ میرے سامنے نیچے زمین پر بیٹھ گئے۔وہ لوگ لائنوں میں بیٹھے تھے، بڑے آگے اور چھوٹے ان کے پیچھے تھے۔میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔یہ بہت بڑی حویلی تھی، لان بھی بہت بڑا تھا، ایک طرف پھلوں کے درخت اور دوسری طرف پھولوں کے پودے تھے، جس طرف پھولوں کے پودے تھے وہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔

میرے لیے ان کی نت نئی حرکات و سکنات ایک معما بنتی جا رہی تھی۔وہ چند منٹ آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں کچھ پڑھتے رہے، پانچ دس منٹ بعد ان میں سے دو عورتیں اٹھیں اور تخت کو دھونا شروع کر دیا۔دونوں نوجوان لڑکیاں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔تخت کو اچھی طرح دھونے کے بعد اسے خشک کیا گیا، پھر اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں، تخت پر خوب صورت دودھیا روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ایک طرف کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے، جن سے لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔دو عورتوں نے مل کر وہاں کچھ چیز (عود یا لوبان) جلائی۔اس کے بعد وہ مجھے تخت پر لے گئے۔میرے عقب میں دونوں جوان لڑکیاں پنکھے لیے کھڑی ہو گئیں، پھر مجھ پر پھول نچھاور کیے گئے اور ساتھ ہی خوشبوؤں کا چھڑکاؤ بھی کیا گیا۔ایک بڑے طاق میں رکھی گئی اگر بتیاں جلائی گئیں۔میں کسی نئے ڈرامے کی توقع کر بیٹھی تھی۔عجیب بات یہ تھی کہ وہ لوگ نہ تو مجھ سے کوئی بات کرتے تھے اور نہ ہی آپس میں زیادہ گفتگو کرتے تھے، جس سے میں اس ماجرے کی نوعیت سمجھ سکتی۔

تخت پر بیٹھے ہوئے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔عجیب و غریب تیز خوشبوؤں نے میرا گلہ دبا رکھا تھا۔مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر مزید چند منٹ اگر بتیوں کا طاق اٹھایا نہ گیا تو پھر دم اس کے دھوئیں سے ہی گھٹ جائے گا۔میں نے انہیں طاق ہٹانے کا اشارہ کیا، جس پر فوراً عمل کیا گیا۔اس دوران دو عورتیں ایک بوڑھی اور دوسری نوجوان...... دودھ کی بھری بالٹی تخت پر لے آئیں اور بالٹی میرے سامنے رکھی گئی۔اب تخت پر چار عورتیں موجود تھیں، ان میں سے ایک امن کی مما تھی، باقی لوگ ایک بار پھر تخت کے سامنے زمین پر خاموش احترام کے ساتھ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے۔میں تیزی سے کچھ سوچنے لگی اور اس کے منطقی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر دی تھی۔

میرے ذہن کی ساری کھڑکیاں بند تھیں، میں ابھی تک بات کی تہ تک پہنچ نہیں پائی تھی اور جب تک میں کوئی نتیجہ اُخذ کرتی، چاروں عورتوں نے مل کر مجھے دودھ سے نہلانا شروع کر دیا۔میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ دودھ مجھے غسل دینے کے لیے رکھا گیا ہے، حیرت کے شدید ترین جھٹکے سے میں جب تک سنبھل پاتی، وہ اپنا کام کر چکی تھیں۔مجھے دودھ سے غسل دیا جا چکا تھا۔میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا، میں خاموش رہی کہ دیکھا جائے ان کا مدعا کیا ہے۔اب میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔غسل دینے کے بعد چاروں عورتیں نیچے اتر کر زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئیں، مردوں میں سے بوڑھا مرد، جو امن کے بابا کے ساتھ مجھے تخت پر لایا تھا، کھڑا ہو گیا۔ان کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک گول تھال تھا، جس میں مختلف اشیاء قلیل مقدار میں رکھی ہوئی تھیں۔میرے بالوں سے دودھ کے قطرے اب تک گر رہے تھے کہ اور میرا چہرہ بھی گیلا تھا۔کپڑے گیلے ہونے کی وجہ سے مجھے عجیب سی کوفت ہو رہی تھی، میں نے تھال پر غور کیا اور اس میں رکھی گئی اشیاء کو پہچاننے کی کوشش کی۔بوڑھا شخص تھال کو بار بار حرکت دے رہا تھا، اس لیے اس پر نظر کا ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔میں چند چیزیں جو دیکھ پائی تھی، اس میں دہی، گڑ، پان کا پتا، ہلدی اور شاید کچھ چاول تھے۔بوڑھا شخص بلند آواز میں نامانوس زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔میں اس کا مفہوم سمجھ نہ پائی۔پانچ چھ منٹ تک وہ کچھ پڑھتا رہا، پھر اس نے مجھ پر پھول نچھاور کیے، گھر والوں پر پھول کی پتیاں اور پانی کا چھڑکاؤ کیا، اس کے بعد ان کی ہتھیلیوں پر اس نے کچھ رکھا، جسے وہ اپنی زبان سے چاٹنے لگے۔

☆......☆

میرے لیے یہ سب نیا، اچھوتا اور سنسنی خیز تھا۔اب وہ برتنوں میں کھانا ڈالنے لگے تھے۔ایک عورت میری طرف بڑھی، میں

نے اسے ہاتھ سے روک دیا، میری حالت دگرگوں تھی۔ میں عجیب وغریب اجنبیوں میں رہ رہی تھی اور اپنے نام کے سوا میں کچھ نہیں جانتی تھی، مگران لوگوں نے پتا نہیں مجھے کیا سمجھ رکھا تھا۔ جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا گیا، یہ میری عقل سے ماورا تھا۔ مجھے اپنے جسم سے دودھ کی باس آنا شروع ہوگئی، جس سے مجھے متلی ہونے لگی۔ میں فوراً تخت سے نیچے اُتر آئی، میرے اس طرح اچانک اٹھنے سے ان سب کے ہاتھوں کے طوطے چھوٹ گئے، وہ سب میری طرف یوں لپکے، جیسے کوئی معصوم بچہ کسی گہرے گڑھے میں گرنے والا ہے، میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا، وہ حیرت انگیز طور پر اس طرح اپنی جگہ جم گئے جیسے انہیں زمین نے پکڑ لیا ہے۔

''امن......'' میں نے ہولے سے امن کو پکارا، ساتھ ہی اسے اشارے سے قریب بلایا۔ ''میرے کمرے تک رہنمائی کرو۔''

میری ہدایت پر امن خاموشی سے میرے ساتھ ہولیا۔

''مجھے غسل کرنا ہے۔'' اندر داخل ہوتے ہی میں نے امن سے کہا۔

''جی بہتر۔ میں آپ کو ڈریسنگ روم میں لے چلتا ہوں۔''

''ڈریسنگ روم......'' میں نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں آپ کا ڈریسنگ روم الگ ہے، اس طرف آیئے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے میں ادب اور فرماں برداری ہنوز قائم تھی۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ ''آپ آرام سے غسل کیجیے، تب تک میں باہر انتظار کرتا ہوں۔'' وہ جانے لگا تو مجھے کپڑوں کا خیال آیا۔

''ایک منٹ رُکیے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''جی مہک فرمایئے۔''

''میرے کپڑے کہاں ہیں۔'' میں نے تنک کر پوچھا۔

''یہ سب الماریاں آپ کے کپڑوں سے بھری پڑی ہیں، جو مرضی ہے پہن لیجیے، اس طرف سنگھار میز رکھا ہے، کیا آپ بھول گئی ہیں۔ آپ تو ہمیشہ اسی کمرے میں تیار ہوتی رہی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے آپ جایئے۔'' مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی، میں اس لیے فوراً غسل کرنا چاہتی تھی۔ باتھ روم میری توقع سے کہیں زیادہ بڑا اور خوب صورت تھا۔ میں نے نیم گرم پانی سے اچھی طرح غسل کیا، وارڈ روب میں میرے ناپ کے کپڑے تھے اور سیکڑوں ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ سنگھار میز میک اپ کے ہر قسم کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ درازوں میں سونے چاندی اور آرٹی فیشل جیولری کے بے شمار سیٹ جڑے ہوئے تھے۔ میں مزید اُلجھ گئی۔

امن نے کہا تھا کہ آپ ہمیشہ اسی کمرے میں تیار ہوتی رہی ہیں، ہمیشہ سے ان کی مراد تیرہ مہینے دس دن ہے، جو میں نے یہاں بھگتائے ہیں، مگر اس سے پہلے میں کہاں تھی، پھر مجھے ان تیرہ مہینوں کا بھی حال احوال یاد کیوں نہیں۔ دماغ پر چھائی جانے والی عجیب وغریب کالی بدلی ڈھل گئی تھی۔ اب میں سکون سے سوچ سکتی تھی۔ ذہن کی بند کھڑکیاں کھول کر ان میں جھانک سکتی تھی۔ مجھے شہزادت کی آگہی پر سبقت پاتا تھی۔ جب تک میں خود کو پہچان نہ لوں، سکون سے نہیں رہ پاؤں گی۔ دروازے کی دستک نے میری محویت کو تہ وبالا کر دیا، بار بار کی دستک مجھے بے حد گراں گزرنے لگی۔

''آجاؤ، کون ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا تو دروازہ کھول کر سولہ سترہ برس کی خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس نے منی اسکرٹ پر ٹی شرٹ پہنچ رکھی تھی۔ بال شانوں تک تراشے ہوئے تھے، چہرے پر میک اپ کی تہ جمی ہوئی تھی۔ وہ خاصی ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔ آتے ہی ادب سے بولی۔ ''مہک جی آپ کو ڈرائنگ روم تک جانا ہوگا۔ انکل فہیم آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''جاؤ بھاگ جاؤ...... میں نے کسی انکل ونکل سے نہیں ملنا۔'' میں نے انتہائی غصے سے کہا۔ ''مجھے اب کسی ڈرامے کا کردار نہیں بننا...... دفع ہو جاؤ۔'' میں نے غصیلی آواز میں اسے ڈانٹا تو وہ بے حد گھبرا گئی۔ اس کا ہشاش بشاش چہرہ مارے خوف کے زرد پڑ گیا۔ وہ اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں کرسی پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں بعد امن کی آہستہ مگر نرم آواز سنائی دی۔

''مہک۔'' میں نے دیکھا۔ وہ اپنائیت سے بولا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''دیکھو امن، مجھے جب تک میرے بارے میں بتایا نہیں جاتا، میں نہ کسی سے ملوں گی نہ بات کروں گی۔'' میرے لہجے میں

تندہی ہنوز برقرار تھی، جسے محسوس کر کے امن پریشان ہو گیا۔
"ٹھیک ہے مہک میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، مگر فی الحال آپ انکل فہیم سے مل لیں پلیز۔" امن کے لہجے میں لجاجت اور چہرے پر بے بسی تھی، اس کی بے چارگی کی حالت دیکھ کر میرا دل موم ہو گیا۔
"مہک انکل فہیم کو آپ نے لاہور بھیجا تھا۔ وہ ایک مہینہ لاہور کی خاک چھان کر آئے ہیں، بے چارے بہت خجل خوار ہو گئے ہیں۔" میرے دل میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ "ہو سکتا ہے انکل فہیم کو میں پہچان لوں۔ وہ میرے رشتے میں کچھ لگتے ہوں۔ ہو سکتا ہے انہیں دیکھ کر شہرِ ذات کے اندر کوئی نئی کھڑکی کھل جائے، کوئی راستہ مل جائے، کوئی روشنی کی کرن، جو مجھے میری منزل کا پتا دے دے۔" میں ان سے ملنے کے لیے رضامند ہو گئی۔
ڈرائنگ روم میں امن کا بابا، تایا اور گھر کے چند دیگر افراد بھی موجود تھے۔ انکل فہیم امن کے بابا کی عمر کا شخص ہے، مگر اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ کاٹن کی سفید شلوار قمیص اس پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ چہرے پر داڑھی اور سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یہ تکلفات مجھے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ میں نے امن کی مما کے پاس بیٹھنے کی کوشش کی تو وہ فوراً گھبرا کر بولی۔
"مہک...... آپ کی نشست سامنے رکھی ہے۔" اس کا اشارہ ایک طرف الگ تھلگ رکھا ہوا صوفہ تھا۔ میں خاموشی سے وہاں بیٹھ گئی۔ اس نشست پر بیٹھنے کا مطلب تھا وہ سب میرے سامنے، میرے روبرو آ گئے تھے۔ میرا روئے سخن انکل فہیم کی طرف تھا۔ میں انہیں پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ شخص میرے لیے مکمل اجنبی تھا، یہ سچ کہا کہ وہاں پر جسے بھی میں نے دیکھا وہ میرے لیے اجنبی ٹھہرا تھا۔ امن نے کہا تھا، انکل فہیم کو لاہور میں نے بھیجا تھا۔ کمرے میں گہری پراسرار خاموشی چھا گئی تھی، ورنہ جب میں داخل ہوئی تو سب لوگ باتوں میں مگن تھے۔ پتا نہیں مجھے سامنے پا کر انہیں کیوں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ یہ غیر فطری عمل میرے اندر کے غصے کو بڑھاوا دیتا تھا۔

☆......☆

"آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے براہ راست انکل فہیم سے پوچھا۔ میرے سوال پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر دوسرے لوگوں کو...... میں نے محسوس کیا کہ امن کے بابا نے سر ہلا کر اسے کوئی اشارہ کیا۔
"جی...... مہک جی! وہ آپ نے لاہور بھیجا تھا مجھے۔"
"کب...... یہی کوئی ایک ماہ پہلے۔"
"میں نے کیا کہا تھا۔" انکل فہیم چند لمحے خاموش رہے، پھر سوچ کر بولے۔
"مہک! آپ نے کہا تھا۔ "لاہور میں مٹی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں ہیں، ان میں ایک ڈھیری ویران ہے، اس پر برسوں سے خودرو جھاڑیاں اور گھاس پھوس اُگ آئی ہے۔ یہاں کسی نے صفائی ستھرائی نہیں کی۔ تُو جا، اسے غور سے دیکھ، پھر اس کی صفائی کر اور جب صاف ہو جائے تو تم مینارِ پاکستان چلے آنا۔"
"ہاں تو پھر۔ آپ نے اس ویران ڈھیری کی صفائی کی۔"
"کیسے کرتا مہک! میں نے پورا لاہور چھان مارا۔ مجھے کہیں بھی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں نہیں ملیں۔" انکل فہیم کے لہجے میں بے چارگی اور تھکاوٹ تھی۔ "میں مینارِ پاکستان بھی گیا، مگر کچھ حاصل نہ ہوا، تھک ہار کر مجبوراً واپس پلٹ آیا۔ خدا کے لیے میری رہنمائی آسان الفاظ میں کیجیے، میں پہلے ہی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ میں نے محسوس کیا شاید وہ پُرنم ہو گئے ہیں، مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے ٹوٹنے کی۔ اب تو میرے بکھرنے کا عمل شروع ہونے لگا ہے۔" ان کی آنکھوں سے آنسو باقاعدہ نکل پڑے تھے۔
میں نے ڈرائنگ روم میں اِدھر اُدھر دیکھا، صرف دائیں طرف کی دیوار خالی تھی، ورنہ ساری دیواروں پر ڈیکوریشن، اشیاء اور خوب صورت فریمز لٹکے ہوئے تھے، میں نے خالی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انکل فہیم سے پوچھا۔
"یہ کیا ہے؟"
اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیوار کو دیکھا، پھر مجھے دیکھ کر بولا۔
"دی...... دیوار ہے۔"
"دیوار میں کچھ نظر آ رہا ہے؟"

”’ن۔ن۔نہیں۔ کچھ نہیں......“ انکل فہیم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”دی...... دیوار تو بالکل خالی ہے۔“ میں نے دیکھا کہ گھر کے دوسرے افراد بھی الجھن کا شکار تھے۔ میں نے انکل فہیم کو متوجہ کر کے کہا۔

”دیوار کو غور سے دیکھیے۔“ میں نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا، تو دیوار پردۂ اسکرین کی طرح روشن ہو گئی۔

”اوہ...... مم...... مہک......“ سب کی آوازیں حیرت میں ڈوبی ہوئی میری سماعت سے ٹکرائیں، میں روشن اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسکرین پر مینارِ پاکستان دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ مینارِ پاکستان ہے، جہاں پاکستان کی تاریخی قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ 23 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں آزادی کی قرارداد منظور ہوئی۔ مینارِ پاکستان ہمیں اسی اہم اور نئے موڑ کی یاد دلاتا ہے۔ مینارِ پاکستان کے مرکزی دروازے پر اللہ اکبر لکھا ہوا ہے، یعنی اللہ بہت بڑا ہے...... بے شک...... ایک دوسری سل پر مینارِ پاکستان لکھا ہوا ہے...... اور نیچے...... واللہ رب المشرق والمغرب تحریر ہے۔ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کا رب ہے...... بے شک۔“

”مینارِ پاکستان کا نقشہ مراد خان نے تیار کیا تھا۔ جو روسی نژاد مسلمان تھے، جب کہ اس کی تعمیر میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی نے کی تھی۔ مارچ 1940ء اور 19 اپریل 1946ء کی دونوں قرارداد مینارِ پاکستان پر درج ہیں۔ ان قراردادوں کو تین زبانوں اردو، انگریزی اور بنگالی میں رقم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آزادی کی تحریکوں کا بھی مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ مینارِ پاکستان کی اونچائی آپ لوگ جانتے ہو کتنی بلند ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اچانک میں نے حیرت میں گنگ افراد سے پوچھا، مگر وہاں کوئی بھی اپنے مکمل ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ میں نے خود ہی بات جاری رکھی۔

”اس کی اونچائی 96.5 فٹ ہے۔ مینارِ پاکستان کی تعمیر فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں بڑی تکنیکی مہارت کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بہت سے مقامات ہمیں بہت سے اشارے کرتے ہیں۔ اس کے مختلف چبوتروں کو مختلف دور کی عکاسی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بڑا چبوترا بڑا کھردرا اور ناتراشیدہ ہے، مگر اس میں ایسا سامان استعمال کیا گیا ہے کہ یہ بُرا نہیں لگتا ہے۔ یہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ آزادی کے وقت ہمارے ملک کی حالت دگرگوں تھی۔ دوسرے چبوترے میں پتھروں میں تراش خراش کے ساتھ کھردرے پن کا امتزاج کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ پاکستان اب دھیرے دھیرے سنور رہا ہے۔ تیسرے چبوترے پر کھردرا پن ختم کر دیا گیا ہے، یعنی اب اس کی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ یہ چبوترہ ساڑھے تیرہ فٹ اونچے پتے پر ہے اور اسی پر مینارِ پاکستان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ چوتھے چبوترے پر سنگِ مرمر ہمیں یہ یاد کرواتا ہے کہ اب پاکستانی عوام خوش حال اور خوش و خرم ہے۔ اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور روشنیوں کا سفر شروع ہو چکا ہے۔“ میں تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی۔ ذہن میں عجیب اتھل پتھل شروع ہونے لگی تھی، شاید آگے کے واقعات میں بیان کرنے سے قاصر تھی، مگر یہ حالت چند منٹ رہی، ذہن سے دھند چھٹ گئی اور واقعات خود بخود پھر سے وارد ہونے لگے۔

”مینارِ پاکستان کی آخری چوٹی انتہائی اہمیت کی حامل ہے، اس میں اسٹین لیس اسٹیل استعمال کی گئی ہے، جس پر سورج کی شعاعیں پڑتے ہی منعکس ہو کر ارد گرد کے سارے ماحول کو منور کرتی ہیں۔ اس میں دنیا کا اہم پیغام دیا گیا ہے کہ پاکستان دنیا میں اسلام کی سربلندی کی علامت ہے۔ پاکستان کا اسلام کے ساتھ مضبوط رشتہ ثابت کرنے کے لیے اس میں سورۂ بقرۃ، سورۂ آل عمران، سورۂ مائدۃ، سورۂ الرعد کی قرآنی آیات اور مختلف اشعار درج کیے گئے ہیں، ان کی خطاطی خورشید عالم، محمد صدیق، محمد اقبال، خورشید رقم، الماس رقم، حافظ یوسف سدیدی اور ابن پروین رقم نے کی ہے۔“

اسکرین پر منظر بدلا تو ایک بہت بڑا قبرستان نظر آنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار مٹی کی ڈھیریاں...... میں نے انکل فہیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اتنی بڑی تعداد میں بھی آپ کو مٹی کی ڈھیریاں نظر نہیں آئیں، وہ ڈھیری بھی اسی میں ہے۔“

”اوہ...... اوہ...... میں سمجھ گیا۔ یہاں تو میری...... اوہ میرے خدا۔ مجھ سے کتنی بڑی بھول ہو گئی۔“ انکل فہیم گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

اسکرین الجھ گئی تھی۔ انکل فہیم باہر کی طرف بھاگ گئے اور باقی لوگ میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ کیا کر رہے ہو آپ لوگ...... اُٹھو...... فوراً اُٹھو......“ میں نے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا تو انہیں جیسے ہوش آیا۔

☆......☆

دوسرے دن امن میرے پاس آیا تو میں پھٹ پڑی۔

"امن آپ نے کہا تھا، میں سب کچھ بتاؤں گا۔ مجھے پہلے انکل فہیم کے بارے میں بتاؤ۔ ان کا ماجرہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں نے انہیں لاہور کیوں بھیجا تھا، مجھے کچھ یاد نہیں۔" میں نے اپنے بالوں میں انگلیاں پیوست کرتے ہوئے کہا، شاید اس بار میرے لہجے کا درد سوا تھا۔ امن پگھل گیا۔

"مہک۔ انکل فہیم بابا کے بچپن کے دوست ہیں۔ ہماری فیملی ان کی فیملی کے ساتھ بے حد کلوز ہے۔ انکل فہیم کی ایک بہت بڑی پرابلم یہ ہے کہ ان کی اولاد زندہ نہیں بچتی...... اولاد کے لیے وہ چار شادیاں کر چکے ہیں، مگر چاروں بیویوں سے جو بھی اولاد پیدا ہوئی یا تو مردہ بچے کی ولادت ہوئی یا پھر وہ چند دن زندہ رہنے کے بعد ابدی نیند سو گیا۔ انکل فہیم بے چارے اولاد کے لیے ترس گئے ہیں۔ ان کا وسیع و عریض بزنس بھی انہیں اولاد جیسی نعمت نہیں دے سکا۔ کروڑوں کے بزنس کا مالک اندر سے انتہائی دُکھی ہے۔ بابا ایک دن انکل کو آپ کے سامنے لے آئے۔"

"میرے سامنے...... میرے سامنے ہی کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ نے آج تک جو کچھ بھی کیا، وہ کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوا ہے۔"

امن کی بات میرے لیے حیران کن تھی، میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ذہن میں سوالات کی بارش ہونے لگی تھی، مگر گرجنے بادل کبھی برستے نہیں، اس لیے گونج گرج میں سوالات دب گئے۔ امن سابقہ موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

"فہیم انکل نے آپ کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کیا، تبھی آپ نے اسے لاہور بھیجا تھا، تب وہ بے چارے آپ کے قبرستان کا اشارہ سمجھ نہ پائے، کل آپ نے اسکرین پر واضح دکھا دیا۔ اب وہ یقیناً سیدھا قبرستان جائیں گے، مگر ایک بات مجھے اب بھی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے یہاں مقامی قبرستان دیکھا ہے، تمام قبریں ایک جیسی ہیں وہ سیکڑوں ہزاروں قبروں میں سے اپنی مطلوبہ قبر کیسے پہچان پائیں گے؟"

"آپ سے اس قدر احمقانہ سوال کی توقع نہیں تھی۔ آپ نے سنا اور دیکھا نہیں تھا۔ کل جب انہوں نے اس قبرستان کو دیکھا تو اُچھل کر کھڑے ہو گئے تھے اور بے اختیار کہہ اُٹھے تھے...... اوہ، میں سمجھ گیا...... یہاں تو میری...... امن وہاں ان کی کوئی عزیز ترین ہستی مدفن ہیں جسے وہ بھول کر پس پشت ڈال چکے ہیں، البتہ آپ کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ قبرستان میں ساری قبریں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ امن یہ نظام قدرت ہے، موت سب کو برابر کر دیتی ہے، جب کوئی مر جائے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ بادشاہ سلامت جلال الدین اکبر پڑے ہیں، چنگیز خان، ہلاکو خان یا ہٹلر پڑے ہیں، بلکہ کہا یہ جاتا ہے، میت پڑی ہوئی ہے۔ موت سب کے لیے ہے کہ پھر بھی ہم اسے بھول کیوں جاتے ہیں۔"

"ایک اور بات مہک۔"

"کیا؟"

"میں بچپن سے انکل فہیم کو یہیں دیکھ رہا ہوں، شاید وہ زندگی میں کبھی لاہور نہیں گئے، پھر وہاں انکل کی کوئی عزیز ہستی کیسے دفن ہو سکتی ہے اور جسے بھلا دیا جائے وہ عزیز ہستی کیسے ہو سکتی ہے۔"

"یہ بات انکل فہیم آئیں تو انہی سے پوچھ لینا۔ مجھے یہ بتاؤ۔ میں نے ایسا کیا کچھ کہا کہ وہ کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوا۔" میرے سوال پر امن تذبذب کا شکار نظر آیا۔

"دیکھو امن۔ میرے ذہن میں ہزاروں سوالات جنم لے رہے ہیں، ہر سوال میرے لیے نیا دکھ، نئی اذیت لے کر آتا ہے۔ آپ کو نہیں پتا میں کس اذیت ناک مرحلے سے گزر رہی ہوں، مجھے نہ اپنے آپ کا پتا ہے نہ خاندان کا، نہ گھر والوں کا، بلکہ میں تم لوگوں کے نت نئے ڈرامے کا کردار بنتی جا رہی ہوں۔ اس لیے خدا کے لیے میری حالت پر رحم کھاؤ۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔ "میں آپ کی منت کرتی ہو، مجھے میری پہچان کراؤ۔ مجھ پر گزرنے والا ہر پل دُکھ اور درد کے نئے دروازے کھول رہا ہے۔ اگر میں آپ کے خاندان میں سے ہوں تو مجھے بتایا جائے کہ مجھے جنم دینے والی عورت کون سی ہے، جسے میں ماں کہہ کر پکار سکوں، جس کے سینے میں چھپ کر اپنا دُکھ درد بیان کر سکوں۔ خدا کے لیے امن مجھے میری پہچان کرا دو۔" اس بار میں خود پر ضبط نہ کر سکی اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک بلک کر رو پڑی۔ مجھے آنسوؤں کی برسات میں امن کا چہرہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''یہ...... یہ...... آپ کیا کر رہی ہیں۔ پلیز ایسا مت کیجیے، ورنہ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ آپ میری منت کیوں کر رہی ہیں۔ پلیز ہاتھ کھولیے اپنے۔'' امن گھبرا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

مزید کچھ کہنا میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ میرا دل و دماغ درد سے چیخ گئے تھے اور سینے میں درد کا گرم گرم دھواں بھر گیا۔

''آپ میرے ساتھ آئیے۔ امن نے ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔ مختلف راہداریاں گزار کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ دوسرے تمام کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی سجاوٹ اور خوب صورتی میں یکتا تھا۔ کمرے میں ایک دیوار پر خوب صورت انتہائی نفیس فریم میں چودہ سالہ لڑکی کی تصویر آویزاں تھی۔ فریم پر پھولوں کا ہار چڑھایا گیا تھا۔ امن تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں امن کے عقب میں سر اُٹھا کر تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ فریم کے شیشے میں مجھے امن کی خوب صورت آنکھیں جو تصویر کو گھور رہی تھی، نظر آ رہی تھیں۔ امن نے تصویر کو پوری محویت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مہک آپ اسے جانتی ہیں؟''

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ میں نے زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ میں حتیٰ المقدور کوشش سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے آنکھیں بند کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ سوچا، مگر لڑکی کی شبیہ میرے ذہن کے کسی خانے میں واضح نہیں ہوئی۔ امن کہہ رہا تھا۔ ''مہک ذہن پر زور دیں، آپ اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔'' امن کے اصرار پر میں پوری صلاحیتوں کے ساتھ سوچنے لگی۔ آنکھیں کھول کر پھر سے بغور تصویر کو دیکھا، مگر اس بار بھی ناکامی میرے حصے میں آئی۔ میں شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں امن۔ میں اسے پہچان نہیں پائی۔'' میرے لہجے میں بے بسی و لاچارگی تھی۔

''مہک یہ میری چھوٹی بہن پارو ہے، سب کی لاڈلی اور چہیتی۔ یہی وہ کمرہ ہے جب یہ نئے سال کی پارٹی میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ یہاں......'' امن گھوم کر ایک صوفے کے پاس کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''اور آپ مہک مجھے آواز دینے کے بعد اس دروازے سے داخل ہوئی تھیں۔'' اس نے اشارے سے دروازہ کی نشان دہی کی۔ میں اس کی کمنٹری پورے ارتکاز کے ساتھ سن رہی تھی۔ میں آپ کے سامنے آ کر یہاں اس دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔ آپ نے پارو سے پوچھا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

پارو نے ہمیشہ آپ کی بات ماننے میں حجت سے کام لیا تھا، وہ اس دن بھی رُکھائی سے بولی تھی۔ ''دیکھ نہیں رہی ہو، اندھی ہو کیا؟''

''میں پارو کا جواب سن کر کانپ اٹھا تھا، پھر آپ کی بات سن کر تو ڈر ہی گیا تھا۔ آپ نے کہا تھا۔''

''جتنی خوب صورت ہو اتنی ہی بدزبان بھی ہو۔ زبان سوچ سمجھ کر چلایا کرو۔'' امن کہے جا رہا تھا اور میرے ذہن میں جل تھل ایک ہونے لگی۔ ہوائیں چلنے لگیں، اور کچھ کچھ دھندلا پن میں واضح ہونے لگا۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ میری آنکھوں کے پردے میں جنگل میں بھاگنے والی ایک انتہائی خوب صورت لڑکی گھومنے لگی۔ صراحی بدن، لمبی گردن، پتلی کمر، مخروطی انگلیاں، پنڈلیوں سے ذرا اوپر تک جھولتی ریشمی سلکی زلفیں، غزالی آنکھیں، کمان دار پلکیں میں اُچھل پڑی تھی۔

''ہاں بالکل فریم میں سجی تصویر والی لڑکی بالکل وہی جنگل والی لڑکی ہے۔'' ادھر امن گھبرایا تھا۔ ''پارو نے آپ سے کہا تھا۔ آج سال نو کا فنکشن ہے۔ مجھے اس میں ہر صورت شمولیت کرنی ہے۔ تمہیں پتا بھی ہے، نئے سال کے موقع پر آتش بازی ہوتی ہے، برقی قمقمے جلتے ہیں، اور چراغاں کیا جاتا ہے۔''

میرے ذہن میں جنگل والی لڑکی کے الفاظ باقاعدہ دستک دے رہے تھے۔ جنگل میں آج کیا ناریل ٹوٹنے والا ہے۔ جب ناریل ٹوٹتا ہے تو آسمان چمک اُٹھتا ہے، رنگ کے سات رنگ بکھر جاتے ہیں۔

امن کہہ رہا تھا۔ مہک آپ نے کہا تھا۔ ''بے وقوف لڑکی جب آتش بازی ہوتی ہے تو اس میں آگ بھڑکتی ہے اور آگ ہمیشہ جلد کو جلا دیتی ہے، تم بھی جل کر بھسم ہو جاؤ گی۔ میری بات مان جاؤ، وہاں مت جاؤ جہاں بھیڑیے رقص کرتے ہیں۔'' امن یہاں کی بتا رہا تھا اور میرے ذہن میں وہاں کا منظر گھوم رہا تھا۔

''بے وقوف لڑکی۔ جس درخت سے ناریل ٹوٹتا ہے، وہ اسے چبا جاتا ہے۔ تمہیں بھی چبا جائیں گے۔'' مجھے محسوس ہوا امن کہتے کہتے رو پڑا ہے۔ وہ باقاعدہ ہچکیوں میں رونے لگا تھا، جبکہ میرے سامنے جنگل کے اندر کا منظر تھا۔ لڑکی ریل کی پٹڑی میں پھنسی

ہے اور میں اسے کسی مرد کے ساتھ مل کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مرد کا چہرہ دھندلا ہے، میں اسے پہچان نہ پائی۔ ہم جنگل میں لڑکی کو کھینچ رہے تھے اور یہاں امن کہہ رہا تھا۔

"پارو آپ کے منع کرنے کے باوجود چلی گئی اور آپ نے مجھے یہاں بازوؤں سے دبوچ لیا تھا اور سختی سے کہا تھا۔ اسے روکو، مت جانے دو اسے۔ آپ نے زور سے مجھے جھٹکا دیا تھا اور میری شرٹ دونوں بازوؤں سے پھٹ گئی تھی اور آپ لڑکھڑا گئی تھیں۔" یہاں امن کی شرٹ پھٹی تھی، میں لڑکھڑائی تھی، مگر جنگل میں لڑکی کا جسم کٹا ہوا تھا اور میں ہی نہیں میرے ساتھ لڑکی کو کھینچنے والا مرد بھی لڑکھڑا کر نیچے گر گئے تھے۔

"کاش پارو آپ کی بات مان لیتی، کاش میں اسے روک لیتا۔ پارو نیو ایئر پارٹی میں چلی گئی تھی، مگر اس کے بعد ہمیں اس کی ریزہ ریزہ لاش ملی تھی۔ ڈانس پارٹی میں چند اوباش نوجوان نشے میں بہک گئے تھے۔ اور...... اور...... وہ پارو کو اٹھا کر لے گئے۔"

امن اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکا، کیوں کہ باقی کی داستان میرے ذہن میں خود بخود چلی آئی تھی۔

امن نے میرے لیے سوچوں کے انبار لگا دیے تھے، سوالات کی بوچھاڑ میرے دماغ میں تڑتڑاتی گولیوں کی طرح برسنے لگی تھی۔ میں نے ماضی کے دریچے سے جھانکا۔ جنگل والی لڑکی پارو ہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد آ گیا، میں نے پارو کو جنگل میں جانے کے لیے روکا تھا، مگر پارو اس وقت یہاں اپنے گھر کے کمرے میں موجود تھی۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی انسان کے ساتھ دو مختلف واقعات پیش آئے تھے اور دونوں میں میری موجودگی بھی اس طرح تھی کہ مجھے اپنے ہونے کا احساس نہ یہاں تھا نہ وہاں۔ یہ قصہ میرے لیے ناقابل فہم معما بن گیا، میں جو شہر ذات کی آگہی میں تگ و دو کر رہی تھی شاید ابھی تک کامل صنفی پہچان بھی پا سکی تھی۔

☆......☆

میں نے دن اور رات کی تنہائی میں ذہن پر زور دے کر سوچا کہ "جنگل میں پارو کو ریل کی پٹڑی سے کھینچتے وقت میرے ساتھ مرد کون تھا؟" انتہائی کوشش کے باوجود میں اس سوال کا جواب نہ پا سکی۔ مرد کا چہرہ اتنا دھندلا اور بجھا بجھا سا تھا کہ میں اسے پہچان نہ پائی۔ اس واقعے کو میں کئی بار ذہن کے پردۂ اسکرین پر چلا کر دیکھ چکی تھی، ہر بار پارو کا چہرہ بالکل واضح نظر آیا، مگر مرد کا چہرہ پوشیدہ رہا۔ میرے لیے مرد کا چہرہ پہچان لینا ضروری نہیں، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟" امن نے کہا تھا میں نے ہمیشہ استعاروں اور اشاروں میں بات کی ہے اور جو بھی کہا ہے وہ کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوا ہے۔ دو اہم واقعات میرے سامنے آ چکے تھے۔ انکل فہیم اور پارو کے واقعات ہو سکتا ہے تیرہ مہینے دس دنوں میں، میں نے اس قسم کی کچھ اور حرکتیں بھی کی ہوں۔ یا کچھ اور بھی بولا ہو مجھے امن سے سب کچھ پوچھنا ہوگا۔ انہی کسی واقعے میں میری پہچان کا دروازہ کھلے گا۔ یا شہر ذات کی طرف جانے کا کوئی راستہ کوئی کنارہ ملے گا اس گھر کے تمام افراد میں سے امن واحد شخص تھا جس پر میرا اعتبار کرنے کو دل کرتا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور جوان سے لے کر بوڑھے تک مجھے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھتے تھے۔ میرے سامنے آتے تو ان کے سر احترام میں جھک جاتے اور لبوں پر خاموشی کا تالا لگ جاتا۔ وہ احترام کی ساری سرحدیں پار کر چکے تھے۔ امن بھی اس احترام میں کوتاہی نہیں کرتا تھا، مگر میرے کہنے پر وہ کچھ نہ کچھ بولنے لگا تھا۔ اس کا رویہ دھیرے دھیرے عام انسانوں کی راہ پر چل نکلا تھا۔

چند دنوں سے امن میرے کمرے میں نہیں آیا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی، مبادا وہ بھی مجھ سے کترانے لگا ہے۔ یہ سوچ میرے لیے تکلیف دہ تھی، میری ضروریات زندگی کا دھیان رکھنے اور کھانا وغیرہ دینے کے لیے جو بھی عورت یا لڑکی آئی، ہمیشہ کی طرح انتہائی ادب و احترام سے چپ چاپ، میرے پوچھنے پر بھی بات کرنے سے کترا کر دامن بچا لیا۔ میں لان میں گھومنے لگتی یا بالائی منزل پر ڈرائنگ روم یا ٹی وی روم جہاں بھی گئی، کوشش کی کہ میں کسی نہ کسی کی نظر میں رہوں۔ میں نے وقفے وقفے سے سارا گھر چھان مارا۔ تمام افراد سے مل بھی چکی تھی مگر مجھے امن نظر نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر میں موجود نہیں ہے، شام کا کھانا دینے انیس بیس سال کی خوب صورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس سے پہلے میں اسے مشترکہ لوگوں میں دیکھ چکی تھی۔ آج پہلی بار وہ تنہا آئی تھی۔ گھر کی دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح اس نے بھی بیل بوٹیوں والی بھڑکیلی چست پینٹ اور شارٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ اتنی چھوٹی تھی کہ وہ کھانا رکھنے کے لیے میز کی جانب جھکی تو کمر عریاں ہونے لگی، جس کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" توقع کے عین مطابق میرا سوال سن کر وہ بری طرح چونکی۔

"جی۔" اس نے جی کو خاصہ لمبا کھینچ کر ادا کیا۔ خوب صورت چہرے اور بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے بھر گئیں۔ "آپ کا نام

پوچھا ہے، اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔"
"جی...... میرا...... میرا نام ۔امبر ہے۔"
"تم نے شارٹ شرٹ کیوں پہن رکھی ہے؟ تمہیں کچھ احساس ہے۔ حرکات وسکنات سے تمہاری کمر اور پیٹ کا ناف تک کا حصہ ننگا ہو رہا ہے۔"
"جی۔ مجھے پتا ہے۔" اس کا جواب میری توقع سے ہٹ کر تھا۔
"اس کے باوجود تم ایسے کپڑے پہنتی ہو؟" میرے سوال پر ویسے ہی حیرانی ہوئی جیسے مجھے اس کا جواب سن کر ہوئی تھی۔
"جی ۔اس میں کیا برائی ہے۔"
"عجیب لڑکی ہو۔ گھر میں جوان مرد گھومتے ہیں۔"
"جوان مرد۔" امبر کی حیرانگی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ "جوان مرد کون ہیں؟ سب میرے اپنے ہی تو ہیں، میرے ڈیڈ، تایا، چچا، بھائی۔"
"کیا تم امن کی بہن ہو۔"
"جی ہاں۔"
"مگر امن نے تو کہا تھا کہ اس کی تین بہنیں ہیں۔"
"میں امن کی چچازاد بہن ہوں، منجھلے چچا کی بیٹی۔"
"تو پھر امن تمہارا سگا بھائی تو نہ ہوا۔"
"امن میرے لیے بھائیوں جیسا ہی ہے۔"
"بھائیوں جیسا ہے، بھائی تو نہیں۔" میں نے اپنے الفاظ پر کافی زور دے کر کہا۔ میرے لہجے کی سختی محسوس کر کے امبر گھبرا گئی۔ میں نے لہجے میں ملائمت پیدا کی، تاکہ اس کا ڈر دور ہو اور میرے ساتھ بات جاری رکھے۔
"امن کہاں ہے؟ مجھے اِن دنوں نظر نہیں آ رہا۔"
"جی امن بھائی کراچی گئے ہوئے ہیں۔ کراچی میں آغا خان ہسپتال میں ڈاکٹروں کا ایک اہم سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔"
"تو کیا امن بھی ڈاکٹر ہے۔"
"جی ہاں پاکستان کے چند مشہور ڈاکٹرز میں امن بھائی کا شمار ہوتا ہے، اپنے شعبے میں بڑے جینئس ہیں، آپ کا علاج بھی تو امن نے ہی کیا تھا۔"
"میرا علاج، کیا میں بیمار تھی۔" میرے سوال پر امبر کو احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط بول گئی ہے، مجھے دھڑکا لگا کہ وہ بھاگ جائے گی۔ میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ "امبر میں یہاں پچھلے تیرہ چودہ مہینوں سے رہ رہی ہوں، اس دوران میرے گھر والوں نے آپ لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔"
"آپ کے گھر والے کہاں ہیں۔" امبر نے الٹا سوال کر دیا۔
"مجھے کیا پتا کہ کہاں ہیں، تمہیں پتا ہوگا۔"
"ہاں مجھے پتا ہے۔"
"اچھا سچ۔ میں خوشی سے اُچھل پڑی، کون ہیں اور کہاں ہیں۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ میں بے اختیار سرک کر ان کے قریب ہوگئی، مگر امبر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"مہک جی!" "ہم ہی آپ کے گھر والے ہیں۔"
"اچھا تو امن تمہارا بھائی ہے تو میں تمہاری کیا لگتی ہوں۔" اس بار امبر خاموش ہوگئی۔
"جواب دو نا میری بہن۔ کیا میں بھی تمہاری کزن ہوں۔" ذرا توقف سے میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہاں تم میری بہن ہو۔"
"نن...... نہیں۔ آپ میری بہن کیسے ہو سکتی ہیں۔"
"کیوں نہیں ہو سکتی امبر؟ میں بھی تمہاری طرح کی ہی ایک عام سی لڑکی ہوں۔ عمر میں بھی اُنیس بیس کا فرق ہے، شاید تم ایک سال مجھ سے چھوٹی ہو۔"

''نہیں۔نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔آپ...... وہ کہتے کہتے رک گئی، آپ کھانا کھالیں، میں بعد میں آؤں گی۔'' میرے کچھ کہنے سے قبل وہ پھرتی سے چست ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے طویل سانس لے کر کھانے کے برتن کی طرف دیکھا۔ اعلیٰ اور لذیذ کھانا میرا منتظر تھا۔ گھر کے باقی افراد ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے تھے، مگر مجھے ہمیشہ کھانا کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔

☆......☆

میں نے امبر کی طرح گھر کے دوسرے تمام افراد کو وقتاً فوقتاً آزما کے دیکھ لیا۔ امن کے علاوہ مرد وزن میں ایک بھی فرد نہیں جسے میں سیڑھی بنا کر اوپر کی منزل تک پہنچ سکتی۔ وہ سب میرے سوال کے سامنے یوں متزلزل ہو جاتے ہیں جیسے ان کے اندر زلزلہ آ گیا ہو۔ میرے لیے ہر دن ایک نیا معما بن رہا تھا۔ میرے لیے عجیب بات یہ تھی کہ مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا، مگر میں مکمل ہوش و حواس میں ہونے کے ساتھ ساتھ شعور میں بھی تھی۔ مجھے اس بات کا بہت اچھی طرح ادراک تھا کہ ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ وکیل عدالت میں کیس لڑتے ہیں اور پیش امام مسجدوں میں نمازیں پڑھاتے ہیں، مگر اپنے بارے میں سوائے نام کے کچھ نہیں جانتی ہوں۔ امن ایک ہفتے کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ گھر کی فضا میں، میں حد درجہ بوریت کا شکار ہونے لگی تھی، اوپر سے ان کے عجیب و غریب ڈھکوسلوں نے مجھے چڑچڑا کر رکھا تھا۔ گھر کی فضا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگا، اس لیے اس بار جب سارے گھر والے میرے سامنے دو لائنوں میں جمع ہوئے اور دائرے کی شکل میں ہاتھ باندھ لیے، آنکھیں بند کر لیں تو میں نے امن کے بابا سے کہا۔

''مجھے باہر جانا ہے؟''

''باہر...... کہاں مہک جی۔'' انہوں نے توجہ سے پوچھا پھر خود ہی بولے، ''لان میں چلنا ہے۔''

''جی نہیں۔ یہ گھر اور اس کا لان باغ میں سب کچھ پچاس بار دیکھ چکی ہوں۔ میں اس تین کنال کے گھر سے باہر جانا چاہتی ہوں، تاکہ دیکھ سکوں باہر کی دنیا کیسی ہے، سفید یا سیاہ۔''

''جی......'' وہ حیرانی سے بولے۔

''جی...... مجھے پتا چلے کہ باہر آپ جیسے لوگ موجود ہیں۔ جن سے کچھ پوچھا جائے تو خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں باہر والے بھی میرے سامنے یوں لائنیں بناتے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر دل ہی دل مجھے گالیاں دیتے ہیں۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہک جی...... گالیاں......'' اس بار امن کے بابا حیرت سے بولے تھے۔

''جی ہاں گالیاں...... میں تو یہی سمجھوں گی نا۔ آپ ہر روز ایک ہی طرزِ عمل پر عمل پیرا ہیں۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں، دل ہی دل میں کہا جاتا جاتا ہے، تو میں کیا سمجھوں۔'' کہتے ہوئے میرے لہجے میں تلخی در آئی تھی، جسے سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کے چہروں پر غم و فکر کی ہوائیں اڑنے لگیں۔

☆......☆

''میں انسان ہوں، مجھے تم لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ میرے سامنے یوں ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہو جیسے آپ لوگ مسلمان نہیں ہندو یا بت پرست ہو۔ آپ لوگوں کے اس عمل سے مجھے بے انتہا کوفت ہوتی ہے۔'' میرا جی چاہ رہا تھا، آج ان سب کو کھری کھری سناؤں۔ حیرت انگیز طور پر ذہن میں الفاظ کا نزول تسلسل سے ہونے لگا تھا۔

''آپ کو پتا ہے یہ بدھ مت کون ہیں؟ کیا ہیں؟'' میں نے ذرا توقف سے بات جاری رکھی۔ ''پتا نہیں۔''

''ٹھہرو میں بتاتی ہوں، کہ بدھ مت کون ہیں۔'' میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، سامنے کی سفید دیوار خالی تھی۔

''وہاں دیکھو۔'' میرے اشارے پر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا تو حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے۔ بوڑھی عورتیں آہستہ آہستہ نیچے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ان سب کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے، وہ انگشت بدنداں روشن دیوار کو دیکھ رہے تھے، جس پر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش
سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ فریدہ۔کراچی

☆بیٹی فریدہ! تمہاری خواہش کے مطابق خط شائع نہیں کیا جارہا۔ میں تمہیں یہ نصیحت کروں گا کہ مکمل معلومات حاصل ہونے کے بعد اگر مطمئن ہو تب استخارہ کرواؤ، درست طریقہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنی طرف سے مکمل جانچ پڑتال کرنے کے بعد استخارہ کرلے یا کروائے۔

□ سید احسن علی، روس

o بابا جی السلام علیکم! بہت مشکل سے خط آپ تک پہنچانے کی کوشش کررہا ہوں۔ میں گھر والوں کی کفالت کی خاطر روس آیا تھا تاکہ انہیں زندگی کی سہولیات دے سکوں مگر یہاں میں ایک ناکردہ جرم کی سزا میں جیل میں ہوں۔ جیل میں زندگی کے 6 سال گزر گئے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے گھر والے کس حالت میں ہیں اور کہاں ہیں۔ کسی طرح انہیں خط بھجوایا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ خط ان تک پہنچا بھی یا نہیں۔ ایک انڈین دوست چند دنوں میں رہا ہونے والا ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ میرا خط آپ تک پہنچادے گا۔ بابا جی خدا کے لیے میرے لیے کچھ کریں کہ مجھے رہائی مل جائے، میں اپنے گھر والوں کے پاس واپس آسکوں، یہاں میری زبان بھی کوئی نہیں سمجھتا۔ بہت سخت لوگ ہیں بس رہا ہونے والا شخص میرا آخری سہارا ہے۔ وہ یہ خط اپنے وطن سے آپ کو بھیجے گا۔ اللہ کرے آپ کو مل جائے۔ بابا جی آپ کو حضور ﷺ کا واسطہ مجھے رہائی مل جائے دعا کریں اور یہ خط انسانی حقوق کی کسی تنظیم تک ضرور پہنچادیں۔ میں نہ تو آپ کا جواب پڑھ سکتا ہوں نہ یہ جان سکتا ہوں کہ خط آپ کو ملا بھی یا نہیں، بس بابا جی اپنی اولاد جان کر میرے لیے دعا کریں۔ میرا خط ضرور شائع کریں شاید میرے گھر والے پڑھ لیں اور میرے بارے میں جان جائیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں اب کبھی اپنے وطن واپس نہیں آسکوں گا۔ کان بچوں کی آواز سننے کو ترس گئے ہیں، مجھ پر رحم کھائیے۔

☆ بیٹے احسن! یقین کرو تمہارا خط پڑھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا اور یہ سوچ کر زیادہ تکلیف ہوئی کہ پتا نہیں تمہارے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی۔ تمہارے لاپتا ہوجانے کے بعد زندگی ان کے لیے عذاب سے کم نہیں رہی ہوگی۔ اللہ کرے تمہارا یہ خط تمہارے کسی اپنے کی نظروں سے گزرے 6 سال ایک طویل عرصہ ہے۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کروں گا کہ تم جلدازجلد اپنوں میں لوٹ آؤ۔ اس کے علاوہ جو کرسکا کروں گا اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ واجد نور خان۔کراچی

o بابا جی السلام علیکم! اللہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے (آمین) بابا جی میرا مسئلہ سنیں گے تو ہنسیں گے مگر میں اس مسئلے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے گھر کھٹمل ہوگئے ہیں اور دنیا کا ہر جتن کرنے کے باوجود ختم نہیں ہورہے۔ ہم نے ہر اچھی دوا ڈالی جس نے پانی میں کہا پانی میں ڈالی۔ جس نے مٹی کے تیل میں کہا مٹی کے تیل میں ڈالی مگر کھٹمل ختم نہیں ہوئے ہم نے بقر عید پر دوا ڈال کر تمام بیڈ اور گدے باہر دھوپ میں ایک ہفتے کے لیے ڈال دیے تمام چادریں تکیے کے غلاف گرم پانی سے دھوئے۔ تکیے تک دھوپ میں ڈال دیے۔ ایک ہفتے کے بعد فرنیچر دوبارہ ڈالا تو اس میں پھر دوا ڈالی کچھ عرصے امن رہا اب پھر کھٹمل ہورہے ہیں، بابا اس کا کوئی حل بتادیں مہربانی ہوگی۔ میں غریب آدمی ہوں۔ نیا فرنیچر نہیں لے سکتا مجھے میرے اس مسئلے کا حل بتادیں۔ میرا نام واجد نور خان ہے اور امی کا نام محسن جہاں ہے۔ بابا جی میرے مسئلے کو حل کردیں میں آپ کو دعائیں دوں گا۔

☆ بیٹے واجد! مشکل تو مشکل ہوتی ہے کسی کی پریشانی پر ہنسنا بری بات ہے۔ نیا فرنیچر لینے کی ضرورت نہیں صرف پالش کراؤ اور جہاں جہاں لکڑی میں خالی جگہ بنی ہوئی ہے اس کی بھرائی کرادو۔ یہ پالش والا ہی کرے گا۔ ایک عدد کھجور کے پتوں کی جھاڑو لو۔ لگاتار 7 دن صرف اس سے گھر کی صفائی کرواؤ پھر اس جھاڑو کو علاقے کی مسجد میں رکھوادو۔ مسجد کی صفائی بھی اسی جھاڑو سے کی جائے۔ انشاءاللہ 15 دن کے اندر اندر تمہیں اس مسئلے سے نجات مل جائے گی۔ نجات حاصل کرنے پر

حسب استطاعت صدقہ خیرات نکال دینا۔

□ سنبل۔ کراچی

○ محترم بابا جی السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا کرے اور اسی طرح آسانیاں بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) بابا جی میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پر قرضہ بہت ہے جو کہ تقریباً 12 لاکھ ہے اس قرضے کی وجہ سے میرے شوہر ڈپریشن کا شکار رہتے ہیں۔ دل پر دباؤ رہتا ہے۔ راتوں کو سوتے نہیں ہیں۔ انہوں نے قرض لے کر ایک کام شروع کیا تھا، مگر وہ بھی مستقل نقصان میں ہے اور جن سے قرض لیا تھا انہیں بھی ہر مہینے پیسے دینے ہوتے ہیں جبکہ کام چل تو رہا ہے، مگر اس سے مستقل نقصان ہی ہوتا ہے۔ کام منرل واٹر کا ہے، بابا جی اس قرضے سے نجات اور کام چلنے کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں بڑی مہربانی ہوگی۔ میرا نام عظمیٰ نورین ہے اور پیار سے سب مجھے سنبل کہتے ہیں۔ میری امی کا نام نجمہ نورین ہے۔ بابا جی میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا بیٹا جس کا نام محمد حمزہ نور خان ہے وہ ہے تو کلاس ون میں مگر اسے اُردو اور انگلش کے حروف تہجی تک کی پہچان بھی نہیں ہے۔ اسے پہچان کراؤ تو یا تو اگلے دن یا اسی وقت وہ بھول جاتا ہے۔ وہ نرسری کے نئے داخل شدہ بچوں کی طرح ہے۔ وہ جب چھ مہینے کا تھا تو اسے مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے بعد کبھی نہیں پڑا۔ میں روز صبح 21 بار رب اشرح لی صدری...... یفقہو قولی پڑھ کر اس کے سر پر دم کرتی ہوں، مگر کوئی بات نہیں بنتی ہے۔ برائے مہربانی بابا جی اس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں۔ الحمدللہ بابا جی ہم دونوں میاں بیوی پنج وقتہ نمازی ہیں۔ ہر قسم کے جلن و حسد سے دور ہیں۔ غیبت سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ آپ ہمارے ان مسائل کا حل بتا دیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، شکریہ

☆ بیٹی سنبل! بیٹا اُلٹے ہاتھ کا تو استعمال نہیں کرتا یہ ذرا واضح کر دو۔ تم دونوں نماز کے پابند ہو بہت اچھی بات ہے۔ بس بعد نماز عشا ایک بار سورۂ واقعہ ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے، حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔

□ نور الصباء۔ گھوٹکی

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم۔ بابا جی آج سے ایک سال پہلے آپ سے اپنے بالوں کے متعلق مسئلہ پیش کیا تھا۔ بابا جی! آپ کے بتائے ہوئے تیل کو استعمال کر کے میرے بال جڑ سے کالے اُگنے لگے، دو منہ والے بال اُگنا بند ہو گئے، میری چوٹی بھی ماشاء اللہ بہت موٹی گندھنے لگی ہے۔ بابا جی! میری ایک سہیلی جو کہ کوٹری میں رہتی ہے اُسے بھی بالوں کے اَن گنت مسائل کا سامنا ہے۔ پلیز بابا جی! بتایئے وہ کس طرح آپ سے تیل حاصل کرے۔

☆ بیٹی صبا! تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔ خدا کا شکر ادا کرو بس بیٹی نماز کی پابندی ہمیشہ کرنا اور کوشش کرو کہ باوضو رہو، تیل کے لیے طریقہ وہی ہے کہ تیل براہ راست آفس سے منگوایا جا سکتا ہے۔ تیل کو ہاتھ میں لے کر انگلی کی مدد سے جڑوں پر لگاؤ۔ خدا کی پیدا کردہ جڑی بوٹیوں اور کلام اللہ میں بڑی طاقت ہے۔

□ مریم شاہ۔ سرگودھا

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ آپ کا کالم پڑھا اور یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ اس مادی دور میں ایسا شخص بھی موجود ہے جو دُکھی انسانیت کی خدمت بلا معاوضہ کر رہا ہے۔ اس کا اجر اللہ عزوجل آپ کو آخرت میں ضرور دے گا، انشاء اللہ۔ محترم بابا جی! جو مسئلہ میں آپ سے بیان کرنے جا رہی ہوں یہ صرف میرا مسئلہ نہیں بلکہ اس شخص سے جڑے ہر فرد کا مسئلہ ہے جو خواہ وہ کسی بھی رشتے کی صورت میں ہو، میرے ماموں زاد بھائی سید علی حسن کو جہاد کا بے حد شوق تھا اپنی دادی کی زبانی کشمیر پر ہونے والے مظالم کی داستان سن کر یہ جذبہ اور بھی بڑھ جاتا...... آخر کار گھر والوں سے چوری اپنا نام مجاہدین کی ایک تنظیم ''جماعت الدعوۃ'' میں بطور مجاہد لکھوا دیا۔ کچھ عرصہ تو پتا ہی نہ چلا لیکن ماموں جان کو ایک روز خبر ہوگئی۔ انہوں نے ان سے باز پرس کی تو انہوں نے تسلیم کر لیا۔ گھر والوں نے انہیں بہت سمجھایا کہ یہ تنظیم ٹھیک نہیں ہمیں شبہ ہے کہ یہ معصوم لوگوں کی جان لیتے ہیں مگر وہ نہیں مانے ان کے ذہن پر بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ کشمیر کے لیے اپنی جان بھی

قربان کردیں گے...... وہ ٹریننگ کے لیے جاتے رہے اس دوران گھر بھی چکر لگا لیتے، مگر ایک روز اچانک یہ سلسلہ بند ہوگیا...... ہم نے بہت تلاش کیا مگر کوئی اتا پتا نہ ملا، آخر 2003ء میں دو آدمی ان کی شہادت کی خبر لے آئے۔ ان کے پاس ایک ناقابل فہم خط بھی تھا جس کی ابتدائی لکھائی علی بھائی کی تھی لیکن باقی سطریں ان کی لکھی ہوئی نہیں لگ رہی تھیں...... پورا خاندان شدتِ غم سے نڈھال تھا۔ اس وقت کسی نے بھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ آج انہیں ہم سے بچھڑے دس برس بیت چکے ہیں لیکن ہمیں کل کی بات لگتی ہے۔ ہمیں کسی طور چین نہیں آتا اور نہ ہی یقین آتا ہے۔ ہمیں اُس وقت یقین آجاتا اگر وہ ہمیں ان کی میت دیتے۔ ہم سب کا خیال یہی ہے کہ وہ دہشت گردوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ زندہ ہوں۔ بس امید کا دامن تھام کر آپ سے ''استخارہ'' کی گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ملیں گے کہ نہیں......

☆ بیٹی مریم۔ اللہ تمہیں اور دیگر خاندان کے افراد کو صبر عطا فرمائے۔ جس قدر ممکن ہو قرآن پڑھ کر بھائی کو بخشا کرو۔ اور خیرات کا سلسلہ بھی جاری رکھو۔

□ ارم۔ حیدرآباد

☆ بیٹی ارم۔ خود اعتمادی کے لیے تمہیں خود بے انتہا کوشش کرنی ہوگی۔ اس کا سب سے آسان حل یہ ہے کہ لوگوں سے گھبراتی ہو تو لوگوں ہی میں گھری رہا کرو، گھر والوں سے ہر معاملے میں بات کیا کرو۔ عزیز واقارب سے قریبی تعلق رکھو۔ گھر میں اور کمرے میں بند مت رہا کرو، نماز کی پابندی رکھو اور سورۃ فاتحہ بکثرت پڑھا کرو، ابھی کم عمر ہو تھوڑی سی ہمت کرو گی تو اس مسئلے پر قابو پالوگی...... یہ مت سوچا کرو کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے بلکہ کوشش کیا کرو کہ تم ان کے بارے میں اچھا سوچو...... گھر آئے مہمانوں کی خاطر کیا کرو، خیریت دریافت کیا کرو، انسان سب کچھ اپنے گھر سے ہی سیکھتا ہے۔ کوشش کرو ضرور کامیابی ہوگی۔

□ ع۔ ب۔ سرگودھا

☆ بیٹی۔ اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری سوچ بہت اچھی ہے، جو بچے اپنے بڑوں کا احترام کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کے غلام نہیں بنتے وہ بہت کامیاب زندگی گزارتے ہیں کیوں کہ والدین کی دعائیں ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اللہ سے مدد کی طلب گار رہو، نماز فجر اور عشا کے بعد سورۃ آل عمران آیت 11 ننانوے ننانوے بار اوّل وآخر درود شریف، مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ شاہان علی۔ لاہور

o بابا جی! میں ایک پرائیویٹ بینک میں کام کرتا ہوں۔ اچھی ملازمت کب ملے گی اگر میڈیسن کی کمپنی میں ملازمت کروں تو کیسا رہے گا۔ میں (H) بزنس ایڈمنسٹریشن میں کررہا ہوں۔ آخری سمسٹر ہے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے میری مدد کریں۔

☆ بیٹے شاہان۔ میانہ روی سے کام لو۔ بینکنگ کا شعبہ فی الحال موزوں ہے۔ جہاں کام کرتے ہو کرتے رہو۔ ''میڈیسن'' کا شعبہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ بہتر ملازمت کے لیے کوشش کرتے رہو۔ جلد بازی سے گریز کرو، ممکن ہے 2014ء میں مارچ کے بعد تمہیں بہتر ملازمت مل جائے۔ فی الحال سب سے پہلے نماز کی پابندی ہے، نماز عشاء اور فجر کے بعد سات سات بار ''یافتاح'' کی تسبیح 41 دن تک پڑھو انشاء اللہ خدائے بزرگ وبرتر کامیابی عطا فرمائے گا۔

□ علیم احمد۔ بھوربن

o بابا جی! السلام علیکم۔ موسم جیسا بھی ہو مگر میرے ساتھ گلے کا عارضہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ آپ نے مجھے پہلے بھی دوا دی تھی میں نے استعمال کی اور فائدہ ہوا۔ آپ نے کہا تھا کہ تین ماہ مستقل استعمال کرنے سے مرض جڑ سے ختم ہوجائے گا۔ بس بابا جی! جب گلا ٹھیک ہوا میں نے دوا ترک کردی اب پھر سے دوا استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ غلطی کو معاف کرکے، دوا تیار کردیں۔

☆ بیٹا علیم! تمہارے کہنے پر دوا تیار کی تھی جو مجرب تھی اور تم نے لاپروائی کرکے اپنا نقصان کیا۔ نماز کی

پابندی کرو، کوشش کرو کسی کراچی کے عزیز کو کہہ کر براہ راست آفس سے دوا منگوالو۔

□ نصرت ناز۔ کراچی

○ پیارے باباجی! ہم لوگ برے دور سے گزر رہے ہیں۔ میرا بھائی جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے، ناکامی ہوتی ہے۔ نقصان بھی ہو چکا ہے۔ ہمارے بھائی کا کام کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ باباجی! خدا کے لیے ہماری پریشانی کو دور کرنے کے لیے کچھ کریں۔ پلیز۔

☆ بیٹی نصرت! صورت حال اتنی بری نہیں ہے جیسا کہ تم نے ذہن پر مسلط کر رکھا ہے۔ میانہ روی سے کام لو۔ بھائی جو کام کر رہا ہے وہ ایک اچھی ابتدا ہے، کوشش جاری رکھو اگلے ڈیڑھ سال میں کامیابی اور ترقی کی نشاندہی ہے۔ سب نماز کی پابندی کرو اور نماز عصر کے بعد تین تین بار "یا وہاب" کی تسبیح پڑھ لو تو دیکھتے ہی دیکھتے حالات تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائیں گے۔

□ سرور جہاں۔ منگلا ڈیم

○ محترم باباجی! السلام علیکم۔ باباجی! میں گزشتہ دو سال سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور آپ کا ہم پر یہ احسان ہے کہ آپ ہمارے خط کا جواب وقت پر دے دیتے ہیں۔ باباجی! میں نے جس مسئلے کے لیے بھی وظیفہ منگوایا، خدا کے کرم اور آپ کی دعاؤں سے وہ مسئلہ حل ہو گیا، لیکن میرا ایک اہم مسئلہ جس کے لیے میں نے آپ سے وظیفے منگوائے اور وہ سب نماز کی پابندی کے ساتھ ادا بھی کیے، لیکن مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہو رہا۔ باباجی! پلیز خدا کے بعد آپ کو واحد سہارا جان کر یہ خط لکھ رہی ہوں، برائے کرم میری مدد کریں اور مجھے ایک بیٹی ہونے کے ناتے دعا دیں کہ مجھے میرا سچا پیار مل جائے۔ باباجی! آپ مجھے کوئی ایسا جلالی ورد بتا دیں جس کے کرنے سے میرا رشتہ غیر برادری میں، جہاں میں چاہتی ہوں جلدی سے طے ہو جائے اور خدا ہم دونوں کو جلدی سے ایک کر دے۔ باباجی! مجھے یہ بھی بتائیں کہ جو ورد آپ مجھے بتائیں گے کیا وہ ورد لڑکا جس سے میں شادی کرنا چاہتی ہوں، کر سکتا ہے۔ باباجی! میرے خط کا جواب جلدی دیجیے گا اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ بیٹی سرور۔ اب جو حالات ہیں اس میں مناسب ہوگا کہ تم مجھ سے تعویذ لے لو۔ ایک تعویذ تم رکھو دوسرا وہ لڑکا رکھے۔ آئندہ خط مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تمہیں تفصیل ارسال کی جاسکے۔

□ حدیقہ علی۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی حدیقہ! ایک بات یاد رکھو، وظیفہ وہی کامیاب ہوتا ہے جو پورے اعتقاد اور مکمل یقین کے ساتھ کیا جائے۔ تم خود مانتی ہو کہ نماز پابندی سے نہیں پڑھی گئی۔ گھر میں اتفاق بھی اسی لیے نہیں ہے کہ تم لوگ عبادات سے بہت دور ہو۔ بیٹی! میں ویسے بھی بہت سہل وظائف دیتا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آج کل کے تیز دور میں لمبے وظائف کرنا ممکن نہیں۔ مناسب ہوگا پہلے نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور حسبِ استطاعت صدقہ خیرات کرو۔ اللہ رکاوٹیں دور کرے گا۔

□ ایمل دُرگئے۔ مردان

○ باباجی! میرے دماغ پر بوجھ بڑھنے لگتا ہے جب کوئی مجھے سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ بہت مشکل سے انٹر پاس کیا ہے۔ اب بڑے بھائی اور ابو منصوبے بناتے ہیں کہ اس کو یونیورسٹی میں داخل کرائیں، چار سال میں ایم ایس کرلے گا تو چچا کے پاس جرمنی بھیج دیں گے یا پھر یہیں یونیورسٹی میں جاب دلوا دیں گے۔ بڑے بھائی یونیورسٹی میں ہی پڑھاتے ہیں۔ میں ابھی سکون چاہتا ہوں، ایک سال آرام کرنے کے بعد کچھ سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے ابو سے کہا ہے میں بھائی سے زیادہ پڑھوں گا اور آپ جرمنی بھیجنے کی بات کرتے ہیں، میرا ارادہ امریکہ یا فرانس جانے کا ہے۔ کینیڈا بھی اچھا ہے۔ آپ دیکھیے گا میں کتنا کامیاب رہوں گا لیکن فی الحال آپ لوگ مجھے کچھ دن آزادی کے گزارنے دیں۔ یہ بات ان لوگوں کو گراں گزرتی ہے۔ باباجی! پلیز کوئی ایسا عمل بتائیں کہ میری بات ابو لوگوں کی سمجھ میں آ جائے اور مجھے دماغی سکون مل جائے۔

☆ بیٹے ایمل۔ تم فی الحال اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کر رہے ہو۔ بڑے بڑے ارادے ظاہر کرکے اور بڑی بڑی باتیں کرکے خود کو فریب بھی دے رہے ہو۔ اس میں بھی ایک طرح کا عارضی اطمینان ہے۔ خود کو احساس دلا رہے ہو کہ بہت کام کیا ہے، بس ذرا آرام کرنا ہے جیسے کہ اچھا وقت ہمیشہ منتظر رہے گا اور بھائی تمہارے بارے میں ہی سوچتے رہیں گے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ تم حالات میں تبدیلی سے خوف زدہ ہو۔ اس لیے آزادی کے دنوں کی بات کر رہے ہو، یہ آزادی وقت کی بربادی بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے اپنے بڑوں کی بات مانو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد ایک بار ''یا قہار'' کی تسبیح کو معمول بنالو۔ دیکھ لینا کس طرح تمہارا دل ودماغ پُرسکون ہو کر مضبوط فیصلہ کرے گا۔

□ جمیلہ کنول۔ پشاور

○ بابا! میں نے بہت شوق سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، پہلے ہی سمسٹر میں دو پرچوں میں نمبر کم آئے۔ مجھے کبھی فیل ہونے کا تجربہ نہ تھا۔ میرے ساتھ دوسری طالبات نے ہنس کر ٹال دیا، مگر میرا تو سکون ختم ہوگیا۔ اس قدر صدمہ ہوا کہ مجھے اپنی ذات، اپنا ذہن، اپنی شکل سب کچھ برا لگنے لگا۔ مزاج بھی چڑچڑا ہوگیا۔ بہت مشکل سے یونیورسٹی جانا شروع کیا۔ دل چاہتا ہے پڑھنا چھوڑ دوں، تاکہ یہ بھول جاؤں کہ کبھی فیل بھی ہوئی تھی۔ مگر والدین مجھے مستقل سمجھا رہے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے تم پڑھو...... مگر...... بابا جی! کوئی ایسا تعویز دے دیں کہ میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ جائے۔

☆ بیٹی جمیلہ! اگر پڑھنا چھوڑ دوگی تو یہ کبھی بھول نہ پاؤ گی کہ فیل ہوئی تھیں بلکہ جب بھی تعلیم کے حوالے سے ذہن میں کوئی بات آئے گی تو فیل ہونے کا ناگوار احساس بھی ہوگا۔ یقیناً تم پاس ہوسکتی ہو جن پرچوں میں نمبر کم ہیں دوبارہ محنت کرکے امتحان دو، پاس ہونے کے لیے اس بار زیادہ توجہ اور یکسوئی سے مطالعہ کرکے دیکھو، تجربہ اچھا رہے گا۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی صورتحال میں مزاج کو پُرسکون رکھنا ضروری ہے۔ بدمزاجی اہل خانہ کو ناگوار گزرتی ہے۔ اس طرح تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں، اس وقت کوئی حوصلہ بھی نہیں دیتا۔ فیل ہونے پر افسوس ہونا چاہیے تاکہ دوبارہ امتحان کی پہلے سے زیادہ اچھی طرح تیاری کی جائے لیکن اتنا صدمہ نہ ہو کہ اپنی ذات بری لگنے لگے۔ یہ ڈیپریشن کی علامت ہے لہٰذا اس کیفیت سے ہر ممکن بچو۔ اور نماز کی پابندی کو یقینی بناؤ اور اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے بعد ہر نماز کے بعد ''یا علیم'' کی تسبیح ایک بار ضرور پڑھو۔ خدا کے حکم سے ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔

□ نور بھٹو۔ فتح جنگ

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ آپ بہت سے لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ میں بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ میری شادی کو سات سال ہوگئے ہیں اور میں اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ بچوں کی تعلیم وغیرہ بھی صحیح جا رہی تھی۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ میری ساس اور نند دونوں نے مل کر میرے شوہر کو گاؤں لوٹ جانے پر مجبور کیا ہے۔ میری ساس بھی گاؤں میں رہتی ہیں۔ میرے شوہر فتح جنگ ہی میں سرکاری ملازمت کرتے ہیں۔ میں نے جب انکار کیا تو میرے سسرال والوں نے مجھے زبردستی گاؤں جانے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں گاؤں میں نہیں رہنا چاہتی کیوں کہ میری ساس اور نند بہت سخت ہیں اور ہر وقت جھگڑتی رہتی ہیں۔ میں اس قسم کا ماحول پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا آپ میرے لیے ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میں اس مصیبت سے بچ سکوں۔

☆ بیٹی نور! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہیں اس معاملے میں بہت تحمل اور سکون سے اپنے شوہر سے بات کرنی چاہیے، بہرحال شہر میں گاؤں کے مقابلے میں پڑھنے لکھنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد ایک بارہ سورہ آل عمران پڑھو پھر اپنے اوپر دم کرلو۔ اس کے بعد مناسب موقعہ دیکھ کر شوہر سے

بات کروانشاءاللہ ضرور بات بن جائے گی۔
□ صائمہ حشمت۔حیدرآباد
o بابا جی! خدا آپ کو سلامت رکھے۔ بابا جی میرا سب سے بڑا مسئلہ میرا موٹاپا ہے، اللہ کے واسطے اس مسئلے کا حل بتائیں۔ کوئی دوا تجویز کردیں میں بہت پریشان ہوں۔ میری عمر 35 سال ہے۔ قد نارمل ہے۔
☆بیٹی صائمہ! موٹاپے کا سب سے پہلا علاج چہل قدمی ہے۔ اگر گھر میں زینہ ہے تو ہر کھانے کے بعد پانچ مرتبہ ایک منزل کو چڑھا اترا کرو۔ اس کے علاوہ چکنائی زہر قاتل ہے۔ موٹاپے کے لیے دوا تیار ہے "سچی کہانیاں" کے آفس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔
□ عظمیٰ ناصر۔کالاپل، کراچی
o محترم بابا جی! السلام علیکم۔ میری بہن شیخوپورہ میں رہتی ہیں۔ میری شادی کراچی میں ہوئی ہے۔ انہوں نے آپ کا ذکر اتنی محبت اور عقیدت سے کیا کہ میں حیران ہوگئی۔ میری نند کا نام روبینہ ہے۔ ان کی شادی کی بات چیت عین موقع پر ختم ہوجاتی ہے یہ مسئلہ کئی بار ہوچکا ہے۔ آپ بذریعہ استخارہ اس کا حل تجویز کریں۔ اگر کسی عمل کی ضرورت ہے تو تجویز فرمادیجیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔
☆بیٹی عظمیٰ! تمہاری نند کی شادی کے معاملات میں بندش ہے اس سے کہو "یا فتاح یا لطیف" 313 مرتبہ بعد نماز عشا اول آخر 11-11 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دعا کرلے۔ اس کے لیے تعویذ آفس سے منگوالو۔
□ روحی ناز۔فیصل آباد
☆بیٹی روحی امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر مبارک قبول کرو! یہ تعویذ اور اللہ کے کلام کی برکت کے ساتھ ساتھ تمہاری محنت اور تعلیم پر توجہ دینے کا نتیجہ ہے۔ تمہاری جانب سے مٹھائی اور پھولوں کا تحفہ بذریعہ TCS موصول ہوگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مزید کامیابیوں سے نوازیں۔
□ نمرہ انصاری۔کراچی
o بابا جی! السلام علیکم آپ کی دعا سے منگنی ہوگئی ہے پاپا بہت خوش ہیں۔ بیس برسوں کے بعد دونوں بھائیوں میں ملاپ ہوگیا ہے اور یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ جب سارے معاملے طے ہوگئے تو میں نے پاپا کو آپ کے تعویذ اور وظیفے کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت متاثر ہوئے اور کہتے ہیں کہ میری طرف سے بھی بابا جی کا شکریہ ادا کردینا۔ آپ کے لیے چھوٹا سا تحفہ حاضر ہے۔ قبول کرکے عزت افزائی کیجیے گا۔ آپ کی دعاؤں کی ہمیشہ محتاج۔
☆بیٹی نمرہ۔ ابو اور گھر گھر والوں کو میری طرف سے سلام اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ تمام بہن بھائیوں کو محبت کے دانوں میں پرو کے رکھے اور باہمی غلط فہمیوں کو دور کردے۔ منگنی میں طوالت نہ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ جلد از جلد شادی کی خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین)
□ شہزاد۔گھوٹکی
o بابا جی! میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی چچی سے ہر بات کہہ دیتا ہوں، ان کی مجھ سے بہت دوستی ہے۔ دراصل میرے چچا تقریباً میری عمر کے ہیں۔ حال ہی میں میری شادی ہوئی تو بیوی نے چچی کو وہ مقام نہیں دیا جس کی میں توقع کررہا تھا، بلکہ اسے اعتراض ہوا تو میں نے ڈانٹ دیا کہ اس معاملے میں تم نہ بولو۔ اب میں دیکھتا ہوں وہ اکیلی بیٹھی باتیں کرتی ہے۔ مجھے دیکھ کر نظر انداز کردیتی ہے یا پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ہے۔ میری امی اس کی حمایت کرتی ہیں جبکہ چچی کہتی ہیں یہ ڈرامہ کررہی ہے۔ مجھے لگتا ہے شادی سے پہلے ہی سے وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔ بتائیں بابا جی میں کیا کروں، کوئی عمل بتائیں کہ میری بیوی چچی کی بھی عزت کرے اور پھر سے ٹھیک ہوجائے نارمل لائف گزارے۔
☆بیٹا! اپنی بیوی کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو، اگر وہ اپنے خالو یا پھوپا یا بہنوئی سے اس قدر بے تکلف ہو جتنے کہ تم چچی سے ہو تو کیا محسوس کرو گے اور پھر بیوی کو کیا کچھ نہیں کہو گے۔ ہوسکتا ہے ملنے اور بات کرنے پر پابندی لگادو۔ رشتوں میں احترام ہونا چاہیے، والدہ کی بات سمجھنے کی کوشش کرو اور چچی کی باتوں میں نہ آؤ۔ کوئی لڑکی اپنی خوشی سے خود کو نفسیاتی مریضہ ظاہر نہیں کرے گی۔ یقیناً اسے ذہنی اذیت

ہوئی ہے۔ جہاں تک شادی سے پہلے نفسیاتی مریضہ ہونے یا نہ ہونے کی بات ہے تو اس پر سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی مثبت باتیں ذہن میں لاؤ جن سے بیوی کے ساتھ تعلقات مضبوط ہوں۔ آفس سے فوری طور پر تعویذ منگوالو۔ اپنی بیوی کے تکیے میں رکھ کر سی دو اور نماز کی پابندی کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح ''یا جبار'' کی پڑھ کر بیوی پر دم کرو سب مسئلے اللہ حل کر دے گا۔

□ حنیف احمد۔ چکوال

o محترم بابا جی! السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے۔ بابا جی! میں آپ کی خدمت میں ایک مسئلہ لے کر حاضر ہو رہا ہوں امید ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں گے۔ میں ایک پڑھا لکھا اور برسر روزگار نوجوان ہوں۔ میری عمر تقریباً تیس سال ہے اور میرے گھر والے میری شادی کے لیے بہت فکر مند ہیں، وہ مجھ سے میری پسند کی لڑکی کا پوچھتے ہیں، مگر میں نے ایک پڑھا لکھا فرمانبردار بیٹا ہونے کی حیثیت سے یہ فیصلہ گھر والوں پر چھوڑا ہوا تھا، لیکن اب انہوں نے یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے اور مجھے سے بار بار میری پسند کی لڑکی کا پوچھتے ہیں...... بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکی سے یکطرفہ محبت کرتا ہوں، میں اس کے اخلاق و عادات سے بہت متاثر ہوں، وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اور اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں، وہ اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے اور ہمارے گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی ہے۔ میں نے اس سے آج تک بات نہیں کی ہے۔ بابا جی! کوئی ایسا آسان اور آزمودہ وظیفہ بتائیں کہ میری اس سے شادی ہو جائے کیوں کہ میرے گھر والے تو میری پسند سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں اور وہ اسے قبول بھی کر لیں گے، مگر اس کے گھر والے بھی مان جائیں اور ہماری شادی جلد از جلد ہو جائے۔ بابا جی! ضرور مہربانی فرما کر کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میری مشکل حل ہو جائے آپ کا زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔

☆ بیٹے حنیف! تمہارا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنی والدہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دو، یہ تمہارا حق بھی ہے۔ وہ رشتہ لے کر لڑکی کے گھر جائیں، وہ یقیناً یہ رشتہ قبول کر لیں گے۔ بس صرف نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور ہر حال میں خوش رہو۔

□ ناز پروین۔ راولپنڈی

o پیارے بابا جی! ہم لوگ 35 سال بعد سعودی عرب سے وطن واپس آئے ہیں۔ اپنا الگ گھر بنایا کہ سکون ملے گا لیکن یہاں ساس، سسر اور غیر شادی شدہ نندیں سب ہی آ کر رہنے لگے۔ میرے شوہر ان کے بڑے بھائی ہیں، اس لیے ہر ایک اپنا حق سمجھتا ہے۔ میں خود بھی عمر کے اس حصے میں ہوں کہ سکون چاہیے۔ ایک وہ وقت تھا جب 20 سال کی عمر تھی اور اپنا ملک چھوڑ دیا تھا اور اب سب کی موجودگی مجھے پاگل کیے دیتی ہے جبکہ میرے شوہر بہت خوش ہیں۔ وہاں وہ بیمار رہتے تھے اور اب تو جیسے ان کو نئی زندگی مل گئی۔ مجھ سے کہتے ہیں تم بھی اپنے بہن بھائیوں سے ملا کرو لیکن مجھے لوگوں سے ملنے کی زیادہ عادت نہیں۔ میرا چھوٹا بیٹا پیروں سے معذور ہے۔ وہ بھی خوش ہے، بابا جی! میرا مسئلہ حل کریں، میں بہت پریشان ہوں۔

☆ بیٹی۔ یہ تو بہت حوصلہ افزا بات ہے کہ آپ اپنی کیفیت کا شعور رکھتی ہیں۔ تم نے اپنی عمر کا ذکر کیا یہ بہت اہم ہے۔ اس عمر میں یعنی 45 سے 50 سال کے درمیان خواتین میں فیملی ہارمونز کی کمی ہو جاتی ہے جس سے ذہنی کیفیت پر اثر پڑتا ہے، مزاج بھی چڑچڑا ہونے لگتا ہے، اس کے ساتھ ڈپریشن کی علامات بھی ظاہر ہو سکتی ہیں۔ گھٹن، گھبراہٹ، بے چینی، مایوسی وغیرہ۔ اکثر اوقات یہ کیفیت وقت گزرنے کے ساتھ قدرتی طور پر ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن جسم میں گرمی کا احساس زیادہ ہو، پسینہ زیادہ آتا ہو، گھبراہٹ بڑھ جائے جو کسی بھی طرح کنٹرول نہ ہو تو سمجھ لیں کہ ہارمونز کی کمی ہو رہی ہے۔ جہاں تک رشتے داروں کے حوالے سے پریشانی کی بات ہے تو اس سلسلے میں دل بڑا کرو، کچھ ذہن سے کام لو۔ ان لوگوں کا بھی اپنے بھائی پر حق ہے۔ شوہر خوش ہیں،

اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ اپنے سکون کے لیے گھر میں ایک گوشہ ایسا رکھو جہاں جب چاہو آرام کرو، کوئی مداخلت نہ ہو۔ اپنے بہن بھائیوں سے ضرور ملو، اس سے مزاج میں بہتری آئے گی۔ نماز کی پابندی کرو اور نمازِ ظہر کے بعد 41 دن تک تین بار "یا جبار" کی تسبیح ضرور پڑھو انشاء اللہ خدا رحم فرمائے گا۔

□ شاہینہ بلوچ۔ساکرو

o بابا جی! السلام علیکم۔ گزارش یہ ہے کہ میں پہلے بھی آپ کو دو عدد خط لکھ چکی ہوں، مگر آپ نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ بابا جی! یا تو مجھے خط لکھنا نہیں آتا، یا آپ غریب اور مجبور لوگوں کو جواب نہیں دیتے۔ میں ایک بار پھر اس امید پر آپ کو خط لکھ رہی ہوں کہ آپ میرے اس خط کا جواب ضرور دیں گے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر نے لاٹری ڈال کر ایک ایک پائی جوڑی تھی کہ برے وقت میں یہ پیسے ہمارے کام آئیں گے، لیکن میری ساس نے یہ رقم میرے نندوئی کو یہ کہہ کر دلوادی کہ وہ کاروبار کررہا ہے اور تمہاری رقم چھ مہینے میں دے دیں گے، لیکن بابا جی! آج اس بات کو دو سال ہوگئے ہیں لیکن میرے نندوئی ہماری رقم دینے کو تیار نہیں، ہم جب بھی بات کرتے ہیں تو وہ ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں۔ بابا جی! مہربانی کرکے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے کرنے سے میرے نندوئی ہماری رقم دینے کے لیے تیار ہوجائیں۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔

☆ بیٹی! کیا والدین اپنی اس اولاد کو زیادہ چاہتے ہیں جو مالی طور پر مضبوط ہوتی ہے اور جو اولاد مالی طور پر کمزور ہوجاتی ہے اس کو دھتکار دیا جاتا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ تم سب میری اولاد کی طرح ہو۔ اگر اتنی جلدی متنفر ہوجاؤ گی تو زندگی کیسے گزرے گی۔ بعض اوقات خط نہیں پہنچ پاتے۔ ورنہ مجھ تک جو خطوط بھی پہنچتے ہیں، میں ان کے جواب ضرور دیتا ہوں۔ بہر حال بیٹی! تم نماز فجر اور عشا کے بعد ایک ایک بار سورۂ مائدہ پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ گل رُخ۔باجوڑ

o بابا جی! اللہ آپ کو بہت لمبی عمر عطا فرمائے۔ میرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے۔ میری شادی کو 7 سال ہوچکے ہیں مگر آج تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے شوہر نے کہہ دیا ہے کہ وہ اب بہت عرصے انتظار نہیں کرسکتے۔ وہ مجھے تو نہیں چھوڑیں گے مگر دوسری شادی ضرور کریں گے۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں، سارا دن روتی ہوں۔ بابا جی! اگر میرے اولاد نہیں تو کیا اس میں میرا قصور ہے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرے شوہر میں کوئی کمی ہو اور میں اسے چھوڑ دوں۔ بابا جی! آپ کو اللہ کا واسطہ میرے حال پر رحم فرمائیں۔

☆ بیٹی گل! اللہ تمہیں جلد اولاد کی نعمت سے نوازے۔ اللہ کے سامنے گڑگڑا کر دعا مانگو وہ ضرور عطا کرے گا۔ کیوں اس کی رحمت سے مایوس ہو؟ مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو میں تمہیں تعویذ ارسال کروں گا۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ بس بیٹی تم نماز پابندی سے ادا کرو اور حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔

□ آمنہ خاتون۔کراچی

o بابا جی! میری بیٹی کی شادی ہوئی، ایک سال بعد بچی کی پیدائش ہوئی، اس کی بیٹی بہت خوب صورت گوری اور نیلی آنکھوں والی تھی۔ میرے داماد نے میری بیٹی پر طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کردیے۔ دراصل وہ سارے لوگ بہت سانولے اور بدصورت ہیں۔ شاید میں ان کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہ کرتی، مگر انہوں نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی، وہ بیمار رہنے لگی مگر شوہر کا گھر نہ چھوڑا۔ اس کی بچی کو نمونیہ ہوگیا تو باپ اسپتال لے کر نہیں گیا۔ بچی دو ہفتے میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس کے بعد سے بیٹی میرے گھر پر ہے، ہر وقت روتی ہے، بہت دبلی ہوگئی ہے۔ سسرال کے نام سے ڈرتی ہے، شوہر آتا ہے تو چھپ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر گھر نہیں آؤ گی تو طلاق دے دوں۔ بتائیے میں کیا کروں اپنی بیٹی کا گھر بھی بچانا چاہتی ہوں اور اُسے اُن ظالموں کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتی۔ بابا جی!

خدا کے واسطے کچھ کریں۔

☆بیٹی! ایک ایسا شخص جس کے دل میں رحم نہ ہو، جو اپنی اولاد کو اپنا ماننے پر تیار نہ ہو، بیوی کو طلاق کی دھمکی دے رہا ہو، کسی بھی طرح اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ ساری عمر گزری جائے۔ بیٹی کی ہمت تھی جو اتنا وقت بھی گزار لیا۔ ہمت کرو اور انہیں بتا دو کہ تم ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہو۔ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے ہم اپنی بیٹی کو نہیں بھیج سکتے۔ بیٹی کو اطمینان دلاؤ کہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جائے گی۔ وہ نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے، اسے اتنی ہمت دیں کہ وہ چھپنے کے بجائے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے۔ باقی ایک تعویذ فوری طور پر تیار کر دیا ہے۔ آفس سے فون کر کے فوراً منگوالو۔ باقی نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ نماز فجر کے بعد سات سات بار ''یامُذِلُّ'' کی تسبیح 41 دن تک تم اور بیٹی دونوں پڑھو، خدا حالات میں خود بہتری پیدا کر دے گا۔

□ افضا خانم، پتوکی

o پیارے بابا جی! السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے، آمین۔ بابا جی! میں نے آپ کو اس سے پہلے ایک خط لکھا تھا اور آپ نے چالیس دن کا وظیفہ دیا تھا۔ بابا جی! میں نے وظیفہ مکمل کر لیا ہے اور آپ نے چالیس دن بعد دوبارہ خط لکھنے کو کہا تھا۔ بابا جی! اب بتائیں وظیفہ جاری رکھوں یا چھوڑ دوں۔ میں نے وظیفہ کاروبار میں برکت کے لیے لیا تھا، اللہ کا شکر ہے کاروبار ٹھیک چل رہا ہے۔ بابا جی! میرا ایک اور مسئلہ بھی ہے وہ یہ ہے کہ میرے سر کے بال پہلے ہی بہت کم ہیں اور اب تو بال گر رہے ہیں۔ پلیز بابا جی! آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے سر کے بال لمبے اور گھنے ہو جائیں، برائے کرم میرے مسائل کا حل بتا دیں۔ آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔ میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

بیٹی افضا! بس اب وظیفہ ترک کر دو۔ صرف نماز کی پابندی رکھو۔ زندگی میں خوش رہنا چاہتی ہو تو نیک کام کرو۔ والدین کی فرمانبرداری، اللہ کی اطاعت اور چھوٹوں سے شفقت، یہ رویے تمہیں بہت خوشیاں عطا کریں گے۔ نماز پابندی سے ادا کرتی رہو، بالوں کے سلسلے میں علاج تجویز کیا جا رہا ہے۔ تم اس سے استفادہ کر سکتی ہو، آفس فون کر کے تیل منگوالو۔

□ شمسہ کنول۔ لاہور

o بابا جی! میرے شوہر دبئی میں ہیں۔ شادی کو ایک سال ہوا ہے، اب وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ میں خود بھی وہاں جانے میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی وہاں شروع سے ان کے ساتھ ہے۔ میرے لیے انہوں نے علیحدہ گھر لیا ہے، مگر پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ پہلی بیوی میرے ساتھ لڑائی کرے گی۔ ان کے بچے بھی بڑے ہیں۔ سنا ہے وہ بہت بیمار ہیں۔ انہوں نے خود اپنے شوہر کو دوسری شادی کے لیے کہا تھا۔ مجھے یہ بات سوچتے سوچتے ایک ماہ ہو گیا ہے کہ پتا نہیں کیوں میں نے ایسے شخص سے شادی کر لی۔ اب میں کیا کروں بابا جی! میں سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ کیسے اس مسئلے سے چھٹکارا حاصل کروں۔

☆بیٹی! ان رشتوں میں کچھ ایسی باتیں ہمیشہ سے سنتے سنتے ذہن ایسا بن جاتا ہے کہ پتا نہیں دوسری بیوی کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا۔ دوسری بیوی پہلی بیوی سے ڈرتی ہے اور پہلی بیوی دوسری بیوی سے گھبراتی ہے کہ میرا شوہر اب میرا نہیں رہا۔ گھر علیحدہ ہونے سے مسائل میں کمی آتی ہے اور دونوں بیویاں خود مختاری کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہیں۔ اس میں شوہر کا کردار بہت اہم ہے کہ وہ انصاف کرے۔ تم خود اچھی طرح رہو گی تو وہ مسائل نہ ہوں گے جن کا ڈر ہے۔ ویسے بھی پہلی بیوی تو بیمار ہے۔ اس کا خیال رکھ لیا یا طبیعت پوچھ لی تو یہ نیکی ہوگی اور نیکی کے کام میں پہل کرنا چاہیے۔ تم بھی بغیر گھبرائے اُن کے پاس چلی جاؤ۔ ہر جمعرات کو بعد نمازِ عصر سورۃ مریم کی تلاوت کرو۔ نماز کی پابندی کرو اور نمازِ عصر کے بعد ''یا وہابُ'' کی تسبیح پڑھو۔ 41 دن تک یہ عمل جاری رکھنا۔

□ معراج الدین۔ صادق آباد
○ بابا جی! السلام علیکم۔ میں نے تقریباً دو سال پہلے آپ سے اپنی بہنوں کی اچھی جگہ شادی کے لیے دعا اور وظیفے کے لیے کہا تھا، لیکن تاحال ان کی شادیوں میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی اب تو رشتے آنے بھی بند ہوگئے ہیں۔ اس وقت آپ نے وظیفہ بتایا تھا کہ تین تسبیح ''یابدیع السموت والارض'' اول و آخر 3 بار درود شریف بعد نماز عشاء پڑھوں'' لیکن اس وظیفے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ دوسرا مالی طور پر ہمارے حالات اتنے خراب ہوگئے ہیں کہ دو وقت کا کھانا کھانے کے لیے بھی قرض لینا پڑتا ہے، ان حالات میں بہنوں کے رشتے آ بھی گئے تو شادیاں کیسے ہوں گی۔ میرے کسی جاننے والے نے بتایا ہے کہ میرے اوپر، میری ممانیوں نے کالا جادو کروایا ہے جس کی وجہ سے بہنوں کے رشتوں میں اور ہر کام میں رکاوٹیں ہیں۔ آپ استخارہ کرکے بتایئے کہ کیا واقعی انہوں نے ہم پہ جادو کروایا ہے اور بہنوں کی شادیاں کب تک ہوجائیں گی اور دعا ضرور کیجیے گا۔

☆ بیٹے معراج! وظائف اگر نماز کی پابندی کے ساتھ کیے جائیں تو ضرور کامیابی عطا ہوتی ہے۔ اکثر معاملات میں تاخیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی کے لیے بھی بدگمانی مت لاؤ۔ بس اپنے معاملے اللہ کے سپرد کردو۔ مثبت سوچ رکھو۔ والدہ سے کہو نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ مزمل ضرور پڑھیں اور دعا کریں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ زاہدہ۔ شیخوپورہ
○ بابا جی! میں نرسنگ کی ٹریننگ کررہی ہوں۔ شروع میں بہت محنت کرنی پڑی، اب صرف چھ ماہ باقی ہیں۔ چھوٹی ایک بہن کی شادی ہوگئی ہے۔ دکھ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش نہیں۔ اس کے سسرال سے میرا رشتہ آیا ہے اور گھر والے تیار ہیں۔ میں مسلسل انکار کررہی ہوں کیونکہ بہن کا حال سامنے ہے۔ امی کہتی ہیں تمہیں بھی نوکری نہیں کرنی ہے، ہم کسی اسپتال میں ملازمت نہیں کروائیں گے۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں کیونکہ میں اپنی بہن کی طرح محتاجی کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی۔ کئی روز سے میرے سر میں مستقل درد سا بیٹھ گیا ہے۔ بہت درد ہے سر میں، بابا جی! پلیز کوئی ایسا عمل بتائیں تعویذ دیں کہ مسئلہ خود بخود حل ہوجائے۔

☆ بیٹی زاہدہ۔ بعض اوقات شدید ذہنی دباؤ میں سر درد کی شکایت ہوجاتی ہے۔ تم غلط نہیں سوچ رہیں۔ ہر لڑکی کو حق ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرکے اچھی زندگی گزارے۔ والدہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے انہیں یقین دلاؤ کہ تم کو شادی سے انکار نہیں لیکن وہ جہاں کرنا چاہ رہی ہیں وہاں نہ کریں۔ کم از کم فی الحال اس رشتے کو قبول نہ کریں یا خاموشی اختیار کرلیں۔ چھ ماہ بعد تمہاری ٹریننگ مکمل ہوجائے گی، سرٹیفکیٹ پاس ہوگا، پھر چاہے جاب کرو یا نہ کرو۔ ہوسکتا ہے اس دوران کوئی اور بہتر رشتہ آجائے۔ والدہ تمہاری بات سمجھ جائیں گی تو سب گھر والوں کو سمجھانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ تم بس نماز کی پابندی کرو اور نماز عشا کے بعد ''یاسمیع، یاحفیظ'' کی تین تین بار تسبیح کو معمول بنالو، خدا سارے حالات سازگار کردے گا۔

□ نورین۔ ڈیرہ اسماعیل خان
○ بابا جی! کچھ عرصہ قبل ہم دونوں یونیورسٹی میں سارا دن ساتھ گزارتے، جب کلاسز ختم ہوئیں، میں نے جانا چھوڑ دیا۔ لڑکے نے بار بار مجھے فون کیا کہ کسی کام کے بہانے سے آجاؤ، کہیں ساتھ بیٹھ جائیں گے مگر میں نے انکار کردیا۔ پہلے یونیورسٹی جانے کا مقصد تھا، اب یونہی سیر و تفریح یا وقت گزاری کو میرا دل نہ مانتا۔ ایک روز اس کا فون آیا کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر جارہا ہے اور وجہ میں ہوں۔ اگر میں اس سے ملتی رہتی تو وہ نہ جاتا۔ اس کے بعد سے مجھے احساسِ جرم ستانے لگا کہ میری وجہ سے کوئی لڑکا یہ ملک چھوڑ دے گا، خود کو سزا دے گا، اپنی زندگی مشکل میں ڈال دے گا، مجھ سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ اس کے بعد نہ اس کا دوبارہ فون آیا اور نہ میں نے رابطہ کیا۔ ویسے میں سچ بتاؤں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اسے روک لوں۔ بابا جی! مجھے بتایئے کہ کیا میں غلط ہوں اور ایسا کوئی عمل بھی بتائیں کہ خدا ہم

دونوں کی جائز خواہشات پوری کردے۔ بابا جی! میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆بیٹی! اب تک تم نے جس اعتماد سے خود پر کنٹرول رکھا ہے، آئندہ بھی اسی کا مظاہرہ کرنا۔ ایک فون آجانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ غلط فیصلہ کرلیا جائے۔ احساسِ جرم تو اُس کو ہونا چاہیے جو بلا مقصد وقت گزاری کرنا چاہتا تھا۔ تمہارے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ بہانے نہیں بنائے۔ اس طرح کی زندگی جو لڑکیاں گزارتی ہیں، وہ بہت دشواریوں کا شکار ہوجاتی ہیں اور خاص طور پر ایسے لڑکے جو ایک گھر پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو سکون سے نہ رہنے دیں، جب وہ ان کے ساتھ گھر سے باہر گھومے پھرے گی تو مزید احساسِ جرم کا شکار بنائیں گے۔ اسے ملک سے باہر اپنے کسی کام سے جانا ہوگا۔ اس کی مرضی ہے، اپنی زندگی آسان بنائے یا مشکل، اس سے تم کو فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد ایک تسبیح ''یا سلام'' کی پڑھ کر خود پر دم کرلو۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

□ ماہم بخاری۔ آسٹریلیا

○ بابا جی! میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی خط لکھا تھا مگر آپ نے جواب نہیں دیا۔ میں جانتی ہوں کہ میرا مسئلہ بہت شرم ناک ہے مگر آپ ہی بتایئے میں کس سے مشورہ مانگوں۔ میں اپنے بہنوئی سے محبت کرتی تھی وہ مجھ سے پندرہ سال بڑے ہیں۔ بہن کو جب ان حالات کا اندازہ ہوا تو اس نے بہت ہنگامہ کیا۔ بابا جی! یہ سچ ہے کہ ابتدا میں میرے بہنوئی میرے حق میں نہ تھے مگر میں نے انہیں اپنی جانب مائل کرلیا۔ چھ ماہ قبل انہوں نے میرے کہنے پر بہن کو طلاق دے دی اور مجھ سے نکاح کرلیا۔ میرے والدین مجھ سے ہر قسم کا تعلق توڑ چکے ہیں، مگر میں پھر بھی خوش تھی لیکن اب کچھ دنوں سے میرے شوہر اپنی سابقہ بیوی یعنی میری بہن اور اپنے بیٹے کو جو اس وقت 7 سال کا ہے بہت یاد کرتے ہیں اور اکثر اوقات مجھ سے بہت چڑ جاتے ہیں۔ آپ مجھے ایسا تعویذ دیں جس کی وجہ سے وہ میرے قابو میں رہیں۔ میں نے سب کو چھوڑ کر ان کو حاصل کیا ہے اب کھونا نہیں چاہتی۔

☆بیٹی ماہم! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ کسی کا گھر برباد کرکے تم کبھی آباد نہیں رہ سکتیں جب کہ وہ کوئی اور نہیں تمہاری اپنی بہن اور بھانجا ہیں۔ جب تم اپنے خون سے مخلص ہی نہیں تو غیر کے ساتھ کیسے مخلص ہوگی۔ یہ بات تمہارے شوہر کو اب سمجھ آئی ہے۔ جس کو تم محبت کہہ رہی ہو وہ محبت نہیں بلکہ رقابت اور جنون تھا۔ تم مانو یا نہ مانو مگر اس سارے سلسلے میں صرف ایک شخص برباد ہوا اور وہ تم ہو۔ تمہاری بہن کے پاس اس کے والدین ہیں، اولاد ہے اور لوگوں کی ہمدردیاں، تمہارے پاس کیا ہے؟ دکھ اس بات کا ہے کہ تم اب بھی نادم نہیں ہو۔ جس دن تم اپنے کیے پر پچھتاؤ گی اس دن تمہارے لیے توبہ کے دروازے کھلیں گے۔ ابھی صرف تمہارے لیے دکھ اور نقصان ہیں۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ میں تمہیں صرف یہ نصیحت کروں گا کہ اللہ کے سامنے سر جھکایا کرو شاید کرم ہوجائے۔

□ غزالہ انور۔ چیچہ وطنی

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ خیریت بخیریت۔ بابا جی! عرض یہ ہے کہ میرے 3 بچے ہیں (ماشاء اللہ) سب سے بڑی بیٹی ہے جو فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہے۔ وہ پڑھائی میں بہت کم توجہ دیتی ہے۔ ہر وقت موڈ خراب رکھتی ہے۔ کسی کی بات نہیں مانتی۔ جھوٹ بھی بولتی ہے۔ میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں بیٹی ذات ہے۔ کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔ آپ سے درخواست ہے اس کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں کہ وہ ٹھیک ہوجائے اور اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔

☆بیٹی غزالہ۔ تمہارا مسئلہ یقیناً بہت غور طلب ہے۔ بچیاں ہوں یا بچے یہ رویے بڑھتی عمر کے ساتھ خطرناک ہوجاتے ہیں۔ مناسب ہوگا بیٹی کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھو۔ اس سے پوچھو کہ اس کو کیا مسئلہ ہے۔ تم نماز فجر، عصر اور عشا کے بعد 3-3 تسبیح پڑھو۔

''ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو''

اوّل و آخر درود شریف 3-3 بار پڑھو پھر دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

☆......☆

سخن آباد

صلح

آؤ!
مل کر ہم بانٹ لیتے ہیں
وہ دُکھ جو اُلفت میں پائے ہیں
"ہم نے"

شاعر: شناس گل۔ رحیم یار خان

شیشے کا گھر

احساس کے آبگینے سنبھال رکھنا!
اور ہاں......
وہ شیشے کا گھر!
جس کی مکینیں، بہت چنچل ہیں......
خدارا، تم......
ان کی شوخی بھی، برقرار رکھنا!

عمارہ جاوید، کراچی

میں اور تم

تنہا رات، برستی برسات بھیگی پلکیں......
میں اور تم......
کھلی کتاب......سوکھے گلاب......
میں اور تم......
سرد جذبات ناکام محبت......
ادھوری بات......
میں اور تم......
چاندنی راتیں......تنہا چاند......
میں اور تم......

ثانیہ ثانی۔ سیالکوٹ

اُلجھن

سُلگ سُلگ کر سُلگتی رہی میں رات بھر
اپنے آپ سے اُلجھتی رہی میں رات بھر
خوف تھا مجھے تیرے بچھڑ جانے کا اے دوست
سوچ کر یہ کانپتی رہی میں رات بھر
تیری وفاؤں پہ گماں تھا کے بدل جاؤ گے تم
اُداس ہو کر جاگتی رہی میں رات بھر
تیری راہیں تکتے تکتے بڑی دیر ہوگئی مجھے
نظروں کے کنکر اُچھالتی رہی میں رات بھر
کبھی پیار کبھی غصہ آتا رہا مجھے تم پر
دانتوں سے دانت کاٹتی رہی میں رات بھر
تیری دوری نے تو میری سوچوں کو الجھا
بے وفا تو بھی نہیں کہتی رہی میں رات بھر
علی وفاؤں کو مت پرکھ زمانے کی نظروں سے
شمع بن کر تو جلتی رہی میں رات بھر

علی رضا عمرانی۔ سجاول

غزل

تیری چاہت کو بھلا دل سے بھلاؤں کیسے
عکس آنکھوں سے تیرا اپنی مٹاؤں کیسے
تیری چاہت، میرا ایمان، عبادت میری
ہونٹ کھلتے ہی نہیں تجھ کو بتاؤں کیسے
تیرا ہی قبضہ میرے دل پر، میری روح پر ہے

دل میں اب غیر کی تصویر سجاؤں کیسے
ساون آیا ہے مگر تو نہیں آیا اب تک
گیت برہا کے بتا تجھ کو سناؤں کیسے
تو مجھے بھول گئی میں نہ تجھے بھول سکا
بات دُنیا کو بتا، اپنی بتاؤں کیسے
ارسلان بخش۔ بنوں

بہار

بہار تیرے کرم کے چرچے
سُنے ہیں بوڑھوں سے شاعروں سے
جہاں گردوں سے زائروں سے
بقول اُن کے
بہار تُو جس چمن میں آئے
کلی کلی پہ نکھار چھائے
گلوں کے دل میں سرور بھر دے
شجر شجر میں تُو نور بھر دے
میرے بھی اس بے قرار مَن کو
میرے گلستاں میرے چمن کو
میرے نشیمن...... میرے وطن کو
بہار آ کر قرار دے دے
ترس رہے ہیں جو اک خوشی کو
انہیں تو خوشیاں ہزار دے دے
محمد آصف ریاض، جھنگ صدر

غزل

ٹوٹی ہوئی پرکار سے آگے نکلے
دل اب تو رخِ یار سے آگے نکلے
دونوں ہی بچھڑتے ہوئے چھپ کر روئے
دونوں ہی نہ انکار سے آگے نکلے
بازو ہیں کشادہ، مرا دشمن پہلے
بہتر ہے کہ تلوار سے آگے نکلے
یہ بکتے ہوئے حسن سے کہہ دو جا کر
اب گرمئی بازار سے آگے نکلے
ہجرت کی گھڑی گاؤں سے جانے والے
روتے ہوئے اشجار سے آگے نکلے
سورج نے ستارے وہی نگلے آخر
سورج کی جو رفتار سے آگے نکلے
پھر گھر وہ پلٹ کر نہیں آئے بابر
بچے جونہی دیوار سے آگے نکلے
شاعر: احمد سجاد بابر۔ لودھراں

انا

انا اُسے بھی عزیز تھی
اور
جھکا میں بھی نہیں
نتیجہ!!
ہم دونوں
جدا ہو گئے......
وقاص حسین: رحیم یار خان

آخری خواہش

مہندی سے اپنے ہاتھوں پر
ہر عید پر
میرا نام جو تم لکھا
کرتی تھیں......!
اور ان خوب صورت ہاتھوں پر
میرا نام سجا کر تم
چوما کرتی تھیں
سنو سجنی......!
میری اک آخری خواہش ہے
کسی کا ہونے سے پہلے
آخری بار مہندی سے اپنے ہاتھوں پر
میرا نام لکھ دینا
آخری بار چوم لینا

پھر کسی کی تم ہو جانا......!!

شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

کوشش

تمہارے شہر سے نکلے ہیں یہ دھیان رہے
کہ اب کے تم کو نہیں چھوڑا ہے اکیلے پھر
ہزاروں یاد کے جگنو، محبتوں کے سنور
اور اپنے پیار کا سم پھونک کر چلے ہیں ہم
مہکتے صفحے ہوں یا کارڈ "I Miss You" کے
ہمیشہ بھیجتے رہتے تھے ہم تمہارے لیے
ہمیشہ جاتے سے آخری دن Date اپنے ناخن سے
تمہارے صحن کی دیوار پر لکھتے تھے ہم،
رات کی سیاہی میں جب چاند روشنی دیتا
تمہارا عکس، تمہارے لبوں کو چھوتا ہوا
تمہارے لمس میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا
چاند کے دودھیا سے ہالے میں
مگر کریں بھی کیا اے دلبر، دل جاناں
تمہارے شہر کے موسم جلا چکے ہم کو
اب اور حوصلہ بھی تو نہیں رہا ہم کو
دیار یار میں رہ کے بھی اجنبی سے رہیں
تو کیوں نہ رخت سفر باندھ ہی لیں ہم اب کے
جہاں رہیں گے تمہیں یاد کا آنچل دیں گے
تراش لیں گے کسی بت کو ہم تمہاری طرح
ہزاروں یاد کے جگنو کریں گے روشن اُسے
محبتوں کے سنور پائلیں بنیں گے پھر
اور پھر پیار کا سم بت کو زندہ کردے گا
تمہارے واسطے الفاظ کے ذخیرے سب
مہکتے صفحوں پر ناچنے لگیں گے پھر
وہ سارے کارڈ Miss u, Love u کے
محبتوں کا نگر خوب پھر سجا دیں گے
تمہارا عکس ہر جگہ پہ جا بجا ہوگا
مگر ابھی ذرا سا انتظار کرنا ہے

تمہارے شہر سے باہر ابھی نکلنا ہے

محمد شہزاد کنول۔ شارجہ دبئی

غزل

زندگی میں بارہا ایسے حادثے رہے
آنکھیں سوتی رہی خواب جاگتے رہے
قاتل باب نظر میں تھا اور اہل نظر
شہر میں خدو خال ڈھونڈتے رہے
ستارے بھی اتر آئے شوقِ وصال میں
چاند تیرے نام کے ہم ٹالتے رہے
جاگیرِ غم مسلسل مسندِ شاہی رہی
غم ملتے رہے غم سنبھالتے رہے
اس درجہ اسیر عقیدت رہے
وہ کہتے گئے ہم مانتے رہے
محرومیاں جب سے گھر مہماں ہوئیں
درد ورد بام سے جھانکتے رہے
آرائشِ جمالِ یار حسن کی اوٹ میں
آئینے شہر بھر کے تجھے دیکھتے رہے
جمع تفریق کا عمل جاری رہا عامر
دُکھ ڈالتے رہے سکھ نکالتے رہے

عامر زمان عامر۔ بورے والا

وہ لڑکی

دن بھر ہنستی مسکراتی
کسی گل کی طرح کھلکھلاتی
وہ لڑکی
جب شام ڈھلتی ہے تو
گلی میں کھلنے والی کھڑکی میں
اک دیا رکھتی ہے
اور پھر ساری رات
ہوا سے لڑتی ہے
جانے!

کس کا رستہ تکتی ہے

شاہد فراز۔ بکر

غزل

چاندنی پھیلی ہوئی ہے ضو فشاں ہے مہتاب
پھر تصور میں کسی کی یاد آئی بے حساب
پھر کھلیں دل میں میرے ماضی کی ساری کھڑکیاں
مجھ کو تنگ کرنے لگے تیری محبت کے سراب
رات دن گزرے ہیں میرے کچھ اس طرح بے چین سے
بھر گئی دُکھ اور غم سے سارے جیون کی کتاب
جس نے توڑا دل میرا اس سے بھی تو پوچھے کوئی
مجھ سے ہی کیوں مانگتے ہیں سب خطاؤں کے حساب
اب دل مضطر مرا تو اس طرح مرجھا گیا
جیسے رکھا ہو کتابوں میں کوئی سوکھا گلاب
اب تو میرے پاس باقی عمر کی نقدی نہیں
کیسے کروں اس دُکھ کی لمبی سی مسافت کا حساب
آگے کا سفر ہے اب اور رب سے بچی تو میری
تم کو چاہ کر پایا میں نے کتنے نفلوں کا ثواب

شاعرہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

نئی کونپلیں

اجنبی شہر تھا اجنبی لوگ تھے
نہ ہم کسی کے اپنے تھے
نہ ہمارا کوئی اپنا تھا
محبت نامی جذبے نے جنم لیا پھر
زندگی!!
زندگی یوں مسکرانے لگی
چلتے چلتے قدم رک گئے
وہ جو محبت کا رشتہ ہوا تھا
نجانے کیوں ٹوٹ گیا
ایک ہی شخص تھا ہمارا

وہ بھی روٹھ گیا ہم سے
اتنے سارے لوگوں میں
کل بھی ہم تنہا تھے آج بھی تنہا ہیں!

مور شاہد حسین۔ قمر، بلوچستان

نظم

پاک وطن کے پیارے لوگو اُٹھ کھڑے ہو جاؤ
قومی دولت لوٹنے والوں کو اب سبق سکھاؤ
غربت کی تاریکی میں نہ اپنا خون جلاؤ
چپ چپ رہنا چھوڑو اپنے سوئے ضمیر جگاؤ
ہیں منافق لیڈرشپ سے اپنا ملک بچاؤ
بحر ظلمت سے نکلے گی جب تمہاری ناؤ
اِن کا ایک ہی کام ہے لُوٹو مال وزر بناؤ
لُوٹ کے لیے جاؤ یورپ اور لندن میں مزے اڑاؤ
اِن کے جھوٹے وعدوں، قسموں، باتوں پہ نہ جاؤ
تریسٹھ سال سے ہو رہا ہے کھاؤ پیو ٹرخاؤ
بدمزا سے ہو کے رہ گئے جیون کے سبھاؤ
دل مجروح پہ گہرے گہرے پڑ چکے ہیں گھاؤ
رائی برابر چیز کا ہو جب پربت جتنا بھاؤ
اس گرانی میں اِنساں کو کیوں نہ آئے تاؤ
آدم خور مہنگائی میں آٹا دس روپے کا پاؤ
حکمرانوں کو کیا ہے، جی آ چاہے مٹی کھاؤ

عبدالعزیز جی آ۔ چکوال

چاند

چاند ہو تم
میں جانتا ہوں
جان مری میں مانتا ہوں
اسی لیے انداز تیرے
کبھی خوشیاں اور کبھی تھوڑے غم
گھٹتی بڑھتی محبت تری
بس چاند ہی ہے

طاہر اقبال۔ بورے والا

اِس ماہ کی خاص کہانی

یہ رشتہ و پیوند

بانو قدسیہ

محبت کے کئی روپ ہوتے ہیں، ان میں سے ایک ایسا روپ
جو آپ نے شاید پہلے کبھی نہ پڑھا ہو

ادب سرائے سے ایک لازوال کہانی

اردو کی کلاس جاری تھی۔
پہلی قطار میں پانچ دمینتی روپ لڑکیاں اور باقی کرسیوں پر چھبیس جگت رنگ لڑکے بیٹھے تھے۔
پروفیسر صمدانی نے دیوانِ غالب میں بائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت نشانی کے طور پر پھنسائی اور کھرج در آواز میں بولا۔
''مس سرتاج، سبک سر کے کیا معنی ہیں؟''
جب سے سرتاج نے بی ایس سی میں داخلہ لیا تھا۔ پروفیسر صمدانی کا ہر سوال سدرشن چکر کی طرح گھوم پھر کر سرتاج تک ہی آلوٹتا تھا۔ یوں تو ان سوالات کی وہ عادی ہوچکی تھی، لیکن مزاج پُرسی کے اس انوکھے ڈھب پر آج وہ پچھاڑی مارنے پر آمادہ ہوگئی۔
''سر، میں نے اُردو اوپشنل لے رکھا ہے۔''
''پھر بھی کوشش کیجیے۔''
لڑکوں کی ٹولی میں نظروں کے پروانے اور مسکراہٹوں کے ایکسپریس تار دیے جانے لگے۔
اُدھر سرتاج پر آج بے خوفی کا دورہ تھا۔
''میں نے دسویں تک کانونٹ میں تعلیم پائی ہے سر۔ مجھے اُردو نہیں آتی۔''
''سبکی کے تو معنی آتے ہی ہوں گے؟'' یہ سوال پوچھ کر پروفیسر صمدانی خود بہت محظوظ ہوا۔ لڑکوں کے چھتے میں دبے قہقہوں کی بھنبھناہٹ اٹھی۔ سامنے قطار میں بیٹھی کبوتریاں دوپٹوں میں منہ دیے کریز کرنے لگیں۔
سرتاج کی زمردیں آنکھوں پر نمی کی ہلکی سی تہہ چڑھ گئی۔ اس نے پروفیسر صمدانی کی طرف نگاہ ڈالی اور چپ ہوگئی۔
شامتِ سراج پر چند لمحے خوش ہوکر پروفیسر آگے نکل گیا اور ''شمارِ سبحہ مرغوب مشکل پسند'' کی تشریح کرنے میں پہلوانوں کی سی مشقت دکھانے لگا لیکن سجاد کی نظریں اُس بت مشکل پسند پر جمی ہوئی تھیں جو ناخنوں پر سے کیوٹکس چھیلنے میں مشغول تھا۔
وہ آج بھی حسبِ معمول سرتاج کے پیچھے بیٹھا تھا یوں جان بوجھ کر ہر روز سرتاج کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو گو کسی اور نے معیوب نہ سمجھا لیکن وہ خود مجرم فراری کی طرح ہر لحظہ اپنے آپ کو معیوب سمجھتا رہتا۔
شعر کے ساتھ جاپانی کشتی کے داؤ دکھا کر پروفیسر صمدانی کو پسینہ سا آگیا لیکن شعر ایسا سخت جان تھا کہ پھر خم ٹھونکے، منہ کھولے، تشنہ لب سامنے کھڑا تھا۔ پروفیسر صمدانی نے ایک بار پھر سرتاج کو تختہ مشق بنا کر کہا ''دیکھیے



مس سرتاج آپ اُردو کی طرف زیادہ توجہ دیا کریں۔ یہ لاکھ آپ کی اختیاری زبان سہی لیکن بالآخر آپ کی قومی زبان بھی ہے۔"

ترویج اُردو پر یہ فخریہ جملہ مقطع کا بند ثابت ہوا اور اسی وقت گھنٹی بج گئی۔ پروفیسر صمدانی نے میز سے کتابیں اٹھائیں، رومال سے ہاتھوں کو جھاڑا اور کلاس سے یوں نکلا جیسے سکندر اعظم پابہ زنجیر پورس سے ملنے جا رہا ہو۔ حاکم ضلع کے جاتے ہی ساری کلاس حاضرات کا جلسہ بن گئی۔ صرف سجاد اپنی سیٹ پر گم صم بیٹھا تھا اور اس کی اگلی کرسی پر سر جھکائے سرتاج کاپی پر ہمپٹی ڈمپٹی کی تصویر بنا رہی تھی۔

سجاد پر سرتاج کی آمد کا عجیب اثر ہوا تھا۔ جس کالج میں تین سال وہ نٹوں کی طرح تار پر سیدھا چلتا آیا تھا اُسی کالج میں اب اسے ہر جگہ اپنے وارنٹ گرفتاری چپکے نظر آتے تھے۔

ادھر سرتاج کا وجود ساری کلاس میں ایسے تھا جیسے عشاء کی نماز میں وتر۔ کلاس میں، ملی جلی بھی اور سب سے الگ تھلگ بھی۔ باقی گدھے رنگی لڑکیوں میں اُس کی رنگت کچے ناریل کی طرح دودھیا نظر آتی تھی۔ بڑی بڑی تیلیا مونگیا آنکھیں جن پر شوں شوں کرتی پردہ پوش پلکیں۔ صد برگ جیسا کھلا کھلا چہرہ، شفاف انار دانوں سے بھرا ہوا چھوٹا سا دہن۔ وہ تو سچے سچے سراندیپ کی سروپ نکھار نظر آتی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر تپسیا کرتے کرتے سجاد کا دل پوست کے ڈوڈے کی طرح اَن گنت بیجوں سے اٹ گیا۔ سجاد ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا لیکن کچھ تو فطرتاً شرمیلا دبکیلا تھا، پھر بچپن سے نگاہیں نیچی رکھنے اور محرم اور نامحرم کی تفریق ایسی گھٹی میں پڑی تھی کہ کسی لڑکی سے بات کرتے روح فنا ہوتی تھی۔

اُدھر سرتاج محمود غزنوی کی طرح پے در پے حملے کرتی چلی جا رہی تھی۔ بی ایس سی میں داخلہ لیتے ہی کمپنی بہادر کی حکومت چلا دی۔ سرتاج سکہ رائج الوقت قرار پائی۔ کچھ تو خداداد حسن مرعوب کرتا، کچھ کانونٹ کے لہجے کی انگریزی مارا مار کرتی، کچھ شائستگی اور نسوانی پن کا ہلہ منہ توڑ دیتا۔ بے چارا سجاد محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ ہرن ہو کر شیر کے گھاٹ پر پانی پینے آ اترا ہو۔

باقی سارا وقت تو سرتاج کا عمل دخل رہتا تھا لیکن پروفیسر صمدانی کی کلاس میں وہ چھچھوندر کی طرح چھچھتی پھرتی۔ اُردو کی کلاس میں اس کے کان کی لویں سرخ قمقمے کی طرح جل اٹھتیں۔ سبزہ رنگ آنکھوں پر بادل چھا جاتے۔ دودھیا رنگت کبھی سرسوں کی طرح پھول اٹھتی کبھی شنگرفی ہو جاتی۔ صمدانی صاحب کو بھی جانے کیا کد تھی کہ ہر مشکل لفظ اُسی سے پوچھتے۔ ہر شعر کا آغاز انجام اسی پر ہوتا۔ کھڑکی دار پگڑی جیسی بانکی، مٹی کے عطر جیسی شام انگیز، پارے کے کشتے جیسی نایاب لڑکی جب ایسی معتوب ٹھہرتی تو سجاد کا دل غصے سے بھر جاتا وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا پروفیسر صمدانی کو مارنے کے کئی منصوبے بناتا لیکن بے چارا پشتینی امیروں کی طرح کم ہمت اور کم کوش تھا۔ رات کو سینے پر آیت الکرسی دم کرتا تب کہیں نیند آتی۔ صبح اٹھتے ہی سورۃ الناس کا ورد نہ کر لیتا تو دن بھر وسوسوں کا شکار رہتا۔ سرتاج سے مراسم بڑھانے اور پروفیسر صمدانی کو مگدر سے مارنے کے پلان تلملا تلملا کر رہ جاتے۔

جب سجاد کے دل میں تمناؤں کی نمکولیاں اتنی لگ گئیں کہ دل کا ڈنٹھل بوجھ سے ٹوٹنے لگا تو وہ دن رات نمازیں پڑھنے لگا۔ وہ ان تمناؤں کو دل سے یوں نوچا کرتا جیسے بچے گلاب کی پتیاں توڑا کرتے ہیں۔ اُسے ان تمناؤں کے نجس ہونے کا پورا یقین تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہاتھ ملانے کی بجائے ہاتھ کٹوانے کو احسن سمجھتے ہیں۔ وہ سرتاج سے بھولی بھالی منقطر، بے لوث، لاتعلق محبت کرنا چاہتا تھا لیکن بُرے بُرے خیال نہ جانے کیوں آپی آپ سر نکال بیٹھتے۔ تاجی کی آنکھیں، انار دانوں سے بھرا دہن، دودھیا رنگت، کوندے کی طرح اُس کی طرف بڑھتے۔ وہ مقناطیسی کشش کے تحت اُن کی طرف بڑھتا اور کوڑھ کا مرض جان کر پیچھے ہٹتا۔ اس کش مکش میں اُس کا دل بجھ جاتا۔ منہ کا مزا رانجھی کی طرح بے کیف ہو جاتا اور جسم میں درد ہونے لگتا۔ نہ پڑھائی میں دل لگتا نہ سیر سپاٹے پر ہی مائل ہوتا۔ وہی دوست جو ابھی پچھلے سال تک اس کی زندگی کو تل شکری بنائے ہوئے تھے۔ اب کودن، بے حس، ہنسوڑ اور چغد سے نظر آتے۔ دوستوں کی منڈلیاں، کافی ہاؤس کے پھیرے، کالج کی محفلیں ختم ہو گئیں تو سرتاج سے متعلق سوچ اور بھی نارسا ہو گئی۔

اود بلاؤ کی اس ڈھیری کا قصہ چکاتے چکاتے اب وہ بالکل بُوم خصلت ہوگیا تھا۔ نہ تو گھر والوں کے ساتھ کھانا کھاتا نہ امی ابا کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کرتا۔ اب تو کالج سے انجمن ساز نگاہیں اس کے ساتھ لوٹتیں۔ وہ سر جھٹکتا، لاحول پڑھتا اپنے کمرے میں چلا جاتا لیکن تیلیا مونگیا نگاہیں آلتی پالتی مار اُس کے پلنگ پر آ بیٹھتیں۔ وہ لاکھ جی کو سمجھاتا کہ سرتاج اندراین کا پھل ہے۔ فقط دیکھنے کی چیز لیکن نصیحتوں کا اندوختہ خالی ہوجاتا اور دل کی پیچ ختم نہ ہوتی۔

ایک دن اسی الجھن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اُس نے ایک خوب صورت نیلا پیڈ نکالا اور اس کو تھوڑی سی خوش بو لگائی پھر اس کاغذ کو پھاڑ کر پُرزے پُرزے کردیا وہ سرتاج سے عشق کا اظہار تھوڑی کررہا تھا۔

اُس کی محبت تو بے لوث اچھوتی اور جراثیم سے بالکل پاک تھی۔

خوش بو لگانے والی حس کو تاپے تلے بند کر کے اُس نے پھر کاغذ قلم سنبھالا۔ کئی کاغذ پھاڑ چکنے کے بعد جو تحریر قلم زد ہوئی وہ کچھ ایسی تھی۔

''سرتاج!''

میرا خط پاکر تمہیں حیرت ہوگی۔ شاید تم خفا بھی ہوجاؤ لیکن خدارا مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ میں کالج کے عام لڑکوں کی طرح تم سے چھچھوری محبت نہیں کرتا۔ میری محبت کنچن چنگا کی چوٹیوں سے مشابہ ہے، ارفع، اچھوتی پاک۔ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، خدا جانتا برسوں کی ایک کمی پوری ہوگئی، خدا نے مجھے کوئی بہن نہیں دی۔ ایک بھائی ہے سو وہ بھی ملٹری میں ہے۔ سال بھر



بعد جب آتا ہے تو وہ فاصلے عبور نہیں کیے جاسکتے جو اس کی عدم موجودگی پیدا کرتی ہے۔ سرتاج! کیا تم میری بہن بننا گوارا کرو گی؟ بولو سرتاج! کیا تم مجھے اپنا بھائی بناؤ گی؟ آہ سرتاج کہو کیا میں اتنا خوش نصیب ہوسکتا ہوں کہ ہم دونوں بہن بھائی بن سکیں۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔

تمہارا بھائی۔

"سجاد"

خط لکھ کر وہ مطمئن ہوگیا جیسے سینے کا ایکس رے صاف نکل آئے، اب گندے خیالات کا دھواں آپ ہی آپ دود کش سے نکلنے لگا اور صاف بے داغ آگ سینے میں دہک اٹھی۔

یہ خط اس نے دوسرے دن کیمسٹری کے پریکٹیکل کے بعد کاپی میں چھپا کر دیا۔ وہ اکیلی برآمدے میں چلی جارہی تھی جب سجاد اس کے برابر پہنچ گیا وہ نخلِ تابوت کی طرح خوب صورت لیکن بے جان ہورہا تھا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اور تلووں میں جلن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"مس سرتاج!"

"کیا ہے؟" مس سرتاج نے مڑ کر دیکھا۔

اب تک شوق کا ابلق سجاد کے زانوؤں تلے تھا لیکن "کیا ہے" کا تازیانہ لگتے ہی رخشِ تمنا بے قابو ہوگیا۔ بہت ہی چاہا کہ زقند بھرتا بڑھتا چلا جائے لیکن پچھنی کھا کر گر گیا۔ بڑی بے چین آواز میں بولا۔ "مس اگر آپ خفا نہ ہوں تو......"

"بات کیا ہے؟" آری کٹاری آواز میں سرتاج نے پوچھا۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں سن رہی ہوں...... فرمائیے!"

"میں نے اس خط میں اپنا مفہوم بیان کردیا ہے، تفصیل کے ساتھ۔" سجاد نے اپنی پریکٹیکل کی کاپی آگے بڑھا دی۔

شاید سرتاج نے گالی کے لیے منہ کھولا تھا اور چانٹا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن اسی وقت پیچھے سے لڑکوں کے قہقہے کا ایک ریلا آنکلا اور نہ جانے کیا سوچ کر تاجی نے کاپی پکڑ لی۔ سجاد کی ٹانگیں خوشی اور خوف سے سنگ لرزاں کی طرح کانپنے لگیں۔ اُس نے نہ تو سرتاج کی طرف مڑ کر دیکھا اور نہ کسی کلاس میں جانے کی تکلیف کی، بلکہ سیدھا گھر واپس آیا اور رضائی لے کر لیٹ رہا۔ اس پر خفقان کی سی کیفیت طاری تھی اور ایک ایک کی دس دس چیزیں نظر آتی تھیں۔ دوسرے روز سرتاج نے اسے پہلی گھنٹی کے بعد ہی برآمدے میں پکڑ لیا۔

"پہلے یہ بتائیے کہ آپ مجھے کیوں بہن بنانا چاہتے ہیں؟" فضا میں مجیرے بجنے لگے۔

"کیوں کہ میری کوئی بہن نہیں ہے۔" نظریں نیچی کر کے سجاد بولا۔

"لیکن کلاس میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں۔ آپ اُن میں سے کسی کو بہن کیوں نہیں بنا لیتے؟"

اس کلاجنگ کا جواب اُس نے پہلے نہ سوچا تھا۔ منمنا کر بولا۔ "جی اس لیے کہ...... کہ اُن کو دیکھ کر میرے دل میں وہ جذبات نہیں اُبھرتے جو......"

"جو مجھے دیکھ کر اُبھرتے ہیں۔" وہ جملہ ختم کرنے میں بڑی تیز تھی۔

"جی۔"

"سوچ لیجیے بہن بنانا آسان ہے یہ رشتہ نبھانا مشکل ہے۔"

"آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گی۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

بھائی بہن بننے کی جزئیات جب ختم ہوگئیں تو سرتاج مسکرا کر بولی۔ "عجیب بات ہے خدا نے آپ کو بہن نہیں دی اور مجھ کو بھائی عطا نہیں کیا۔ ہم دونوں کی کمی پوری ہوگئی۔ آج تک تو جس کسی نے بات کی اس نے دل میں کھوٹ رکھ کر ہی کلام کیا۔"

بادِ موافق پا کر سجاد کا دل بادبانوں کی طرح کھل اٹھا گھر پہنچ کر پہلی بار اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ سیٹی بجاتے ہوئے وضو کیا اور شکرانے کے نفل پڑھنے کے بعد قلم دیکھنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت وہ سرتاج کو اپنی بہن کے روپ میں ہر طرف بکھری ہوئی پا رہا تھا۔ بہن کی باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں سے گندے خیالات کی حرمل دل کی مقطر آگ میں آگری۔ تڑتڑ جلنے کا شور اٹھا اور چمنی اندھے دھوئیں سے بھر گئی۔ یہ بُرے بُرے خیالات سرتاج کے وجود پر چھاپا مارنا چاہتے تھے۔ سجاد نے بہت سر پٹخا۔ طبیعت کی نکیل پکڑ کر درست کرنا چاہا لیکن یہ خیالات پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔ یتیم خانے

سے آئے ہوئے وردی پوش مانگنے والوں کی طرح گھر در کے وارث بن کر کھڑے ہو گئے۔ ان سے بچتا بچاتا سجاد انار کلی جا پہنچا۔

جب وہ رات گئے گھر لوٹا تو اس کے پاس سرتاج کے لیے بائیس جوئلز کی چھوٹی سی نازک گھڑی تھی۔

کالج چھوٹنے کے بعد وہ سرتاج کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ بہن کے تعاقب میں اس کے پیروں کو لغزش محسوس نہ ہو رہی تھی۔

"میں...... میں آپ کے لیے کچھ لایا ہوں۔"

اس بار سرتاج ذرا بھی نہ بدکی، بلکہ بڑے احترام سے راستہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

سجاد نے جیب میں سے گھڑی کی لمبوتری ڈبیا نکالی، ڈھکنا کھولا اور تحفہ سرتاج تک بڑھا دیا۔ نیلی مخملیں سطح پر اسٹین لیس اسٹیل کی نازک گھڑی ٹکٹکا رہی تھی اور اس پر کاغذ کی چھوٹی سی ایک کترن پڑی تھی۔

سرتاج نے ڈبیا پکڑی تو اس کا وجود مکمل سپاس گزاری کا اشتہار بن گیا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی، خمیدہ ٹانگیں کنہیا روپ آگے پیچھے۔ اس نے کترن کو اٹھایا اس پر رقم تھا۔ "اپنی بہت ہی پیاری بہن کے لیے۔"

بڑی رقت کے ساتھ سرتاج گھڑی کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "خدا کی قسم یہ بہت زیادہ ہے سجاد بھائی۔"

بھائی لفظ کی ادائیگی اس نازک دہن پر بھاری نامانوس اور اجنبی سی لگی۔

"ایک بھائی اپنی بہن کے لیے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہو سکتا۔"

سپاس نامہ اب تمام تر آنکھوں میں آ بسا۔ "بہت بہت شکریہ، لیکن اماں خفا ہوں گی۔"

نہ جانے کیسے بزدلی کی معیاد مقررہ ختم ہو گئی اور سجاد دلیری سے بولا۔ "میں خود اماں سے مل کر معافی مانگ لوں گا۔"

"ہائے سچ!...... آپ آئیں گے ہمارے گھر؟"

"بہن بلائے اور بھائی نہ آئے یہ کبھی ہوا ہے۔"

بُرے بُرے خیال اس کے جی کو سلسلانے لگے اور وہ بار بار بہن بھائی کے رشتے کو ان خیالات کی روشنی میں پرکھنے لگا۔ سرتاج نے کاپی کھولی اور پنسل سے اس پر لائنیں کھینچنے لگی۔ ساتھ والے صفحے پر ہمپٹی ڈمپٹی کی تصویر سجاد کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"یہاں سے آپ داہنے ہاتھ مڑ جائیے سامنے چھوٹا سا بازار ہے۔ اسے گزر جائیے سارا پھر کٹ پیس کی دو چار دکانیں آئیں گی، آخر میں ایک ٹال بھی آئے گا بائیں ہاتھ، اس سے آگے ورکشاپ ہے موٹروں کا، عین اس کے سامنے ہمارا گھر ہے مکان نمبر 213...... یاد رہے گا نا آپ کو؟"

یہ بازار کٹ پیس کی دکانیں، ٹال، ورکشاپ، مکان نمبر 213 سب اس کے دل پر کندہ ہو گئے۔ یہ راستہ اسے جانا پہچانا نظر آنے لگا۔

"آپ ضرور آئیے گا۔" سرتاج نے اصرار کیا۔

اس کی نظریں ہریل طوطوں پر جمی تھیں۔ ایسی سبز سبز آنکھیں اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

"کیا ہوا بھائی جان؟" سجاد کی محویت دیکھ کر سرتاج بولی۔

"بس ایسے ہی اپنی خوش نصیبی پر رشک آ رہا ہے، ایسی پیاری بہن قسمت اچھی ہو تو ملتی ہے۔"

سرتاج کھلکھلا دی۔ اڑتی فاختہ کا جوڑا سجاد کی نظروں میں گھومنے لگا۔

اس واقعے کے بعد سرتاج کے گھر جانے کی راہ تو بن گئی لیکن سجاد ہاتھی کا پاٹھا تھا۔ آنکس مارے بغیر ایک قدم فیل خانے سے باہر نہ نکال سکتا تھا۔ رات رات بھر ہاتھوں دل بڑھاتا۔ صبح اٹھتا تو سارے ارادوں کی ہوائیاں چھوٹی ہوتیں۔

سرتاج پر منہ بولے بھائی بنانے کا الگ اثر ہوا۔ دراصل وہ ازلی عورت کی طرح بڑی نڈر اور ارادے کی پکی تھی۔ کہاں تو گدھے رنگی لڑکیوں میں بیٹھی ہمپٹی ڈمپٹی بنائی رہتی اور اب اس نے پہلی قطار چھوڑ دوسری قطار میں سجاد کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ باقی لڑکے اس نئی تبدیلی پر جز بز تو بہت ہوئے لیکن ہو ہا کرنے کے سوائے کچھ ہاتھ نہ آیا، کیوں کہ جس ڈھنگ سے سرتاج نے سجاد کو اپنا بلونگڑا بنا لیا تھا، اس کے سامنے کسی کی پیش نہ جاتی تھی۔

سرتاج کی قربت نے سجاد پر عجیب اثر کر رکھا تھا۔ ایوننگ ان پیرس، سانگری اور ارکارنیشن کے پھولوں کی

ملی جلی خوش بو ہر لمحے پاس والی کرسی سے پارسیوں کی آگ بن کر دہکتی رہتی۔ یہ مخلوط خوشبو بڑی سان چڑھی تھی۔ بار بار اس خوشبو کا سانپ اسے اپنے ذہن سے اتارنا پڑتا۔ لاکھوں بار جی کو سمجھانا پڑتا کہ بہن کا رشتہ پاکیزہ اور پُرعظمت ہے۔ ایسے رشتوں کا خوشبوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔

باقی سارے دریودھن تو دروپدی کو کھو کر خاموش ہو بیٹھے لیکن ادریس کی مشکلات اور پوزیشن مختلف تھی۔ اس کی حیثیت میر کارواں جیسی تھی۔ سرتاج کو کسی دوسرے کے ہاتھ کا باز بنا دیکھا تو اس کے اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پہلے تو دو چار مرتبہ کھے اڑائی پھر تمسخر سے سجاد کو گانسنا چاہا لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی، کیوں کہ سجاد تو پہلے ہی چار قدم ہٹ جانے والا شخص تھا۔

یہ اسپورٹس ڈے کی بات ہے۔ سجاد سفید نیکر اور آستینوں والی بنیان پہنے گیلری میں آ رہا تھا کہ ادریس کھونچ لگا کر گزرا۔ سجاد ایک دم رُک گیا اور گہری نظروں سے ادریس کو دیکھ کر بولا۔ ”راستہ تو دیکھ کر چلا کر۔“

یہ جملہ التزاماً تخت کرنے کے لیے نہ کہا گیا تھا یہ اور بات ہے کہ ادریس کو ایسے موقعے کی تلاش تھی، ایک جست میں ادریس نے سجاد کو دھوبی پٹڑے کا شکار کیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔

”بات کیا ہے؟“ سجاد کے نرخرے سے مری ہوئی آواز آئی۔

”سرتاج کا خیال چھوڑ دو۔“

”سرتاج؟ کون سی سرتاج؟“

اس وقت واقعی اُس کے دماغ سے ہر نوعیت کی سرتاج نکل چکی تھی۔

”بنو مت! بس خیال چھوڑ دو ورنہ میں جان سے مار دوں گا۔“

”وہ...... وہ تو میری بہن ہے۔“ سونی نے کچے گھڑے پر ہاتھ مارا۔

زناٹے دار مکا جبڑے پر آ جما اور منہ میں لہو کی نمکینی اترا آئی۔ ”بہن وہن کا ڈھونگ نہیں چلے گا، بس کل سے خیال چھوڑ دو اس کا۔“

ادریس کی بدقسمتی سے اسی وقت سرتاج ادھر آ نکلی۔ پہلے تو ادبدا کر سجاد کے سینے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس پر طرۂ یہ کہ بھاگ جانے کے بجائے وہیں ٹکر ٹکر سرتاج کو دیکھنے لگا۔ ادریس کے اُٹھتے ہی سجاد ناک کھجاتا فلیٹ بوٹ جھاڑتا کچھ کچھ سویا جاگتا پیروں پر ہو گیا۔ لہو کی پتلی سی دھار اس کے ہونٹوں سے رسنے لگی تھی۔

سرتاج نے لمحے بھر میں سارے معاملے کا پڑتا لگایا اور بھرے ہاتھ کا وہ طمانچہ ادریس کے منہ پر رسید کیا کہ ساری گیلری اس بھداکے سے گونج اٹھی۔ کچھ لڑکیاں لڑکے کتابیں اٹھائے چلے آ رہے تھے اس فلمی منظر کو دیکھتے ہی وہ زعفران زار بن گئے۔ ادریس اس عروج معکوس سے کچھ اس طرح زچ ہوا کہ گیلری سے بھاگا تو پھر کالج سے مائیگریٹ کر کے ہی دم لیا۔ اس دن کے بعد سے وہ ایسا ذہنی ہو گیا تھا کہ جس لڑکی کا نام س سے شروع ہوتا اس سے کسی قسم کا علاقہ ہی نہ رکھتا۔

کچھ تو ادریس دبا کھا کر سجاد کا حوصلہ بڑھا گیا، کچھ سرتاج کا رویہ خردوں کا سا تھا۔ ہر کام میں وہ سجاد سے مشورہ لیتی، ہر معاملے میں اس کی رائے معلوم کرتی۔ اس رویے نے سجاد میں ایک درجہ خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اگر ادریس کا واقعہ پیش نہ آتا تو شاید سجاد چند مہینے اور مکان نمبر 213 تک نہ پہنچ سکتا، لیکن جب سے ادریس کا سا کھا جاتا رہا تھا، سرتاج نے کھلے بندوں سجاد کو سجاد بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔

سرتاج کا گھر پرانے گھروں کی طرح بند تھا۔ گھر لانے کی تقریب کوئی نہ تھی۔ وہ گھر سے یہاں آنے کا عزم بھی نہ کر کے آیا تھا لیکن نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جو اس روز اسے سرتاج کے ساتھ لے آئی۔

لکڑی کے بڑے پھاٹک پر وہ دونوں رُک گئے۔ سرتاج نے پاؤں سے ہیل والی جوتی اُتاری اور اس کی ایڑی کو بڑی طرح داری سے پھاٹک پر بجایا۔

”سارا دن ہیل والی جوتیوں میں انسان تھک جاتا ہے۔ ہے نا بھائی جان؟“

گو بھائی جان کو سارا دن ہیل والی جوتیوں میں گزارنے کا اتفاق نہ ہوا تھا لیکن اس نے بڑی فراخ دلی سے غیر مشروط طور پر بات مان لی۔

”بات کیا ہے بھائی جان؟“

سجاد کی نظریں اس وقت سرتاج کے ننگے پیروں پر تھیں۔ ایک جوتیاں اتار دینے سے اس میں گھریلو پن،

کیسی نسائیت اور کس قدر سپردگی بڑھ گئی تھی۔ جی ہی جی میں اس نے اپنے آپ پر نفریں بھیجی۔

"ہائے بتائیے ناں کیا بات ہے؟"

سجاد نے سر جھٹک کر گندے خیالات کو ذہن سے نکالا اور کھلنڈرے پن سے سرتاج کے سر پر چپت مار کر کہا "اور جو تجھ پگلی کو سب کچھ بتادوں تو پھر ہمارے پاس کیا باقی رہے گا۔"

سرتاج ہولے ہولے ہنسنے لگی۔

جس وقت سجاد کی انگلیاں اپنی جیب میں پہنچیں، اُن میں سرتاج کے سر کالمس انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ ننگے پیر کھڑی لڑکی کے پاؤں پڑتے ہی والا تھا کہ مکان کا بڑا دروازہ کھلا۔

"کون ہے؟" بھوبل جیسے بالوں والی عورت بولی۔

"ہم ہیں امیا۔ کب سے دروازہ بجا رہے ہیں، آپ کھولتی ہی نہیں ہیں۔"

"اچھا تاجی ہے۔ میں سمجھی وہ بجلی کاٹنے والے آئے ہیں پھر۔"

اس ایک جملے نے سجاد پر اس گھر کا سارا بینک بیلنس عیاں کر دیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے بڑی خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر سے باہر کھلی دوپہر تھی۔ بند آنگن میں گھستے ہی شامِ غریباں چھا گئی۔ آنگن کیا تھا چھتی کی طرح بند بند چاروں طرف دیواروں سے گھری تھوڑی سی خالی جگہ تھی۔ ایک جانب ہینڈ پمپ، پاس ہی ایندھن اور اُپلوں کا ڈھیر۔ ایک پرانے کموڈ کا ڈھانچہ اور دو چار ایسے گملے پڑے تھے جن میں مرجھائے ہوئے چنبیلی کے پودے تھے۔ ان تمام چیزوں سے ہٹ کر کونے میں لوہے کا ایک بوسیدہ سا پلنگ پڑا تھا جس پر کچھ بوریاں، چند پرانے کھوکھے اور دو چار کھانچے پڑے تھے۔ اس آنگن میں رُک کر تاجی نے کنکھیوں سے سجاد کی طرف دیکھا اور پھر اسے اندر لے گئی۔

یہ کمرہ بیٹھک، کھانا کمرہ، سلائی گھر اور استری خانہ سب کچھ تھا۔ ماضی کی امارت اور حال کی غربت بچھڑی بہنوں کی طرح گلے مل رہی تھیں۔ چھت پر پرانے زمانے کا انگلش دو پنکھیا سیلنگ فین تھا جس کی ہوا فرش پر بچھے ہوئے بوسیدہ قالین پر پڑتی تھی۔ صوفوں کے اسپرنگ اچھے تھے، لیکن پوشش پٹے ہوئے فیشن کی یاد دلاتی تھی۔ دیواروں پر پرانے کلینڈر، چغتائی کی تصویریں اور گجراتی گل دان لٹک رہے تھے۔ تاجی اسے امیا کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ حسنِ فرنگ کسی زمانے میں تاجی سے بھی زیادہ قہرماں ہوگا لیکن اب مصری ممی سے خوف آتا تھا۔

"تاجی کے والد پانچ سال ہوئے فوت ہو گئے، تب ہم لوگ ایران میں تھے۔"

"بڑا افسوس ہوا سُن کر۔"

مصری ممی بولی۔ "وہاں کی زندگی اور تھی۔ وہاں کے لوگ کچھ اور طرح کے تھے۔ وہاں تکلف اور دعوت کا رنگ عام زندگی پر غالب تھا۔ خیلے متشکرم۔ بندہ پروری است۔ ممنون دارم۔ وہاں ایسی باتیں تھیں، ازراہِ تملق نہیں ازراہِ ظاہرداری نہیں بیٹا، یہ وہاں کا مزاج تھا۔ ان کے بعد ہماری اپنے رشتے داروں سے بنی نہیں۔"

ممی پرانی یادوں میں کھو گئی۔

"تمہاری بہت باتیں کرتی ہے تاجی، میں نے کہا بیٹے بھائی کو گھر لاؤ تو ہم بھی دیکھیں۔"

سجاد کے دل میں خراس سی چلنے لگی، اس کا جی چاہا کہ اونچے اونچے کہے "امیا میرے دل میں۔ میرے دل میں نپٹ کھوٹ ہے، لیکن خیر!

"میری تاجی جب ایران میں تھی تو فر فر فارسی بولتی تھی۔ اب روز کہتی ہے کہ اُردو پڑھنے میں بھی دقت پیش آرہی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی تعلیم یہاں کی نہیں ہے۔ جو کچھ پڑھا ہے سو کانونٹ میں، بنیاد کمزور رہ گئی ہے۔"

اُسی وقت تاجی آگئی۔

اس نے کالج کا چُست اور خوب صورت لباس اتار دیا تھا اور اب میل خورے سے لباس میں فاختہ سی بے رنگ نظر آرہی تھی لیکن اس کا وجود ہی کچھ ایسا تھا کہ سجاد کے خیابانوں میں رنگ کا سیلاب آجاتا۔

"سکنجبین لیجیے۔"

سجاد نے نمکین مائل کم میٹھا نیبو پانی ڈگڈگا کر پی لیا۔

اس گھر میں غربت سرخ خوان پوش سے ڈھکی

ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں سجاد نے محسوس کیا کہ اس گھر میں وہ آسودگیاں نہیں جو اس کے تین منزلہ چپس کے فرشوں والے گھر میں ہیں، لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس گھر میں ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر عجیب راحت ہوتی۔ باورچی خانے کی چوکی پر بیٹھ کر توے سے اترتی روٹی کھا کر حلق تک خوشی بھر جاتی۔ دولت کے بعد اس گھر کا عجب لطف تھا جیسے پلاؤ قورمے کے بعد گڑ کی چھوٹی سی روڑی!

تاجی کے حُسن کی جماوٹ روڑے پر روڑا چڑھائے اونچی عمارت میں بدل رہی تھی۔ اس ایوان کا جلوہ وہ خود اپنی نظر بچا کر دیکھتا۔ تاجی کو دیکھ کر جو طوفان ناشکیبا اُس کے جی میں اُٹھتا، اس اُٹھتے تلاطم کو وہ کچھ ایسی ناطاقتی بخشتا، کچھ ایسی کمزوری عطا کرتا کہ ساری محبت ایک بول میں بھسم ہو جاتی۔

ایک دن مصری ممی نے بے تکلفی سے کہا۔ ''تم تاجی کو اُردو پڑھا دیا کرو۔ گھڑی دو گھڑی۔ وہ کوئی کم بخت پروفیسر صمدانی ہے خوامخواہ بے چاری کو تنگ کرتا ہے۔''

''نہ امیا خوامخواہ بھائی جان کا وقت ضائع ہوگا۔'' تاجی بولی۔

''تو ہم ماں بیٹے کی باتوں میں نہ بولا کر۔''

''ہاں...... پڑھا دوں گا جی...... ضرور پڑھا دوں گا۔''

وعدہ تو سجاد نے کھلے دل سے کر لیا لیکن دل یہ سوچ سوچ کر ہی نیم برشت ہوا جاتا تھا کہ روز...... ہر روز کون تاجی کے قرب کا یوں متحمل ہو سکے گا؟ اور بالفرض متحمل ہو بھی گیا تو وہ سب شعر، وہ ساری عشقیہ شاعری کس آواز میں کس طور پر سمجھانی ممکن ہے۔

پہلے ہی دن بدشگونی ہوئی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ہینڈ پمپ سے ہٹ کر لوہے کے پلنگ کے پاس تاجی نے میز لگائی، اس پر لٹھے کا میز پوش ڈالا، ٹیبل فین چلایا اور میز کے گرد دو کرسیاں رکھ کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ پنکھے کی ہوا تیز تھی اور وہ صرف فاسٹ پر ہی کام کرتا تھا۔ ساری ہوا تاجی کو چوم چاٹ کر سجاد تک آتی تھی۔ تاجی کا دوپٹا کبھی کاپی پر گرتا کبھی مچھیرے کے جال کی طرح سجاد کے منہ پر جا گرتا۔ پہلے تو تاجی نے اسے کانوں کے ارد گرد اڑسا، پھر اسے سر پر اکٹھا کیا، جب یوں بھی قابو میں نہ آیا تو اس نے اسے لوہے والے پلنگ پر پھینک دیا۔ سجاد کی نظریں ایک بار اٹھیں اور پھر تھو تھو کر کے اس نے انہیں کاپی پر چسپاں کر دیا۔

''کم بخت کو ذرا تمیز نہیں، بار بار بھائی جان کو تنگ کرتا ہے۔'' وہ دوپٹے کے بارے میں بولی۔

''کون کون سے شعر آج سمجھ نہیں آئے کالج میں۔'' اس نے سوال میں پپکی کو منہا کرتے ہوئے کہا۔

''یہ شعر پتا نہیں چلتا بھائی جان۔'' تاجی اٹک اٹک کر شعر پڑھنے لگی۔

''تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن!
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے''

سجاد نے تاجی کی طرف دیکھا۔ دوپٹا دو ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں جھکورے کھا رہا تھا۔ تاجی کے کھلے گریبان پر پیہم ہوا کی لُچیاں پڑ رہی تھیں۔ کندھے، سینہ، گردن ہوا کے دباؤ سے اطالوی بتوں کی طرح صحت مند اور جان دار لگ رہے تھے۔

سجاد نے یک دم نظریں جھکا لیں اور بولا۔ تاج بہن شعر کی دراصل ایک فضا ہوتی ہے جسے انسان کا احساس ٹٹول لیتا ہے۔ ابھی آپ میں وہ احساس پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے بہتر ہوگا اگر شعروں کی تشریح کرنے سے پہلے چند دن روزانہ پانچ شعر یاد کر لیا کریں۔ کچھ دنوں میں آپ کی بیک گراؤنڈ بن جائے گی، پھر آپ کو شعر سمجھنے میں کچھ ایسی دقت محسوس نہ ہوگی۔''

پہلے دن پڑھانے کی فضا کچھ ایسی نازک ہو گئی تھی کہ جلد ہی سجاد کو گھر لوٹ جانا پڑا۔ دوسرے دن پہلے تو سجاد پڑھانے کے مرحلے یاد کر کے بدکتا رہا۔ جتنی زیادہ ٹھنڈے آنگن کی یاد بھڑکتی، اسی قدر وہ اس نکتۂ شیریں سے ڈرتا تھا، لیکن جب صبر کا یارا نہ رہا تو اس نے اپنی موٹر سائیکل نکالی اور مکان نمبر 213 کی طرف چل دیا۔

آنگن میں پہلے ہی ٹیبل فین فل اسپیڈ پر چل رہا تھا۔ آج تاجی نے بال دھو رکھے تھے اور ہوا سے کچھ ہٹ کر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے بال فضا میں تیر رہے تھے۔ جل پری کی طرح ہیلمٹ کی اوفیلیا کی مانند۔

''بھائی جان! میں نے چھ شعر یاد کیے ہیں آپ سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے، سچ۔''

سلطان علاؤالدین خلجی

1309ء میں سلطان علاؤالدین خلجی نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اشیائے صرف اور اجناس خورد و نوش کی قیمتیں متعین کیں۔ سلطان نے اپنی سلطنت میں جگہ جگہ اناج کے سرکاری ذخیرے بنوا دیے۔ ہر ضروری مقام پر منڈیاں قائم کر دیں اور ہر منڈی کا انتظام ایک قابل اور دیانت دار منتظم کے حوالے کیا۔ سلطان نے ہر مقام پر اپنے جاسوس مقرر کر رکھے تھے اگر کوئی شخص نرخ یا تول میں ذرا سی بھی بددیانتی کرتا تھا تو اس کی اطلاع سلطان کو فوراً پہنچ جاتی تھی اور مجرم کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی کے اس نظام نے پورے ہندوستان کو ایک فلاحی مملکت میں تبدیل کر دیا تھا۔

سجاد ڈرا ڈرا کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ تاجی فرفر شعر سنانے لگی۔ سجاد کی سیاہ عینک میز کے کنارے پڑی تھی، تاجی نے شعر سُنا کر اسے اٹھا لیا اور سانس کی نم دے کر اسے پونچھنے لگی۔

''اس شعر کے معنی مجھے سمجھ نہیں آئے بھائی جان

ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

''ابرام کے معنی جانتی ہو۔ تاج بہن؟'' بہن کا لفظ بڑی مشکل سے نکلا۔

''جی نہیں۔'' سبزہ رنگ آنکھیں بھی ساتھ ہی بولیں۔

''کسی ڈکشنری میں اس کے معنی دیکھے تھے؟''

''فیروز اللغات میں اس کے معنی نہیں ملے۔ بھائی جان۔''

''اچھا۔''

عینک صاف کر کے تاجی نے سجاد کی کہنی کے پاس رکھ دی۔

''ابرام کے معنی ہیں اصرار، تاکید۔ مطلب سمجھ گئیں اب؟''

''جی نہیں۔''

''شعر دوبارہ پڑھو اور ابرام کے معنی ذہن میں رکھو۔'' تاجی اس کی طرف دیکھ کر شعر پڑھنے لگی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا جھٹ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور چہرے پر کوندے کی طرح سرخی لپک گئی۔

سجاد نے اپنی حفاظت کی خاطر جلدی سے عینک کو پکڑ لیا اور پروفیسر صمدانی کے لہجے میں بولنے لگا۔ ''چلیے یہ شعر تو صاف ہو گیا۔ اب میں تمہیں چند شعروں پر نشان لگا دیتا ہوں یہ حفظ کر لینا۔''

وہ پنسل لے کر دیوان غالب میں تصوف کے شعر ڈھونڈنے لگا۔

''مسدسِ حالی پڑھا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''کوئی ناول وغیرہ؟''

''جی نہیں۔''

''کمال ہے کوئی ناول نہیں پڑھا آپ نے؟''

''سچ سچ بتا دوں بھائی جان؟'' تاجی نے ہریل طوطوں کے پر پھڑپھڑا کر پوچھا۔

''ہاں ہاں بتا دو مجھ سے کیا شرم؟''

''کاماسوترا پڑھی ہے جی۔''

سجاد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''میں انگریزی کی کتابوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ اُردو کی کتابوں کا پوچھ رہا ہوں۔''

''جی نہیں۔'' بجھا سا جواب ملا۔

''اچھا۔''

''آپ نے پڑھی ہے کاماسوترا؟''

اب اس کے لہجے میں درشتی بھر کر جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''اور لیڈی چیٹرلیز لوز؟''

فضا نہایت نامساعد ہو چلی تھی۔

"نہیں۔"

"اور...... ٹروپک آف کینسر؟"

"نہیں۔"

"دیکھیے بھائی جان ہماری عزیہ کتابیں پڑھنے نہیں دیتی تھیں ہم انہیں چھپا کر پڑھتے تھے۔"

"جن کتابوں کو چھپا کر پڑھنے کی نوبت آئے انہیں پڑھنا نہیں چاہیے۔"

تاجی کے کان کی لویں بھک بھک جلنے لگیں۔

"دیکھیے کوئی اور ہوتا تو میں یہ بات نہ کر سکتی، لیکن ان کتابوں میں برائی کیا ہے آخر؟"

پینترا بدل کر سجاد بولا۔ "پڑھ کر بتاؤں گا۔"

شعروں کی خالص رومانی فضا اور جنس کی پُر آشوب وادی میں سے جب وہ کلموہ بچ نکلا تو اس کے دل میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی، لیکن اس خود اعتمادی کے باوجود جسم بخار کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ دل کو کوئی جھانویں سے رگڑ رہا تھا۔ بار بار جی آیا کہ لوٹ جائے اور تاجی سے کہے۔ "بہت بہت دل بے قابو کو سمجھاتا ہوں لیکن یہ ڈڑنگے مارنے سے باز نہیں آتا۔" پھر سوچتا تاجی نے تو پہلے دن ہی کہا تھا کہ بہن کہنا آسان ہے اس رشتے کو نبھانا مشکل ہے، ممکن ہے جس پاڑ پر چڑھ کر وہ عمارت تعمیر کر رہا تھا، اس پاڑ کے گرتے ہی ساری عمارت ہی ڈھے جاتی۔

اسی ادھیڑ بن میں اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا کہ ایک وردی پوش نے چیتے کی سی چست بھری اور اُسے بوئے کے چکل کی طرح ثابت و سالم اٹھا لیا۔

"ارے فواد بھائی تم کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں کوئی گھنٹہ بھر ہوا۔ تم کہاں غائب رہتے ہو امی بہت شکایت کر رہی تھیں تمہاری عدم موجودگی کی۔" میجر نے بھرپور دھپا اس کے کندھے پر مار کر کہا۔

"یہیں تو رہتا ہوں سارا سارا دن۔"

میجر فواد میز پر خالص فوجیوں کے انداز میں بیٹھا تھا۔

"اماں مشکوک ہو رہی ہیں Take Care۔"

"خوامخواہ۔"

"کہتی ہیں روز آپ کسی کلاس فیلو کو پڑھانے جاتے ہو۔" آنکھ مار کر فواد نے سوال کیا۔

سجاد کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ امی اس کے بیرونی مشاغل سے اس حد تک واقف ہیں۔

"تم لوگوں کے مزے ہیں۔ پڑھانے کو بھی گرلز ہی ملتی ہیں اور ہم لوگوں کو کورے اَن پڑھ رنگروٹ پڑھانے پڑتے ہیں، انڈے ڈنڈے کی مدد سے۔"

"انڈے ڈنڈے کی مدد سے؟"

"بھئی وہ لوگ نہ تو ورڈز سمجھتے ہیں نہ ایلفابٹ۔ انہیں تو بتانا پڑتا ہے، ڈنڈا معنی سیدھا الف اور گولائی معنی انڈا...... اچھا یہ بتاؤ A میں کتنے ڈنڈے ہیں؟"

"تین......" سجاد نے جواب دیا۔

"رائٹ...... اور بی میں کتنے ڈنڈے؟"

"ایک۔"

میجر فواد نے مسکرا کر کہا۔ "یس...... ایک ڈنڈا اور دو انڈے۔ ہم نے تو سارا علم بتا دیا اب تم ہمیں اپنے اسٹوڈنٹ سے کب ملاؤ گے؟"

"وہ...... وہ میری بہن ہے۔"

سجاد راجہ گوپی چند کی طرح راج پاٹ چھوڑ اپنی سولہ سو رانیوں سے تعلق توڑ رانی مینا وتی کو اپنی بہن کہہ رہا تھا۔

"بہن؟" پریکٹیکل فوجی نے پوچھا۔ "بہن بنانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ ایسی غلطی ایمر جنسی میں بھی نہیں کر[illegible] چاہیے۔"

سجاد کا خون کھولنے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے فواد اس کے رابطے کو شبے کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ کوکھ کی سوگند سے پرے، بہن بھائی کا رشتہ جیسے ممکن ہی نہ تھا۔

"تم لوگوں کی نازک حس پریڈ کی نذر ہو جاتی ہے، تم لوگ کمشنی زندگی بسر کرتے ہو۔ ورنہ زندگی کو معراج زندگی اور گھٹیا جذبات کو حاصل حیات سمجھتے ہو۔ تم کیا جانو کہ منہ بولے بہن بھائی کیسے ہوتے ہیں۔"

"ارے رے رے...... آئی ایم سوری میں کیا جانتا تھا کہ اس معاملے میں تم اس قدر Touchy ہو۔" وہ منہ لٹکا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے ہاف ماسٹ جھنڈا دیکھ لیا ہو۔ یک دم سجاد کو اپنی بے وقوفی پر غصہ آ گیا۔ بے چارا بڑا بھائی ہو کر کیسے دبتا تھا۔

"کتنی چھٹی ہے تمہاری؟"

"کُل تین دن۔ آج کا دن ملا کر۔"

"کہیں سیر وغیرہ کو لے چلوں؟"

"As You Like"

"چلو تمہیں تاجی سے ملا لائیں، تم خود دیکھو گے کہ پاکیزہ لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔"

یہ جملہ اس نے مداوے کے طور پر کہا تھا لیکن فواد کے دل میں تاجی کو دیکھنے کی بڑی شدید تمنا جاگ اٹھی۔ اس تمنا میں سے چقماق کی سی چنگاریاں جل بجھ اٹھیں اور وہ یہ تجزیہ نہ کر پایا کہ وہ تاجی کو کیوں دیکھنا چاہتا ہے۔

دونوں بھائی جب بند بند آنگن میں داخل ہوئے تو تاجی جونگیل جانور کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس کی گود میں مسدس حالی تھا اور وہ زور شور سے شعر رٹنے میں مشغول تھی۔

"میں آج اپنے بھائی جان کو بھی ساتھ لایا ہوں مجھ سے چھ سال بڑے ہیں لیکن ہم میں بہت بے تکلفی ہے، میجر فواد...... سرتاج صاحبہ۔"

فواد نے ایڑیاں جوڑ کر ملٹری سلیوٹ جڑ دیا۔

تاجی زیرِ لب مسکرائی۔ میز پر مسدس حالی رکھی اور آہستہ سے بولی۔ "آپ بیٹھیے میں امیا کو بلاتی ہوں۔"

امیا کے ساتھ ایک بار پھر ہلکی چاشت والی نمکین مائل شکنجبین آ گئی۔

"آپ ملٹری میں ہیں؟"

"جی۔"

"کیپٹن؟"

"جی...... میجر ہوں میجر فواد۔"

مصری ممی کے چہرے پر بہت دنوں بعد رنگ اُبھرا۔

"جب تاجی کے ابا زندہ تھے تو ہم لوگ ایران میں رہتے تھے، وہاں کے لوگوں میں بڑی محبت، بڑی یگانگت کا جذبہ تھا۔ انکسار تو ایسا کہ گھر آئے مہمان کا دس دس مرتبہ شکریہ ادا کرتے تھے۔ خیلے متشکرم۔ ممنون ام۔ ایں خانہ شما است۔ ادھر آ کر تو ہم اجنبیت سی محسوس کرتے ہیں، کسی سے میل ملاقات ہی نہیں۔ سجاد میاں یہ تم نے اچھا کیا اپنے بھائی جان کو ساتھ لے آئے۔"

امیا بڑے دنوں بعد بے تکان بولے جا رہی تھی۔

فواد کے ہاتھوں میں نیبو پانی تھا اور وہ نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ جب بھی اس کی نظریں اٹھتیں تاجی تک ضرور پہنچتیں۔ ایک ایک نظر سجاد کے دل میں بھالے کی طرح چبھ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ فواد ان باتوں میں شامل ہو گیا۔ میس کی زندگی، جوانوں کے لطیفے، پریڈ کی باتیں، چھاؤنی کے شب و روز اس گھر میں اتر آئے تھے۔ ماں بیٹی بات بات پر ہنس رہی تھیں اور سجاد منہ پر قفل لگائے دل کو سارس کی طرح غم کے پروں میں چھپائے چپ بیٹھا تھا۔

واپسی پر ابھی وہ ٹیکسی تک پہنچے تھے کہ فواد چہک اٹھا۔ "جناب ہم تو قائل ہو گئے آپ کی پسند کے۔"

سجاد اس عقوبت کے لیے تیار نہ تھا سر سے پیر تک لرز گیا۔

"میں تو گھر پہنچتے ہی کہوں گا امی ہمارے لیے تو سجاد نے مصر کا چاند تلاش کر لیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کو مصر کا چاند کہتے تھے نا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔" سجاد کے دل میں حضرت زلیخا نے بانہیں اٹھا کر شیون کرنا شروع کر دیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں جناب I Hope You Dont Mind۔" فواد نے اس کی کمر پر دھپا مار کر کہا۔

"نہیں نہیں بھئی میری تو وہ بہن ہے۔"

اس جملے نے سجاد کی خوشیوں کو چھننی سے ڈھانپ دیا۔

امی نے سرتاج کے متعلق بہت مین میخ نکالی لیکن فواد فوجی آدمی تھا، امی کے ہر حملے کے لیے اس نے بس ایک ہی خندق کھود رکھی تھی۔ فوراً جواب دیتا۔ "دیکھیے امی اب میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور آپ انکار کر رہی ہیں پھر آپ کی جانب سے اصرار ہو گا اور میں کورا جواب دوں گا۔"

امی اس فوجی ہٹ کو دیکھ کر شو شو کرنے لگیں۔ سجاد کو کہنے سننے کا موقع ملتا۔ وہ تو پہلے ہی ہاتھ کٹوا چکا تھا، تاجی کو بہن کہہ چکا تھا۔ اب بہت رکھنی لازم تھی۔ بظاہر اس میں کسی قسم کا نقص بھی نکال سکتا تھا۔ جب امی بالآخر سرتاج کے گھر روانہ ہوئیں تو بے چارے پر ایسی اوس پڑی کہ منہ سر لپیٹ کر اوندھا لیٹا رہا۔ کبھی جی کو سمجھاتا کہ بہن کہہ کر نہ سمجھنا انتہا کی ذلالت ہے، کبھی سوچتا اور جو

کہیں فواد سے رشتہ طے ہوگیا تو ساری زندگی ملیامیٹ ہوجائے گی، جب جی سے جھگڑتے دل کو سمجھاتے بہت شام پڑگئی تو وہ اپنے وجود سے سنچر اتارنے سرتاج کے گھر پہنچا۔

آج وہاں میمل فین تھا نہ پڑھنے پڑھانے کی میز۔ بند بند آنگن میں آج ہر طرف اجنبی رنگ تھا۔ وہ چپ چاپ لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر خاموش تھا۔ بچپن میں اسے اس کی انا ہُو ہُو سے ڈرایا کرتی تھی۔ سو جاؤ جلدی ورنہ ہُو ہُو آجائے گا۔ دودھ پی لو نہیں تو ہُو ہُو اٹھا کر لے جائے گا۔ چلو نہاؤ اچھا نہیں نہاتے نہ سہی آلی ہُو ہُو سمجھ لے گا تم سے۔ آج اسے ان کمروں میں کسی ہُو ہُو کے ٹہلنے کی دبی دبی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کئی بار اس نے اٹھنے کی نیت کی۔ کئی بار اُٹھ اُٹھ کر بیٹھا۔ نہ تاجی کو آواز دینے کی ہمت باقی تھی نہ اس سے ملے بغیر چلے جانے کا حوصلہ باقی رہا تھا۔ کئی بار سورۃ الناس پڑھی۔ کئی مرتبہ آنکھیں بند کرکے جی کو سمجھایا لیکن جی پر ایک طغیانی کیفیت طاری تھی، بالآخر اس نے اٹھ کر ہینڈ پمپ چلایا اور منہ پر چھینٹے مارنے میں مشغول ہوگیا۔

پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔ ''لائیے میں نلکا چلادوں۔'' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''تم ہو تاجی؟''

''جی۔''

آنکھوں کے طوطے آج روئے ہوئے تھے۔ سارے چہرے پر آنسوؤں کی چھاپ تھی۔ اس سیاق و سباق کی روشنی میں اس نے آہستہ سے کہا۔

''تاج!'' اس کے ایک لفظ میں مہینوں کا بحران مقید تھا۔

''جی۔ بھائی جان۔''

''آج پڑھو گی نہیں؟''

''اب کیا پڑھنا ہے جی۔'' وہ لب کاٹ کر بولی۔

''کیوں؟''

تاجی کے ہر پل پھر آنسوؤں سے بھیگ گئے اور اس نے منہ پرے کرکے کہا۔ ''آپ کو معلوم نہیں ہے کیا؟''

ان آنسوؤں نے اس میں کسی جودھا کی آتما پھونک دی۔

''امی آئی تھیں؟''

''جی۔''

اب سجاد نے پہلی مرتبہ ڈرتے ڈرتے تاجی کے بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں پکڑ لیں۔

''پھر؟''

''امی مان گئی ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

قبولیت کا لمحہ آیا اور سر نیہوڑائے ہوئے گزر گیا، اسی وقت مصری ممی بالوں کو تولیے سے پونچھتی کھڑاویں کھٹکاتی اندر سے برآمد ہوگئیں۔ سجاد کے ہاتھ سے تاجی کی انگلیاں چھوٹ گئیں۔ حوصلے کا گلوکوز اس کی شریانوں میں پہنچنا بند ہوگیا۔

''میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں سجاد۔ ایسے لوگ صرف ایران میں دیکھے ہیں۔ بیگانوں کو اپنوں سے سوا چاہنے والے۔ تم نے وہ کچھ کر دکھایا جو سگا بھائی بھی کر نہ پاتا۔ تم نے قول و فعل کر دکھایا زبان کی لاج رکھ لی۔''

جو ربط مضمون، جو عرض داشت، جو التجا ابھی چند لمحے پہلے اس کے دل میں تشکیل پا رہی تھی غش کھا کر گر پڑی۔

''میں نے تمہاری امی سے کہا کہ بھئی وھن بھاگ تمہارے ہیں کہ ایسی صالح اولاد کو جنم دیا۔ ہمارے لیے تو سجاد فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ ہم تو یہاں اجنبی تھے، جب تاجی کے والد زندہ تھے تو ایران میں تھے ہم لوگ۔ یہاں آکر کسی سے میل ملاقات قائم نہ ہوسکی۔ سجاد نے تو کوکھ جنے سے بھی زیادہ حق ادا کیا۔''

وہ خاموشی سے بیٹھا ایران کے لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقفے میں خدا جانے کتنی گم صم تمناؤں کا ستھراؤ ہوگیا۔

''بس ایک فکر ہے مجھے۔''

جاڑے کے بادلوں میں پہلی بار سورج نے شکل دکھائی۔

''جی...... وہ فکر کیا ہے؟''

اسی ایک فکر پر اس کی ساری اُمیدوں کی اساس تھی یہ فکر چھوٹی کشتیوں کا پل تھا جو آناً فاناً چڑھتے پانیوں پر

تعمیر ہو گیا تھا۔

"کہیے کہیے میں سُن رہا ہوں۔"

"آپ کی امی کہتی ہیں کہ فواد کو کل تین دن کی چھٹی ہے، اس عرصے میں نکاح ہو جانا چاہیے کم از کم، بھلا اتنی جلدی انتظام کیوں کر ہوگا؟"

سجاد کو محسوس ہوا جیسے کسی نے لمبا ڈنڈا اس کی ہتھیلی پر سیدھا رکھ کر اسے سیدھا رکھنے کی قید بھی لگا دی ہو، اس جھوک سنبھالنے میں اس کا بازو شل ہو گیا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے امیا؟"

"تمہاری کیا رائے ہے؟ تمہاری بہن ہے جو مشورہ دو گے میں عمل کروں گی۔"

سجاد نے سر جھکا لیا۔ اتنے تھوڑے سے وقفے میں اتنے سارے علی الحساب دھچکے کھا کر وہ سُن ہو گیا تھا۔ اس قسم کی روبکاری کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھا۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ تمہاری امی کہتی ہیں نکاح ضروری ہے رخصتی بہار میں ہو جائے گی، کیوں تم کیا کہتے ہو؟"

تین دن میں نکاح اور بہار میں رُخصتی...... آڑو اور آلوچے کے شگوفوں کے ساتھ۔ جب کھٹے کے درختوں میں پھول لگتے ہیں۔ نارنجی اور سویٹ پیز کے پھول کھلتے ہیں۔ خودرو گھاس کے تختوں پر بیٹھی ہوئی نئی نویلی دلہن ہریل طوطوں کو سوا انچ لمبی جھلملیوں میں چھپائے انار دانوں کو سُرخ خوان پوش میں بند کیے۔ جھپاک سے سارا نفع تاجی کا ہو گیا اور وہ منہ تکتا رہ گیا۔

"سجاد کے لیے اب کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ نکاح کے سارے انتظامات خود کیے۔ وکیل گواہ کی جگہ دستخط کیے اور اپنے ہاتھوں تاجی کو فواد کی تحویل میں دے دیا۔ اتنے تھوڑے وقفے میں اتنے سارے حادثات نے ریل پیل کر اُسے نیم جان کر دیا تھا۔ تاجی کے نکاح کے دوسرے دن فواد پنڈی چلا گیا لیکن سجاد میں ہمت پیدا نہ ہوئی کہ وہ مکان نمبر 213 تک جا سکتا۔ کبھی جی میں آتا کہ 'تونبی' لے کر گلیوں میں گاتا پھرے۔ کبھی دل میں سماتی کہ یثرب کا ٹکٹ خریدے اور گنبد خضرا کے مکین سے جا کر کہے "کملی والے دل کے چور کو کچھ تو سمجھا دو۔ یہ جینے تو دے، دم بھر کو سانس تو لینے دے اور جو کہیں اس نکاح کی منسوخی ہو جائے تو عمر بھر یہیں اسی روضے کی جالی پہ بیٹھا رہوں۔"

نہ جانے یہ سجاد کی تمنا کی غیبی کارکردگی تھی یا فواد کا بے احتیاطی سے موٹر سائیکل چلانا شکست وریخت کا باعث بنا۔ بہرکیف نکاح سے پورے دو ماہ بعد اچانک فواد کی موٹر سائیکل بھٹے کی اینٹوں سے لدے ہوئے ٹرک سے ٹکرا گئی۔

سجاد کے زائچے میں حالات کے الٹ پھیر کی یہ نوعیت نہ تھی۔ برسوں اسے یہی معلوم ہوتا رہا جیسے چیلیں ٹھونگے مار مار کر اس کا بھیجا کھا رہی ہوں۔

تاجی کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی لیکن آنگن وہی تھا اسی طرح کونے میں لوہے کا پلنگ پڑا تھا۔ پرانے کھانچے، کھوکھے، کموڈ کا ڈھانچہ وہیں تھا۔ کچھ تبدیلی آ گئی تھی تو تاجی میں۔ اُس کے لب سوئے ہوئے توام بچوں کی طرح آپس میں سلے رہتے۔ ہریل طوطے اب فاختہ رنگ اور بے جان ہو چکے تھے۔ باتوں میں نہ وہ دل رُبائی تھی نہ آواز میں مجیرے بجنے کی کیفیت۔ برسوں کی خاموشی نے اندر ہی اندر اسے کھنڈل ڈالا تھا۔

خنک سی شام تھی۔

منڈیر پر شام پڑے گھر جانے والی چڑیاں چہچہا رہی تھیں، آنگن میں رات کا سا سماں تھا۔ سجاد اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں بہت سی کاپیاں تھیں اور بی ایس سی اُردو کے پرچے تھے۔ یہ سارے پرچے اسے راتوں رات دیکھنے تھے۔ وہ لمبی سی سانس لے کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

آج اس کی کمر میں پھر بہت درد تھا اور وہ ایم اے کی کلاس کو پڑھانے کی بجائے ساری دوپہر اسٹاف روم میں بیٹھا چائے اور اسپرو لیتا رہا تھا۔ نہ جانے اتنے سارے سال کیوں کر گزر گئے بغیر کسی تھنیے کے بغیر کسی سمجھوتے کے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شام کو تاجی کے گھر جاتا اور گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر گھر لوٹ جاتا۔ وقت سے بہت پہلے اس کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور نوجوانی ختم ہونے سے بہت پہلے امی نے اسے شادی پر آمادہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔

آج اس کی کمر میں پھر بہت درد تھا اور اسے سارے پرچے دیکھنے تھے۔ اس نے پلنگ کی آہنی پشت

سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اسے علم نہ تھا کہ ساری عمر اس طرح رُل جائے گی۔

”چائے لادوں بھائی جان؟“ زخمی سی آواز آئی۔

”نہیں۔“

سجاد نے نظر اُٹھا کر تاجی کی طرف دیکھا۔ کیسی کوڑیالی جوانی تھی۔ اس جوانی کا رم خوردہ اب سانپ کی لکیر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے آج؟“

”ہاں۔“

مصری ممی سویوں کا گرم گرم بھاپ چھوڑتا کٹورا لے کر آئی۔ اس کا روپا کندھے پر پارے کی طرح مسلسل ہل رہا تھا۔

”سویاں کھالو بیٹا۔“

”بھوک نہیں ہے امیا۔“

وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

”سجاد۔“

”جی!“

”تم سا بے لوث محبت کرنے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔“

برسوں بعد سجاد کی نظر تیزی سے جلنے لگی۔

”تمہارا دُکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، کوئی مرے ہوئے بھائی کے ساتھ یوں مٹی ہوا ہے۔“

موٹے موٹے آنسو اس کی عینکوں پر آ گرے۔

”تاجی کا اگر کوئی اصلی بھائی ہوتا تو یوں ساری عمر نہ گنواتا جس طرح تم نے گنوادی۔“

تاجی آہستہ آہستہ واپس جانے لگی۔

”تم شادی کرلو بیٹا۔“ امیا نے بھر بھرے سے لہجے میں کہا۔

اس کی نظریں تاجی تک ہوکر لوٹ آئیں۔

”شادی؟ اب بہت دیر ہوگئی ہے امیا۔“

تاجی نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پلٹ کر دیکھا اور چلنے لگی۔

”اور ذرا سوچو امیا وہ کون سی عورت ہے جو میرے اور تاجی کے رشتے کو سمجھ پائے گی۔ جو تاجی کو میری بہن، میری بھابی سمجھے گی۔ لوگ تو اصلی رشتوں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ بتائیے منہ بولے رشتوں کو کوئی کیا جانے گا؟“

آنگن میں رات چھا گئی۔ وہ لوہے کے پلنگ پر اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ امیا کبھی کی سوچکی تھیں۔ آنگن کے اوپر چھوٹے سے سیاہ آسمان میں مدھم مدھم ستارے دہک رہے تھے۔

وہ یک دم اپنے آپ سے، اپنی زندگی سے تھک چکا تھا اور رات ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

پھر دروازہ کھول کر تاجی نکل آئی۔ آج وہ ایسی مصری ممی لگ رہی تھی جس کا روپ کسی زمانے میں بہت قہرمان ہوگا۔

”گھر نہیں جائیں گے سجاد بھائی؟“

”گھر...... کون سے گھر؟“

”اپنے گھر؟“ تاجی نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں۔“ سجاد نے نظریں اٹھا کر جواب دیا۔ وہ دونوں کئی قرن خاموش رہے، پھر سجاد نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔

”امیا کے ساتھ والے کمرے میں میرا بستر لگادو۔ میں اب گھر نہیں جاؤں گا۔“

یہ فیصلہ کئی برسوں سے چمگادڑ کی طرح اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

”لیکن...... لیکن...... سجاد بھائی لوگ کیا کہیں گے؟“

”کیا تمہیں کچھ شبہ ہے؟“

”نہیں بھائی جان...... لیکن۔“

”میں نے تمہیں پہلے دن کہہ دیا تھا کہ ہم بات نبھانے والے ہیں جب ایک بار بہن کہہ دیا تو ساری عمر سمجھیں گے۔“

وہ کاپیوں کا گٹھا اٹھا کر امیا کے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوگیا۔

قبولیت کا آخری موقع آیا اور گردن جھکائے چپ چاپ تاجی کے پاس سے ہوکر گزر گیا۔ تاجی نے لوہے کے پلنگ پر اپنا آپ چھوڑ دیا۔ نہ جانے اتنی ساری سسکیاں کب سے اس کے سینے میں مقید تھیں۔

☆☆......☆☆